

بیادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

مُصَنَّفِینِ دینی کا علمی و دینی مآہرنا

بُریکات

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زمان حسینی

مُرتَّب
جمیل مہدی

مُدیِرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مطبوعات عائدہ المصنفین

- ۱۹۳۹ء اسلام میں خدای کی حیثیت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانون شریعت کے نظام کا مسئلہ -
 تعلیمات اسلام اور سبکی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -
- ۱۹۴۰ء لغویں اسلام - اخلاق و فلسفہ اخلاق - فہم قرآن - تاریخ ملت صفہ اول - نبی مصلیٰ - صراط مستقیم (انگریزی)
- ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول -
- ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع کی ضروری اضافات)
- مسلمانوں کا خروج و زوال - تاریخ ملت صفہ دوم - خلافت راشدہ -
- ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مجلہ سبب الخلفاء جلد اول - اسلام کا نظام حکومت - سرائے تاریخ ملت صفہ اول -
- ۱۹۴۴ء قصص قرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت رکال -
- ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور لغت - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کی گئی)
- ۱۹۴۶ء ترجمان اللہ جلد اول - خلاصہ سفرہ سارین بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل یٹو -
- ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم و نسق - مسلمانوں کا خروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور صفحہ ۱۰۱ پر اب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - معجزات شاہ حکیم احمد دہلوی -
- ۱۹۴۸ء ترجمان اللہ جلد دوم - تاریخ ملت صفہ چہارم - خلافت ہسپانیہ - تاریخ ملت صفہ پنجم - خلافت عباسیہ اولیٰ
- ۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی اہم خدمات (مکملے اسلام کے شامہ کار نامے رکال)
- تاریخ ملت صفہ ششم - خلافت عباسیہ دوم - ہمسائے -
- ۱۹۵۰ء تاریخ ملت صفہ ہفتم - تاریخ مقدسہ مغرب یعنی - تدوین قرآن - اسلام کا نظام مساجد -
- امشاعت اسلام - یعنی دنیا میں اسلام کو پھیلانا -
- ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخ ملت صفہ ہفتم - خلافت عباسیہ - بارج برنارڈ شاہ -
- ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک جائزہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (میں کہ از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابت حدیث -
- ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ ہشت - قرآن اور تفسیر شیعہ - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افشاء -

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد نمبر ۹ ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق جولائی ۱۹۸۶ء شمارہ نمبر ۱

۲	جمیل مہدی	نظرات
۸	عمید الرحمن محسن الفزاری	قرآن، عظیم ادب کا معیار
۲۳	ڈاکٹر محمد حسن الہ آبادی	نفقہ مطلقہ، سپریم کورٹ کا فیصلہ اور چند وضاحتیں۔
۵۶	شمیم احسن امانت اللہ	عربی علوم و فنون اور جدید یورپی ادب
۶۰	محمد یوسف کوکن پرنسپل جمالیہ عربی کالج مدراس۔	۵۔ جسٹس بشیر احمد صاحب سعید
۶۳	جناب محمد اظہر صدیقی انڈو عرب پریس فیوچرس۔	۶۔ مسلم پرسنل لا اور حضرت مفکر
		ملت کی یاد

عمید الرحمن عثمانی پرنسپل سبشر نے جمال پریس دھلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دھلی سے شائع کیا۔

نظرات

وقت آگیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل اور ان کے سماجی اثرات کے بارے میں مسلمانوں کی زبان پر صاف صاف سوال ہو اور وہ سیاسی رہنماؤں اور فرقہ پرست تنظیموں کے لیڈروں کے حقائق کی روشنی میں اس سب سے بڑے الزام کی وضاحت اور قطعی فیصلہ طلب کریں کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری مسلمانوں پر کس طرح یکطرفہ طور پر عائد کی جاسکتی ہے۔ ۲۸ برس ہندوستان کی آزادی پر گزر گئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی رہنماؤں اور فرقہ پرست ہندو تنظیموں نے ابھی تک مسلمانوں کو تقسیم کے الزام سے بری نہیں کیا، بلکہ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں اس الزام کی سختی اور تلخی بڑھتی ہی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی کروڑوں پر مشتمل اقلیت کو ملک دشمنوں کا ایک ایسا مجموعہ قرار دیا گیا ہے جو ہندوستان کی ہر پریشانی اور شہواری کی ذمہ دار ہے، اور جو ملک کی تقسیم کے ناقابل معافی جرم کی وجہ سے مستقبل میں بھی کسی درجہ کے اعتماد اور اعتبار کی مستحق نہیں سمجھی جاسکتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم کے الزام کو مسلمانوں پر اس قطعیت کے ساتھ عائد کیا گیا ہے کہ عام لوگوں کی بات تو الگ رہی، اچھے اچھے سمجھدار قومی لیڈروں نے ایک ناقابل انکار اوسط شدہ حقیقت کے طور پر قبول کر رکھا ہے اور ہر چھوٹے بڑے فرقہ وارانہ فساد کے وقت اس الزام کی گونج، حالات کی تحلیل و تجزیہ کے دوران سننے میں آتی ہے اور اس بات کو فرقہ وارانہ منافرت کے ایک لازمی عنصر کی نشیبت دی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ملک تقسیم کرانے کے اقدام نے جو تلخی اور زہر سماج میں گھول دیا تھا وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے اور فسادات کا ماحول اور خمیر تیار کرنے میں بدستور کام کرتا رہا ہے وہ کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ سیاست کی پیدا کی ہوئی مذہبی منافرت جس کا مسلم لیگ کی سیاست کی وجہ

سے فروغ ہوا، اس درجہ پائیدار بن گئی کہ ملک کی ۸۷ فیصدی ہندوؤں پر مشتمل اکثریت کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا کہ مسلمان کبھی دیس کے وفادار بن سکتے ہیں اور موقع ملنے پر دوبارہ اکثریت کی راہ میں دشواریاں کھڑی کرنے سے باز رہ سکتے ہیں۔

مسلمانوں پر عدم اعتماد اور ان کے بارے میں شکوک و شبہات کی فضا آہستہ آہستہ اتنی گہری اور زیر آلود ہو گئی ہے کہ ملک کی اکثریت کا ضمیر ان کے وجود کو ہی ملک کے نحوست کی ایک علامت اور خطرہ کی لال روشنی سمجھنے لگا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ انہیں ایسا کوئی موقع اور مہلت دینے پر تیار نہیں جو ان کے اندر خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کر سکے، دوسرے الفاظ میں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک محکوم طبقہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور ہر عملی اور ہر طریقہ سے ان پر اس حقیقت کو ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ یہ ملک پورے طور پر ہندوؤں کی ملکیت ہے اور ہندوؤں کے علاوہ سبھی اقلیتی طبقوں اور فسطوح کو ہندوؤں کی مکمل متابعت پر رضامندی دینے کے بعد ہی ملک میں رہنے اور زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک طرف فرقہ پرست تنظیموں کی طرف سے اس ملک کو ایسی ہندو سٹیٹ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جہاں ہندوؤں کی خواہش اور مرضی کو کبھی معاملات پر فوق حاصل ہے۔ اور ان تنظیموں کے اس خیال کو انتظامیہ پولیس اور پی اے سی کی پوری تائید و رسم نوائی حاصل ہے۔ جو فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر ہر شہر اور ہر ریاست میں اقلیتوں کے خلاف یکطرفہ کارروائی کا فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں، اور مسلمانوں کے دلوں پر جان و مال اور عزت، آبرو کے نقصان کی صورت میں ایسے زخم لگاتے ہیں جنکی نزرہ خیز یاد، زندگی کے آخری لمحوں تک انکے لئے ناقابل فراموش رہتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ ایک عجیب، منفی کاغذ اور دردناک حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ تقسیم ملک کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کے وجود کو ملک عالم وجود میں آئے تھے ان کی آزادانہ جدوجہد اور تشکیل کے نصب العین ایک دوسرے سے بالکل مخالف تھے، اور ان کے سیاسی نظریات میں زمین و

آسمان کا فرق پایا جاتا تھا، مسلم لیگ کی جدوجہد کا سارا زور اسلام کے نام اور وحدتِ کلمہ کی منطق پر تھا وہ دو قومی بلکہ مختلف قومی نظریہ کی دلیل میں اس بات کو ظاہر اور ثابت کرنے میں پیش پیش تھے کہ مذہب، قومیت، نسل، زبان، علاقائیت اور تہذیب سے بالاتر ایک چیز ہے اور اسلام اپنے عقیدہ کے ساتھ ہی یہ ساری چیزیں اس طرح ٹوٹ کر گر جاتی ہیں کہ ان کی کوئی جگہ، اسلامی ریاست کے عمل و کار پر باقی نہیں رہ جاتی۔ ان کے برعکس کانگریس کے نصب العین اور جدوجہد آزادی کے سیاسی نظریات کی اساس متحدہ قومیت پر تھی، اور اس کا سارا زور مذہب کو سیاسی دائرے سے الگ رکھ کر سیکولر اور جمہوری اصولوں کی بنیاد پر ایک فلاحی ریاست کے قیام پر تھا، وہ کہتے تھے کہ قومیں وطن کی بنیاد پر بنتی ہیں، اور اختلافِ مذہب قومیت کے تانے بانے پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا، بلکہ اسکی اہمیت علاقائیت، زبان، تہذیب اور کلچر جیسے ایک عنصر کی ہوتی ہے جو قومیت کی تشکیل میں اجزاء لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں وہ کہتے تھے کہ جس طرح پنجابی، گجراتی، بنگالی، مدراسی، اورراٹھی، علاقائی قومیں تہذیبی اعتبار سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں، اور ستان دہری ہندوؤں، جینیوں، بودھوں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں کے مختلف مذہبی عقائد پر عمل کرتی ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ان علاقائی تہذیبوں میں منقسم ہیں اور ان سے مختلف مذہب اسلام پر اپنا عقیدہ رکھتے ہیں، اس لئے ہندوستان کی ایک متحدہ قوم کی تشکیل اور ریاست کی تعمیر میں مذہبی اختلاف کی بنا پر متحدہ قومیت اور دو قومی نظریہ کا تصور کسی طرح نہ تو حقیقت اور منطق کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے نہ ہی قابل قبول ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی نظریات کا یہ بنیادی اختلاف نہ صرف دونوں سیاسی جماعتوں کی کشمکش کے آخری نقطہ عروج تک قائم رہا اور ملک کی تقسیم کا کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باقاعدہ سمجھوتہ کی بنا پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی ہندوستان نے سیکولر جمہوری نظریات اور متحدہ قومیت پر اپنا سیاسی عقیدہ برقرار رکھا اور اسکی بنا پر وہ سیکولر دستور کا نسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے مرتب کیا جو ۱۹۵۰ء سے ہندوستان کے سیاسی اور قومی کردار کی رہنمائی کر رہا ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کا قومی کردار ان کے بنیادی سیاسی

حقانہ اور قومی لقب العین کے برخلاف، کھلے انحراف کے راستے پر چل پڑا، اور اس انحراف کی بدولت پاکستان میں جو رنگ، نسل، علاقائیت اور زبان کے جھگڑوں سے بالاتر، اسلام کی مذہبی حاکمیت کے قیام کے مقصد کے تحت عالم وجود میں لایا گیا تھا، زبان، علاقائیت اور جغرافیائی اختلاف کے عناصر ایسی شدت کیساتھ حکومت اور سیاست کے اندر داخل ہوئے کہ صرف ۲۵ برس کے اندر پوری مملکت ٹوٹ کر دو ٹکڑوں پاکستان اور بنگلہ دیش میں بٹ گئی، اور پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچستانی قومیتوں کے درمیان کشمکش کی ایک ایسی شدید کشمکش اٹھ کھڑی ہوئی جس میں مذہب کی گرفت کا ادنیٰ سا بھی زور باقی نہ رہا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ۳۸ برس کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود پاکستان میں نہ تو کوئی ایسا دستور بن سکا جو پاکستانی قوم کی سمت اور سیاسی کردار کو واضح کر سکے نہ ہی وہاں صوبائی کشمکش کے خاتمہ کی کوئی صورت پیدا ہو سکی جس کی وجہ سے اس کا سیاسی مستقبل ہی بے یقینی ہو کر رہ گیا ہے، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ ۲۵ برسوں میں وہاں کے حالات کونسا رخ اختیار کریں گے، — ہندوستان میں بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں، جہاں قومی کردار اس دستور کے رہنما اصولوں اور سیکولر اور جمہوری ریاست کے لقب العین کے بالکل خلاف ہندو اسٹیٹ کے کھلے رجحان کی طرف مڑ گیا ہے، اور ملک پر خالص دو قومی نظریہ کے تحت ہندو قوم کی حاکمیت قائم کرنے کا فلسفہ اتنی تیزی کے ساتھ قبول عام کا درجہ حاصل کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ، دوسری مذہبی اقلیتوں میں بھی عدم تحفظ اور مستقبل کی طرف سے تشویش کا احساس اتنا شدید ہو گیا ہے جس کی بدولت پورے ملک میں شدید بے چینی اور بدگمانی پیدا ہو گئی ہے، اور جگہ جگہ اس بے چینی کے مظاہر مختلف قسم کی شورشوں اور تحریکوں کی صورت میں دکھائی دے رہے ہیں۔ پنجاب اس بے چینی اور بد اعتمادی کی ایک نمایاں مثال ہے جو اس سکھ قوم کی دہشت گردی کے سبب جہنم کا نقشہ پیش کر رہا ہے جو اب تک ہندو قوم کا بازوئے شمشیر بن بھی جاتی تھی،

آئی تفصیل کے ساتھ چہنچہنہ ۱۹۸۷ء کی ملکی تقسیم اور اس کے اثرات و مضمرات کا پس منظر اس نے پیش کیا۔

تاکہ اس بنیادی الزام کی حقیقت ظاہر ہو سکے جو مسلمانوں پر اس تقسیم کے بارے میں لگایا جاتا ہے اور
 پورے ۳۸ برس سے مسلمانوں کے دل میں پشیمانی اور مجربانہ غلطی کا احساس پیدا کرنے میں سب سے
 زیادہ موثر ثابت ہوتا رہا ہے۔ اس پورے عرصہ میں ہندوستان کے قومی غمیر کے اندر حقیقت شناسی
 اور حقیقت بیانی کا کوئی تقاضا اور کوئی روشنی دیکھنے میں آئی ہے جبکہ تاریخ اور حقیقت دونوں
 کا فیصلہ اسکے خلاف ہے بلکہ منطق کے اصول پر اس الزام کو پرکھا جائے تو وہ لوگ زیادہ غلط اور
 ثابت ہوتے ہیں، جو اپنی کمزوری اور غلطی کو چھپانے کے لئے اس الزام کو اونچی آوازوں کیساتھ مسلمانوں
 پر رکھتے رہے ہیں۔ ————— تاریخ کا کوئی ناظر اور ان طلاطم غیر واقعات کا اب تک زندہ رہنے
 والا کوئی مشاہد اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ملکی تقسیم کا فیصلہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان
 مفاہمت اور سمجھوتہ کے تحت کیا گیا تھا، اور اس کے دو فریقوں۔ مسلم لیگ اور کانگریس۔ میں سے
 کانگریس پر تقسیم کی ذمہ داری اس لئے زیادہ ہے کہ اس کے فیصلے پر تقسیم کو ماننے یا نہ ماننے کا دار و مدار
 تھا۔ مسلم لیگ تقسیم ملک کی خواہاں اور طالب ضرورتھی، لیکن اس کی خواہش اور مطالبہ صرف اسی
 صورت میں پورا ہو سکتا تھا کہ کانگریس اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے،

اس سلسلہ میں تاریخی ریکارڈ سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ ایک گاندھی جی اور دوسرے
 مولانا آزاد۔۔۔ بس یہ دو آدمی تھے جنہوں نے تقسیم کی تجویز کو آخر تک قبول نہیں کیا، گاندھی جی نے
 تو تقسیم سے متعلق بیزاری کا اظہار ایسے پیہر انہ پیشینگوئی کی صورت میں کیا تھا کہ برطانیہ نے
 تقسیم کی صورت میں کانگریس کے ہاتھ میں کڑی کی ایسی روٹی تھما دی ہے جسے وہ نہ کھائینگے
 تو بھوک سے مرجائیں گے، کھائینگے تو ویسے مرجائیں گے، اور مولانا آزاد وہ کانگریسی لیڈ تھے
 جو آخر تک تقسیم کی مخالفت کرتے رہے اور تقسیم کے بعد اپنی کتاب انڈیا دس فریڈم میں گاندھی
 جی تک کو اس بارے میں مورد الزام ٹھہراتے رہے کہ انھوں نے اس تباہ کن تجویز کی مخالفت اور
 کھلم کھلا مقابلہ سے گریز کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ملک کی تقسیم قائد اعظم جناح نے نہیں بلکہ جواہر لال نہرو، سردار پٹیل راج

گوپال اچاریہ، پنڈت گوبند چند، ڈاکٹر بی سی رائے، بی جی کھیر اور دوسرے لیڈروں نے کرائی تھی، تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، کیونکہ یہی وہ ممتاز قومی لیڈر تھے جنہوں نے ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کے دائمی حل کی صورت میں ملک کی تقسیم کو واحد حل قرار دیکر نہ صرف قبول کیا بلکہ صاف طور پر اپنے اس خیال کو تاریخ میں ریکارڈ کرایا، کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کیلئے تقسیم کے علاوہ دوسرا چارہ کار موجود نہیں ہے، اس تاریخی شہادت اور واقعی حقیقت کے بعد کسی ایسے آدمی یا کسی قومی تنظیم اور کسی فرقہ پرست جماعت کے لیڈر کو جو ذرا بھی سیاسی دیانت رکھتا ہے مسلمانوں پر ملک کی تقسیم کا الزام لگانے کا کوئی حق نہیں ہے، اور مسلمانوں کو اب صاف طور پر اس سوال کا جواب، قومی قیادت سے طلب کرنا چاہئے کہ جب کانگریس نے جو تقسیم کے تنازعہ میں ایک بڑے فریق کی حیثیت رکھتی تھی تقسیم کی تجویز کو منظور کیا تھا تو یہ الزام مسلمانوں پر کس طرح عائد ہو سکتا ہے۔

قرآن — عظیم ادب کا معیار

عبد الرحمن حسن انصاری

قرآن مجید قیامت تک کے لیے ایک معجزہ ہے۔ وہ اس وقت بھی ایک معجزہ محتاج اہل عرب کے درمیان نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہو رہا تھا اور آج بھی معجزہ کہ جب انسان خلاؤں میں پرواز کر رہا ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ قیامت تک کے لیے ہے کہ اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاہُ ط قُلْ فَاَوْفُوا بِوَعْدِیْہِمْ فَلَوْ عَادَ صَنِیْعُہُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ (یونس ۳۸) "اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا نبی یہ قرآن خود بنا کر لایا ہے تو ان سے کہہ دو کہ اس کی ایک ہی آیت کے مثل کوئی کلام بنا کر لادے اور اس کام میں اللہ کے ماسوا تم جن کو پکارتے ہو ان سب کی مدد لے لو پھر دیکھیں تم کتنے سچے ہو۔" انسانی کلام کے مقابلے میں تمام صحف آسمانی کی ایک ارگ شان ہے مگر تمام صحف آسمانی میں بھی قرآن ممتاز ہے۔ قرآن کے آگے فصحاء عرب کی زبانیں گنگ ہو گئیں شعراء نے افراف ہو کر لیا۔ قرآن کے مقابلے میں ان کا عاجز ہونا کس بنا پر تھا؟ قرآن کی فصاحت و بلاغت کی بنا پر۔ شعریت قرآن کی آیت آیت میں رچی بسی ہے اور یقیناً حق بحث سے بالاتر تھا۔ حق و صداقت، موعظت و حکمت، تذکیر و تبشیر، تاریخی واقعات، اُن دیکھے حقائق سب اس طرح ساتھ ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں کہ جن کے پڑھنے اور سننے سے طبیعت کبھی نہیں اُگتاتی۔ اس کا اثر پورے انسانی وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کے الفاظ کا زیر و بم شیرینی اور اثر آفرینی کا جواب نہیں۔ وہ پڑھنے اور سننے والوں پر بخوردی طاری کر دیتا ہے۔ کبھی اس کا بیان لرزہ بر اندام کر دیتا،

کبھی رلا دیتا اور کبھی کیف و انبساط میں غرق کر دیتا ہے۔ قرآن کی عظمت اور اثر کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ یقیناً اگر وہ پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ بھی خشیتِ الہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ انسانی قلوب کا کیا ذکر ہے۔ جس طرح قرآن کی کسی ایک آیت کا انکار کرنا کفر ہے اسی طرح قرآن کی آیتوں کی ادبی عظمت کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔

قرآن کوئی مسلسل تقریر یا منضبط کتاب نہیں۔ اس کا اسلوب بے نظیر ہے۔ اس میں عقائد بھی ہیں، حکایتیں اور تمثیلیں بھی، عبرت آموزی بھی، دعوتِ مشاہدہ بھی، ڈراوا بھی، خوشخبری بھی۔ غرض مضامین کی تکرار ہر بار ایک نئے معنی اور نئے لطف کے ساتھ۔ اس کے بیان کی تازگی کبھی نہیں جاتی۔ اس کے باغ میں ہمیشہ ایک بہار بے خزاں ہے۔ اس کا اثر جاودانی ہے۔ وہ ہمیشہ قلب دروہ کے لیے غذا فراہم کرتا ہے۔ اس کا ادب حق ہے اور اس کے ہر اسلوب سے حق کا اثبات ہوتا ہے۔ وہ حق جس کی گواہی کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ یعنی اللہ ہے۔ وہی اول ہے کوہی آخر۔ وہی ظاہر ہے وہی باطن۔ اُس کی ربوبیت، رحمت، علم، انصاف، حکمت اور قوت ہر کائنات کی ہر شے شاہد ہے۔ عقیدہ توحید قرآن کے تو مطلقاً کردہ عقائد کی جان ہے۔ شرک اس کے نزدیک ظلمِ عظیم ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر شے سے توحید باری تعالیٰ کا اثبات ہو رہا ہے۔ قرآن اپنے ہر مومن کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ اس کے اعمال و افکار بھی توحید کے مطابق ہوں۔

انسان قدرتِ خداوندی کا سب سے بڑا منظر ہے۔ تمام مخلوقات میں اس کے اشرف ہونے کا سبب قرآن نے یہ بیان فرمایا۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اِنَّہٗ خَلَقَ اَللِّسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (الرحمن ۱) ”مہرِ بانِ خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے بولنا سکھایا۔“ علم بیان سے انسان کا بہرہ ور ہونا اللہ کی عظیم بخشش ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس عطیہ خداوندی میں انسان کے

اشرف المخلوقات ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جاندار مخلوق کلام پر قادر نہیں۔ مربوط کلام کی شرط عقل ہے اور عقل انسان ہی رکھتا ہے۔ عقل ہی امتیاز و انتخاب کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی سے تصور و تخیل کا ملکہ حاصل ہوتا ہے قرآن کا علم ان سب علیات عقلی کا سر تاج ہے اور وہ براہ راست اللہ کے علم و رحمت سے انسان کو عطا ہوا ہے۔ معلوم ہوا صفت بیان انسانی شرف و کمال کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اپنے دل کی بات زبان سے دوسروں تک نہ پہنچا سکتا۔ اگر اپنے نتائج فکر و عقل قلمی کا اظہار نہ کر سکتا تو نہ بے شمار علوم و فنون معرض وجود میں آتے، نہ مملکت کا سرمایہ ہوتا نہ سیاست کا اقتدار۔ نہ تمدن ہوتا نہ ایجادات۔ نہ شعر ہوتا نہ نغمہ۔ نہ قرآن کی تلاوت کے ذریعے نفوس انسانی ذکر کی لذت سے آشنا ہوتے اور نہ علم و حکمت کی تعلیم ہو سکتی۔

ذات الہی تمام حسن و خیر کا سرچشمہ ہے۔ تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔ تمام تعریف کا وہی مزار دار ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ سَیِّئٍ اَفْلَحَ مَرَّةً وَابْحَرٰ یَمِیْنًا ۝۵ (لقمان ۲۷) ”زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر و دشنامی ہوتا کریں تب بھی اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہونگی۔ بیشک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔“ ایک دوسری جگہ فرمایا: هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ اَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۵ (حشر ۲۴) ”وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت دہی کرنے والا ہے۔ اس کے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کرتی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔“ چنانچہ انسانوں کو بھی حکم دیا

گیا۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الْكِنَی خَلَقَ فَسَوَّى ۝ وَالَّذِی قَدَّرَ
 فَهَدَى ۝ (الاعلیٰ ۱-۳) ”(اے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا
 کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی اور پھر راہ دکھائی۔“ ایک دوسری جگہ فرمایا۔
 قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَفَمِنْ يَمَلِكِ السَّمْعِ وَالْأَبْصَارِ وَ
 مَنْ يَخْرُجُ الْحَيَّ مِنَ الْحَيِّتِ وَيَخْرِجُ الْحَيَّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُرِى الْوَالِدَ
 فَسَيَفْقَهُونَ اللَّهُ جَ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُون ۝ (یونس ۳۱) ”اُن سے پوچھو کون تم کو
 آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں۔
 کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم
 عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔“ کو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) باز
 رہیں نہیں کرتے؟“ قرآن نہیں کہتا کہ انسان اندھے بہرے ہو کر ایمان لائیں۔ وہ آزادی
 عمل ہی کی بنا پر انسان کو لائق جزا و سزا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ
 أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (الزمر ۹) ”نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔“ انسان کی
 فطرت محبت، پرستش اور علو چاہتی ہے۔ چنانچہ جس ہستی سے بر لوگ انے سے یہ تقاضے
 پورے ہوتے ہیں اس کا نشان اس کی فطرت میں موجود ہے۔ قرآن نے تخلیق آدم کا
 واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: أَلَمْ نَكُنْ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ- (الاعراف ۱۷۲)۔
 اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل میں انسانوں کی رد و محوں سے فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟
 انھوں نے جواب دیا بیشک تو ہے؟ اللہ کی ربوبیت کا اعتراف نفسِ انسانی کے اندر
 موجود ہے۔ ربوبیت کی نشانیاں آفاق میں بھی پھیل ہوئی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دیدہ
 بنیاد رکاز ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: ”وَكَايِنَّا مِنْ آيَاتِهِ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
 يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (یوسف ۱۰۵) ”زمین اور آسمانوں
 میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔“

اس نے دو سمندروں کو چھڑ دیا کہ باہم مل جائیں۔ پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پس اسے جن وانسی تم اپنے رب کی قدرت کے کھ کھ کر شموں کو جھٹلاؤ گے۔ اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اُٹھے ہوئے ہیں۔“

یہ زمین و آسمان بیکار نہیں بنائے گئے ہیں۔ زندگی بے مقصد نہیں۔ مظاہر حیات گورکھ و صندا نہیں۔ کائنات اندھی قوتوں کی جولانہ گاہ نہیں۔ انسان نے عالم فطرت کا مشاہدہ کر کے اشیاء کے اندر ایک مشترک قانون دریافت کیا اور اس کا نام قانون فطرت رکھا۔ قانون فطرت بھی دراصل اللہ ہی کا حکم ہے۔ ”اِنَّمَا اِذَا اَسْرَاكَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَكَ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۰ دِلِیْس ۸۲“ ”وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرنا ہے تو اس کا کام پس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔“ قرآن نے صاف طور پر آگاہ کیا کہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی گئی ہے۔ ”وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعٰبِیْنَ ۝۵۰ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِاٰتِحٰی وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۵۱ (الذخاں ۳۸/۳۹)“ ”آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنائی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ یہ نہ جانتے والے مشرکین و ملحودین ہیں جنہوں نے اپنے نفس کو اپنا آلہ بنالیا ہے۔ وہ اپنی کج رویوں کو فلسفوں کا نام دیتے ہیں۔ باطل نے کیا کیا فلسفہ آرائیاں کی ہیں مگر قیاس و گمان حق سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ یونان والے لاتعداد دیوی دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ یہی حال اہل ہند کا ہے۔ ہر منظر فطرت کے لیے ان کے پاس ایک دیوی یا دیوتا ہے اور حاجت روائی کے لیے الگ الگ دیوتاؤں کو پوجا جاتا ہے۔ ایک فلسفہ کی رو سے کائنات میں مادہ کی مقدار محدود ہے اور فطرت اسی محدود مادے سے اشیاء کی تخلیق و صورت گیری کرتی ہے۔ چنانچہ اشیاء اسی لیے مٹی میں مل جاتی ہیں اور

پھرٹی میں نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے مسلسل تخلیق کے راز کو نہ پا کر عقیدہ تناسخ ایجاد ہوتا جو ہر تخلیق کو ایک سابقہ تخلیق کا اعادہ سمجھتا ہے۔ اس طرح روح مسلسل ایک قالب کے بعد دوسرا قالب اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ شیخ و حجر کی پرستش تو کھلی ہوئی بت پرستی ہے۔ بت پرستی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ یہ اعتقاد بھی اس کی ایک شکل ہے کہ زمانہ ہی قادرِ مطلق ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ قرآن نے بالتصریح یہ فرمایا: وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِئِنَّا إِلَهِ مِنْ عِلْمٍ إِنَّ هُمْ إِلَّا يَنْظُرُونَ (الباقیہ ۲۴) ”یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری زندگی ہے۔ یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ درحقیقت ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کہتے ہیں“، اسی طرح کابر رجال کو الوہی درجہ دینا جس کا ہمارے زمانے میں عام رواج ہے کہ با اقتدار سیاسی رہنماؤں اور حاکموں کے مجسمے نصب کیے جاتے ہیں اور ان کی تصویریں گھروں و دفنوں اور عوامی جگہوں پر آویزاں کی جاتی ہیں۔ یہ سب بت پرستی کی شکلیں ہیں۔ اسی طرح سائنس۔ آرٹ اور ایجادات کو وہ درجہ دینا جو خدا کو دینا چاہیے۔ انسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بنا پر وہ خدا سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اسے اس قبضہ میں مبتلا کرنے والے ایسے دانشور بھی ہیں جو دنیاوی زندگی کو مطلع نظر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بلکہ ایک سیاسی جابر نظام ایسے دانشوروں کو اپنے نظام کی مداحی پر مامور کرتا ہے۔ اتحادی نقطہ نظر چاہتا ہے کہ مجرد ”زندگی“ کے آگے تمام عقیدت و محبت کے جذبات پیش کیے جائیں۔ وہ زندگی کو الہ کا درجہ دے کر عبودیت اور آخرت کے تصورات کو مٹانا چاہتا ہے۔ حالانکہ دنیاوی زندگی سے اس کے غم اور زوال کو ہرگز جدا نہیں کر سکتے۔ ملحد شعراء و ادباء دنیاوی زندگی کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کر کے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ بس یہی دنیاوی زندگی سب کچھ ہے۔ زندگی بعد موت

ایک واقعہ ہے۔ وہ دنیاوی زندگی کا ترانہ اتنی اونچی لے سے گاتے ہیں کہ انسان کے باطن میں جو عالم آخرت کا ایک احساس ہے وہ دب کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ شعرو نغمہ سے ان کی وہ سروری صفت جو کسی دوسرے عالم کا پتہ دیتی ہے پھین لے کر ان سے دنیاوی زندگی کی حمد و تسبیح کا کام لیتے ہیں۔ عوام کی بھلائی کی فکر کوٹا۔ ان کے لیے کھانا کپڑا اور مکان ہٹا کر ناہر ہند ب حکومت کا فرض ہے مگر ”معیار زندگی“ کو اپنی تمام مساعی کا ہدف بنا کر آخرت کو فراموش کر دینا بھی ایک طرح کی بہت پرستی ہے۔ قرآن دنیاوی زندگی کی حقیقت یہ بیان کرتا ہے: **اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوَ** **وَنُفُوسٌ وَتَفَاهٌ وَلَكُمْ فِيهَا مَعَايِشٌ تَلْعَابٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ط (الحجید ۲۰)** ”خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتنا اور مالی داد و لاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے“

سائنس غیر شخصی ہوتی اور اس کا طرز فکر معروضی ہوتا ہے۔ جب کہ شعرو ادب کی بنیاد جذبہ و احساس پر ہے۔ ادیب کے عقائد و رجحانات اس کے ادب کو رنگ دیتے ہیں۔ وہ اپنی پیش کش میں تنظیم فکر و خیالات سے بے نیاز نہیں ہوتا مگر وہ حقائق کا دماغ سے زیادہ قلب سے ادراک کرنا سکھاتا ہے۔ ادب د شعریکسر معروضی نہیں ہو سکتے اور نہ ادب کو ادب رہنے دینے کے لیے یہ ضروری ہے۔ انسان ہمیشہ مظاہر کے پیچھے پوشیدہ حقیقت کی جستجو کرتا رہا ہے۔ روح انسانی منظر و صورت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ حکمت مظاہر و صورت میں معنی کی تلاش ہے۔ روح انسانی ”جو ہے“ پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ”کیا ہونا چاہیے“ کے پیچھے ہمیشہ سرگرداں رہتی ہے۔ اور اس کی یہ سعی پیہم زندگی اور صحت کی علامت ہے۔ شعرو ادب میں علامات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ عالم خیال اور عالم روحانی کے کوائف و مشاہدات کا بیان اسی طرح ممکن ہے کہ ان دیکھی چیزوں کا بیان دیکھی ہوئی چیزوں کی

مدد سے کیا جائے۔ لطافتوں کے بیان کے لیے الفاظ کی کثافتوں سے دامن بچانا مشکل ہے۔ ایک طرح سے مظاہر فطرت اور زندگی خود علامات ہیں حقیقت ان کے پیچھے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فریب و التباس ہیں۔ نہیں۔ وہ اتنے ہی حقیقی ہیں جتنے ہمارے شعور و احساس۔ ہماری زندگی، ہماری آرزوئیں، ہمارے خواب۔ البتہ وہ بھی فانی ہیں اور ہم بھی فانی۔ لیکن یہ حیات گزراں۔ یہ عالم خارجی سے ہمارا ربط، ہماری فتح و شکست، ہماری خوشی اور ہمارے غم، یہ سب کچھ ہیں جن پر سے گذر کر ہم ایک حیاتِ ابدی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ یہ عظیم تر زندگی ہمارے باطن میں ہے اور وہ کامل طور پر ہماری ہو سکتی ہے جب ہم اس عارضی زندگی کے فرائض ان اصولوں کے مطابق انجام دیں جن کی طرف اشارہ ہماری فطرت کرتی ہے۔ اپنی نادانی میں انسان عالمِ فطرت کا جلال و جمال دیکھ کر مبہوت ہو گیا اور ذاتِ خداوندی کی تدکر کرنے سے قاصر رہا۔ وہ دامنوں میں گرفتار ہو کر غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے معقولیت کو اس امر پر منحصر سمجھ لیا کہ جو آنکھوں سے دیکھا جائے وہی مانا جائے۔ مگر انسان کے حواسِ خمسہ کی محدودیت ظاہر ہے۔ قرآن کا ذاتِ خداوندی کے متعلق ارشاد ہے: **لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ** ”اس کی مانند کوئی شے نہیں“ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: **لَا تُدْرِكُهُ الْبَصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْبَصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ** (الانعام ۱۰۲) ”نکالیں اسے نہیں پاسکتیں اور وہ نکالوں کو ہالیتا ہے۔ وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے“ چنانچہ اس دنیا میں دیدارِ خداوندی ناممکن ہے اور وہ عالمِ آخرت میں ان کو حاصل ہو گا جو اس امید میں دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفات بے شمار مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ ہر جگہ ایک نئے معہرہ کو سمجھانے کے لیے اور زیادہ گہرے معنی کے ساتھ، قرآن کا ایک

خاص اسلوب ہے کہ کوئی بات کہنے کے بعد کوئی حکم دینے، کوئی ممانعت کرنے، کوئی تاریخی واقعہ بیان کرنے یا تزکیہ و تربیت کی تعلیم دینے کے بعد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ذکر کرتا ہے۔ جیسے اللہ حکیم ہے، علیم ہے، خبیر ہے، سمیع ہے، بصیر ہے وغیرہ۔ دراصل اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اس حکم، واقعہ، تعلیم یا موعظت سے اللہ کی کس خاص صفت کو تعلق ہے۔ اس خاص صفت پر غور و فکر کرنے سے معرفت و حکمت حاصل ہوتی ہے۔ صفات الہی قرآنی مضامین کی شاہ کلید کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کے ان مقامات کو بہ نظر تامل دیکھیں جہاں روزہ، نماز، جمعہ، حج یا ایسے ہی دوسرے عبادات کا حکم دیا گیا ہے تو دیکھیں گے کہ ان کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر کرو۔ چنانچہ اس طرح ہم ذکر کے وسیع تر معنی سے آشنا ہوتے ہیں۔ زبان سے ذکر ادنیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ دل سے ذکر اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ وہ ذکر ہے جو انسان کو اپنی یاد سے فراموشی کر کے ذکر حق کے ساتھ وابستہ و زندہ کر دیتا ہے۔ یہ ذکر عملاً ذکر کے حملہ افعال سے ظاہر ہوتا ہے۔ ادا امر کی بجائے آوری ہو یا نواہی سے اجتناب۔ گھر کے معاملات ہوں یا حکومت کے قوانین۔ معاش ہو یا اقتصاد، شعر ہو یا ادب۔ غرض زندگی کی ہر حالت اور کیفیت سے۔ یہ ذکر، یہ عشق، حیات جاودانی سنجش کی قوت رکھتا ہے:

ہرگز نمیرداں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

فلسفہ وحدۃ الوجود نے، جس کے بانی شیخ محی الدین ابن العربی ہیں، اسلامی دنیا کے عوام و خواص پر زبردست اثر ڈالا۔ یہ فلسفہ پورے عالم اسلام کے صوفیاء میں رائج ہو گیا اور چودھویں صدی عیسوی میں تو اسلامی شاعری کا مقبول ترین موضوع رہا۔ جو لوگ حلول اور خدا کی تجسیم کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس طرح وہ خدا کے ساتھ زیادہ جذبہ کے ساتھ محبت کر سکتے ہیں۔ اور ان کی آخری منزل خدا سے دوسرا

اتحاد ہے مگر قرآن صاف کہتا ہے کہ خدا خدا ہے، بندہ بندہ۔ بندہ خدا سے انتہائی
 قرب حاصل کر سکتا ہے مگر اس کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔ اتحاد کا نظریہ کفر اور زندہ
 ہے۔ یہ فلسفہ اخلاق کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور انفرادی عمل کی ذمہ داری بے معنی ٹھہرتی
 ہے۔ وحدۃ الوجود پر مبنی شعروادب نے جو شش عمل کو سر دیکھا اور انسانوں کے اندر
 انفعالیت پیدا کی۔ ان کو جھوٹے عز و عومات میں مست رکھا۔ میدانِ عمل سے
 گریزاں انسانوں نے اس کے دامن میں پناہ لے کر میٹھے خواب دیکھے۔ قرآن خدا کی
 ایک ذات کا تصور دیتا ہے اور کہتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَخَفَتُهُ مَثَلُ الذَّلِيلِ الَّذِي
 أَقْبَضَتْ عَيْنُهُمْ فَبُغِضُوا وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ وَلَا يَسْتَحْسِبُ الَّذِينَ كَفَرُوا
 (۱۶۵) ”کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسرا و مقابل بناتے ہیں اور
 ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے
 لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں“

فنِ انسان کی ان مساعی پر موقوف ہے جو وہ زندگی کے حقائق سے عہدہ برآ
 ہونے کے لیے کرتا ہے۔ یہ بات ترین عقل نہیں کہ بڑے بڑے فنکاروں نے اپنی کوششوں
 کو صرف اس امر پر مقصور رکھا ہو گا کہ ان کے ذریعے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچایا جائے
 یا ذہنی مازی گری یا لہو و لعب میسر آئے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے کارنامے نوعِ انسانی
 کی تعلیمات ہارتی ہوئی قوتوں کو سجا کر اور تازگی اور قوت بخشنے کے لیے تھے۔ تمام فن کا
 مقصود حسن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ ترفع کے ذریعے یا ایک اعلیٰ نصب العین کی طرف
 رجوع کرنے سے درجہ کمال کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ اگر انسان محسوسات ہی کے دائرے
 میں رہ جائے تو علم بل آیز ہو کر حجابِ اکبر بن جاتا ہے۔ مکمل جمال و جلال کی حاصل
 صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ اور اسی کے جمال و جلال کی طلب ادنیٰ ہے۔ حقیقت یہ
 ہے کہ انسانی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہے اور تمام علوم و فنون کا مقصود زندگی کے

تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ قرآن کی زبان میں وہ عبادت ہے۔ عبادت میں حب الہی بھی شامل ہے اور مخلوق خدا سے محبت بھی۔ اس طرح عشق ایک رہبر قوت ہے۔ وہ انسان کو میدانِ عمل میں سرگرم کرتا ہے۔ اس کو تخلیقی کاموں میں لگاتا ہے اور تسخیرِ فطرت کا سبق دیتا ہے۔ یہ عشق اسوۃ اللہ کا ابطال کرنا اور حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کرنا سکھاتا ہے۔ عشق کا حلقہ بگوش دنیا ترک نہیں کرتا مگر دنیا پرستی سے اپنا دامن بچاتا ہے۔ وہ مال و متاعِ دنیوی کی ہوس نہیں رکھتا بلکہ آزادی اور بے نفسی پر جان دیتا ہے۔ اس کے دوسرے معادن اوصاف ہیں۔ صبر، توکل، نیاز، فقر، فجا عت، رواداری وغیرہ۔ وہ اوصاف جو دنیا پرستی کے مقابلے میں انسانی خودی کو آزادی اور پاکیزگی عطا کرنے والے ہیں۔

صحیح روحانی طرز زندگی ہر فرد بشر کے لیے ایک سا ہے۔ عملی زندگی میں تقسیم کار کے اصول رائج ہونے سے پہلے شاید عملی زندگی بھی سب انسانوں کے لیے یکساں تھی۔

قرآن کا ارشاد ہے: **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اُخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اُخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوا مِنْ الْعِلْمِ مَا جَاءَهُمْ مِنَ الْبَيِّنَاتِ بَغْيًا يَفْتَحُمُونَ** (البقرہ ۲۱۳) ”ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے

جو کہ یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر اشارت دینے والے اور بکھردری کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور اس کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے

ان کا فیصلہ کرے اور اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق نہیں بتایا گیا تھا۔ نہیں۔ اختلافات ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے

روشن ہدایات پالنے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے یہ اس امر کو شدت سے محسوس کرانے کی ضرورت ہے کہ دانشور اور عوام

دولوں ہی انسان ہیں اور ایک ہی خاندان کے افراد۔ مذہب ہی وہ میدان ہے جس میں وہ ایک مشترک مقصد کے لیے سرگرم کار ہو سکتے ہیں۔ البتہ ادیب اور شاعر کے لیے ایک داعیانہ جذبہ ضروری ہے جس سے اسے کارکردگی کی مقصدیت حاصل ہو۔ وہ اپنے قلم کو حق کی امانت سمجھے اور قلم کے ذریعے عبادت کرے۔ تاریخ شعر و ادب گواہ ہے کہ عظیم فن وہاں پھولتا پھلتا ہے جہاں مذہبی اور ثقافتی روایات موجود ہوں۔ جو ادب اپنی روایات سے مغرب ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کا عظیم ہونا تو خارج از بحث ہے۔ فنکار کے لیے دروں بینی ضروری ہے۔ وہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ یا فنکار کائنات اور مخلوق سے کٹ کر اپنی خودی میں کھو جائے یا حقیقتِ مطلق سے براہ راست اپنے باطن کی گہرائیوں میں ایک تعلق پیدا کرے۔ پہلی قسم کی دروں بینی متغی ہے اور علیحدگی پسند اور دوسری مثبت ہے اور وجدانی۔ جو فنکار مذہب سے روشنی حاصل نہیں کرتے۔ وہ قرآن کے ارشاد بغیاً بینہم کے مصداق ہیں۔ وہ

nihilists ہیں

اور ان کی کوششیں انتشار، فساد اور تباہی کا باعث ہیں۔ قرآن ان کی اور ان جیسے گمراہوں کی مثال یوں بیان کرتا ہے: مَثَلُ الْفٰسِقِ الَّذِیْ اٰسْتَوٰی قَدًا مَّارًا فَلَمَّا اَضَاعَتْ مَآخِذَہٗ ذَہَبَ اللّٰہُ بَصُوْرَہُمْ وَ تَوَّكَلْہُمْ فِی ظُلُمٰتٍ لَا یُبْصِرُوْنَ ۝ صُمُّ بَلْکُمْ وَّمَعٰی وَّقَمُّ لَا یَرْجِعُوْنَ ۝ اَوْ کَصِیْبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْہِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَبَرْقٌ یَّجْعَلُوْنَ اَصَابِعَہُمْ فِیْٓ اٰذَانِہُمْ مِّنَ الصَّوْاِغِیْرِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَ اللّٰہُ مُحِیْطٌ بِاَلْغٰیۃِیْنِ ۝ یَٰۤاَکَادِرُ الْبَرْقِ یُخَفِّفُ اَبْصَارَہُمْ کَلَّمَا اَضَاعَ لَہُمْ مَشْوٰۤا فِیْہِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَیْہُمْ قَامُوْا جَوْلَ شَاۡءَ اللّٰہِ لَنَہَبَ بِسْمِہُمْ وَاَبْصَارِہُمْ ۚ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرہ ۲۰/۱۷) ”اُن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اُس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا۔ اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ

تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں۔ گونگے ہیں۔ اندھے ہیں۔ یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا پھر ان کی مثالی یہ سمجھ کر آسمان سے زبرد کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔ یہ بجلی کے کڑا کے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بشارت اچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ درد جل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ بیان تاریخ کے ہر دور میں ہر طبقے کی گمراہی پر صادق آتا ہے۔

تمام علوم و فنون اور مظاہر تہذیب کو باہم متحد رکھنے کے لیے ایک مرکزی نقطہ درکار ہے۔ وہ نقطہ اللہ ہے۔ اس نقطے پر انسانیت کا جمع ہونا جتنا ہے۔ یہی مرکزی نقطہ آج مغربی اقوام اور ان کی متبع قوموں نے کھو دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ گھر، بازار، منڈی غرض ہر جگہ فساد کا شکار ہیں۔ اور انسانی زندگیاں تباہ ہو رہی ہیں۔ اب تو تباہی کا دائرہ بے اندازہ وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ آج ہر دانشور، شاعر اور ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ حالات کی سنگینی کو محسوس کرے اور اعصابی ایجابات پیدا کرنے والے مادہ پرستی پر مبنی ادب کی تباہ کاری کو بھی محسوس کرے۔ دنیا کی موجودہ حکومتیں بھی اپنے عوام کے حالات بگاڑنے کی ذمہ دار ہیں جنہوں نے عوامی ذرائع ابلاغ کو گھر گھر پہنچا دیا ہے تاکہ اس طرح حاکم شخصیتوں کو پرستش کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اور عوام پر ان کی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو سکے۔ وہ ایسے ہی علمی، تہذیبی اور تعلیمی پروگرام پیش کرتے ہیں جن سے ان کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔ ایسے دانشور بھی ان کے کاموں میں معاون بنتے ہیں جنہیں آزادی ضمیر و فکر سے زیادہ دنیاوی مفاد عزیز ہوتے ہیں۔

ادب شعر کو بھی مرکزی نقطہ دینا چاہیے۔ آج کی دنیا میں بغیر ایمان و یقین کے قلم چلانا گمراہی انسانی کی تباہی میں معاون بننا بھی ہے۔

مجنوب فرنگی نیکو نے کہا تھا: ”خدا کہاں ہے؟ میں بتاؤں۔ ہم نے اس کو مار ڈالا ہے۔ میں نے اہم تم نے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کام کیا کیسے؟ کیسے ہم سمندر بی گئے؟ کس نے ہمیں اسفنج دیا جس سے ہم نے سارا انقضا دیا؟ آخر ہمارا کیا منشا تھا کہ ہم نے زمین کو اس کے سورج کی زنجیر سے علیحدہ کر دیا؟ اب وہ کدھر جا رہی ہے؟ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ ہر سورج سے دور کیا ہم مسلسل گرتے نہیں جا رہے ہیں؟ کبھی پیچھے، کبھی آگے، کبھی دائیں، کبھی بائیں۔ ہر طرف۔ کیا اب بھی ہم عرش و فرش کی بات کر سکتے ہیں؟ کیا اب ہم آوارہ گرد نہیں ہیں؟ راہ گم کردہ۔ ایک عدم کے سمندر میں غرقاب۔ کیا رات نہیں آگئی اور کیا طلعت ہر آن بڑھتی نہیں جا رہی ہے؟ خدا مر گیا۔ اب وہ زندہ نہیں ہو گا۔ ہم نے اسے ارڈالا۔ مگر ہمیں کون سی راحت ملی۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ جس کے بوجھ تلے ہم دب گئے ہیں۔“ (Existentialism by Paul Raudenbush, P. 40)

نئے عیسائیت کی دشمنی میں اس قدر بڑھ گیا کہ اپنے تیز و تند انداز کو اس نے انتہا پسندی کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ ورنہ اس کا دل صاف تھا۔ وہ ان اخلاقی اور روحانی قدروں کی تباہی کا ماتم کر رہا تھا جس کو بنیادینہم فالوں نے بیدردی سے پامالی کر دیا تھا۔ جب اس نے مندرجہ بالا سطور لکھیں ایک دوسری عالمی جنگ لپٹی تمام ہونائیوں کے ساتھ جو چکی ہے اور اب نیوکلیائی اسلحے اور دیگر آلات و تباہکار ہتھیار نوع انسانی کو کرکڑا کر زمین سے مٹا ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ چاند پر انسان نے قدم چا چکے ہیں اور شاید اب ”ستاروں کی جنگ“ دور نہیں۔ آج ہمیشہ سے زیادہ قرآن کا یہ صاف حکم دنیا کو ستانے کی ضرورت ہے اور دانشوروں اور فنکاروں کو یہ سنانے کا فرض ادا کرنا ہے۔ ”فَا تَمَّ وَ تَجْهَدُ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فَنُفِرَاتِ اللَّهُ إِلَيْكَ ۚ تَنْظُرُ النَّاسَ عَن عَصَاكَ ۚ لَا تُنَبِّئُ لِلْخَلْقِ ۚ اللَّهُ ذَا الْبَلَدِ الْبَئِثِ ۚ الْفَاسِقِ ۚ يُكَذِّبُكَ ۚ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ“ (روم ۳۰) (اسے نبی اور نبی کے پیرو، کیسے ہو گا پناہ رخ اس دین کی سمت جمادوہیں فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔)

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور خیر و ضار حقیقتیں

(ڈاکٹر طحیح محمود حسن اللہ آبادی)

سکرٹری بھوپنڈی مسلم پرسنل لا بورڈ - بھوپنڈی۔

نقحر مطلق کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم ڈکیمینل اپیل نمبر ۸۱/۱۰۳ جو ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء کو فیصلہ ہوا ہے اور جو اے۔ آئی۔ آر سپریم کورٹ ۹۲۵ کے حوالہ سے اے۔ آئی۔ آر جولائی ۱۹۸۵ء کے صفحات ۹۴۵ تا ۹۵۵ پر رپورٹ ہوا ہے) کے فیصلہ کی حمایت میں جو مضامین اب تک اخبارات میں شائع ہوئے ہیں وہ دراصل قلت علم و فکر اور منشائے قرآن سے افسوسناک بیخبری کا شاہکار ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث سے متعلق چند امور کی وضاحت کر دی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ مناسب طریقہ سے سپریم کورٹ کے مندرجہ بالا فیصلہ کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔

۱۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ | سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ جو سابق چیف جسٹس آف انڈیا مشر دانی۔ وی چندر چھڈ کی سربراہی میں چار مزید ججوں کے مشترک فیصلہ کی صورت میں صادر ہوا ہے کسی نص قرآنی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس خواہش کی بنا پر ہے کہ ہندوستان میں تدریج یکساں سول کوڈ نافذ کیا جائے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے

(۱) مسلم پرسنل لا بورڈ کی مداخلت سے *Cinderella* پر اظہارِ تاہنہ کیا ہے۔ (پیر گراف ۳۱)

(۲) دانیال لطیف جیسے مشہور مبلغ نے تبدیلی پرسنل لا کی تحسین کی ہے (پیر گراف ۳۱)

(۳) ڈاکٹر طاہر محمود جو ادارہ ہمدرد کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ اسلامک ریسرچ سنٹر کے سربراہ کی حیثیت سے عرصہ سے مسلم پرسنل لا کی "مذمت"

قرار ہے ہیں کی تقریریں اور تحریروں کے حوالہ سے ”اسلامی اتھارٹی“ ہیا ثرمانی
ہے (پیرا گراف ۳۳)

(۴) اس بات پر اٹھار افسوس کیا ہے کہ حکومت دستور کے آرٹیکل ۴۴ کے نفاذ میں
مسلمانوں کے چشم و ابرو کی طرف ملقت کیوں ہے ؟ اور زور دیا ہے کہ حکومت
فوراً اس سلسلہ میں مثبت اقدام کرے (پیرا گراف ۳۲ نیز پیرا گراف ۲۸)
(۵) عدالتیں سماجی مصلح کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ یہ مشترکہ سول کوڈ کا بدل
نہیں ہے۔ (پیرا گراف ۳۲)

(۶) عدالت نے یہ فیصلہ اس امر کے باوجود دیا ہے کہ شاہ بانو (۶۵ سال) کا ایک جوان
برسر کار بیٹا بھی موجود ہے جو فی الوقت اس کی کفالت کر رہا ہے اور واقعاً وہ
ضابطہ نو جداری کی دفعہ ۱۲۵ (۱) کے تحت نہیں آتی جس میں یہ کہا گیا ہے
کہ ”اگر بیوی اپنی کفالت نہ کر سکے ———“

(ب) ایک اور فیصلہ (اسپیشل ایویشن نمبر ۲۱۴/۸۵ جو ۱۰ مئی ۸۵ء کو
فیصل ہوا ہے اور جو سپریم کورٹ ۹۳۵- دہلی کے تحت آئے۔ آر جولائی ۸۵ء
کے صفحات ۹۳۵ تا ۹۴۱ پر رپورٹ ہوا ہے) میں مسٹر جسٹس چنپارٹی اور مسٹر جسٹس
آر۔ بی مہرا دیہ دونوں جج صاحبان شاہ بانو کیس کی بیچ میں شامل تھے) نے شاہ بانو
کیس پر ملک کے مسلمانوں کے رد عمل کا ذکر کرتے ہوئے پیرا گراف ۷ میں یکساں شہری
قانون بنانے کے لیے حکومت پر زور دیا ہے۔

(ج) سابق چیف جسٹس آف انڈیا مسٹر دائی۔ وی۔ چندر جہ نے بھی میں ایک
سوال کے جواب میں واضح طور سے ارشاد فرمایا ہے کہ انھیں ہر قسم کے قوانین کی تعبیر کا
حق حاصل ہے۔ یہاں تک کہ انھیں تعبیر قرآن کا بھی حق حاصل ہے۔ (ر)
اس قسم کے حق کا موصوف نے شاہ بانو کیس میں کس طرح استعمال فرمایا ہے اس پر تصریح

آگے آ رہا ہے۔

پس جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ اس فیصلہ کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہیں سمجھتے انہیں فوراً ہوش کے ناخن لینا چاہیے۔ اور اگر انہیں ہندوستان میں اپنا شخص (Identity) عزیز ہے تو اس قسم کے فیصلوں پر بغلیں بجانے سے احتراز کرنا چاہیے۔

۲۔ مسلم پرسنل لا بورڈ | مسلم پرسنل لا بورڈ پر یہ اعتراض کرتا کہ ۱۹۴۳ء کی جگہ سے کم سے ضابطہ فوجداری کا نفاذ ہوا ہے وہ کیا کر رہا تھا دراصل لا علمی کا نتیجہ ہے۔ انہیں ابتدا ہی سے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ میں ”بیوی“ کی تعریف میں ”مطلقہ“ کو شامل کرنے پر اعتراض تھا اور دفعہ ۱۲۴ کی ذیلی دفعہ (۳) ب کی شمولیت دراصل انہیں کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اگرچہ یہ ضابطہ فوجداری اپنی موجودہ شکل میں یعنی دفعہ ۱۲۵ اور دفعہ ۱۲۴ (۳) ب کی موجودگی کے باوجود عدالتوں کے چکر سے لوگوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا پھر بھی اگر شوہر نے مطلقہ کے تمام واجبات ادا کر دیے ہوں تو بالآخر اس کی گلو خلاصی ممکن تھی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں مسٹر جسٹس کرشنا آئر کے ایک فیصلہ نے (اے۔ آئی۔ آر۔ سپریم کورٹ ۳۶۲-کریمنل لا جرنل ۱۵۱/۱۹۴۹ء، صفحات ۳۶۲ تا ۳۶۶) ایک ”نکتہ“ پیدا کر کے (دفعہ ۱۲۴ (۳) ب کے نفاذ کو عملاً روک دیا تھا۔ تا آنکہ ہائر فیصلہ نے وہ قانون ہی بالکل ختم کر کے رکھ دیا جو چودہ سو سالوں سے مسلمانوں میں متفق علیہ چلا آ رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کو عوامی تحریک چلانے کی ضرورت اب پیش آئی ہے۔

۳۔ معکوس استدلال | یہ بات کہ جب اسلام کا تعزیریاتی قانون (Penal law) ہندوستان میں نافذ نہیں ہے تو پرسنل لا ہی پر اصرار کیوں ہے دراصل معکوس منطلق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا جواب مسٹر باتات والا کی زبان میں یہ ہے کہ ”اگر کسی کل کا کوئی جز و فراہم نہیں کیا جاسکتا تو اس کا مطلب یہ کہ ہر اکہ اس کا موجود جز بھی ساتھ کر دیا جائے۔“

"If a part is not made available is does not"

mean that the other should be Surrendered.

لوگ بھی اس آرٹیکل ۳ کو ختم کرنے کے بل پر وزیر قانون مسٹر اشوک سین کی تقریر کا جواب۔
مسلم انڈیا انگریزی بائبل ۱۹۸۵ء - صفحہ ۲۱۹

۴۔ اسلامی ممالک کی مثال پاکستان میں دو ریویلی میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے اور جس کا خوالہ سپریم کورٹ نے بھی اپنے پیرا گراف نمبر ۳۴ میں دیا ہے ان کے بارے میں عوام کو یہ بات معلوم رہنی چاہیے کہ یہ ایک آرڈیننس تھا جسے نٹری کے ایک صدر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ملک پر "نافذ کیا تھا۔ اس کے باوجود اسے علماء اور عوام نے قبول نہیں کیا۔ پاکستان ہو یا کوئی دوسرا مسلم ملک۔ نہ وہاں اسلامی حکومت ہے نہ جمہوریت، اس قسم کی اصلاحات خواہ پاکستان میں ہوں یا تونس میں۔ شام میں یا یسایا میں۔ سب جبراً نافذ کی جاتی ہیں جو کسی بھی وقت ناپسندیدہ یا عوامی جمہوری حکومت قائم ہوتے ہی کا لہم ہو سکتی ہیں۔ اس کے باوجود اکثر ان اصلاحات میں مسلمانوں کے کسی نہ کسی ضعیف مذہب کے تفرّد یا خصوص کی پیروی کی جاتی ہے مزید برآں وہاں کا کوئی غلط اقدام ہمارے لیے اس لیے بھی دلیل اور حجت نہیں بن سکتا کہ ان ممالک میں اکثریت کے ووٹوں کی توثیق پر اقلیتوں پر بھجور کوئی قانون نافذ نہیں کیا جاتا جبکہ ہمارے یہاں ہندو اکثریت کی مرضی اور خواہش کو مسلم اقلیت پر مسلط کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔

۵۔ اجتہاد کہاں ہے؟ وہاں جہاں قرآن و سنت کے واضح احکام موجود ہوں وہاں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ غم ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأَطِيعُوا**
الَّذِينَ فِيكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ **وَالَّذِينَ خَلَوْا وَأَحْسَنَ تَاوِيلًا** انساہی
اسے لوگو جو ایمان لائے ہو طاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی

طرف پھیر دو۔ اگر تم دائیں الٹو اور روئے آخر پر یا بائیں رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور اقامت کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

(ب) قرآن کے بعد سنت رسول کا درجہ ہے۔ اس کا واضح حکم آیت محولہ بالا میں موجود ہے۔ پس رسول کے حکم (یا عمل) کی موجودگی میں بھی اجتہاد نہیں ہو سکتا۔
نفقہ مطلقہ تا عدت کا حکم قرآن اور سنت دونوں سے ثابت ہے۔

(ج) جس طرح دستور ہند کی آرٹیکل ۱۳۱ (۱) ۱۴۴ (۱) اور ۱۴۷ نے صرف سپریم کورٹ کو قوانین کے جواز اور قوانین و دستور کی تعبیر کا حق دیا ہے۔ قرآن نے بھی فہم قرآن اور اجتہاد کے لیے صرف ”ابل الذکر“ کو اہل قرار دیا ہے۔ وَمَا آتَا سَلَامًا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا بِمَا كُنَّا نَوْحِي إِلَيْهِمْ فَمَا لَمْ يُحِشُوا لِأَنْ يَتَّبِعُوا مَا هُمْ يُحْذَرُونَ۔
(اعمل۔ ۴۳) اے نبی ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے مابلی ذکر سے بوجھ لو اگر تم نہیں جانتے۔“

سپریم کورٹ کے ججوں کو یہ منصب اس لیے سونپا گیا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کے منصف ہونے کی بناء پر ان سے بجا طور سے توقع کی جاتی ہے کہ رائج الوقت قوانین پر ان کی حیثیت ”ماہرانہ“ ہوگی۔ اسلامی قانون کی تعبیر بھی ایسے اشخاص کے سپرد نہیں کی جاسکتی جو قرآن و سنت و فقہ اسلامی کی چودہ سو سالہ تاریخ کا ”ماہرانہ“ علم نہ رکھتے ہوں۔ پھر دستور کی آرٹیکل نمبر ۱۴۴ (۱) کے تحت جو دستوری بیج تشکیل دی جاتی ہے اس کی حیثیت قانون ملکی کی تعبیر میں ”اجماع“ کے علاوہ اور کیا ہے؟ اور ”اجماع“ کا اسلامی مآخذ قانون میں قرآن اور سنت کے بعد تیسرا درجہ ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اسلامی قانون کے ”اجماع“ کی حیثیت سپریم کورٹ کے دستوری بیج (تحت آرٹیکل ۱۴۴ (۱) سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

(د) اسلامی قانون کے جو تھے مآخذ ”قیاس“ کے لیے ”اجتہاد“ شرط ہے لیکن

”مجتہد“ کے لیے قرآن و سنت اور اجماع کا مکمل علم ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت
معاذ بن جبل والی ”حدیث اجتہاد“ سے ثابت ہوتا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی تائید میں جو مضامین آئے ہیں انہیں پڑھ کر عقل
حیران ہے کہ کیا واقعی یہ مسئلہ اجتہادی تھا۔ اور بالفرض اگر اجتہادی تھا تو کیا واقعی سپریم کورٹ
کے جج صاحبان جنہیں قرآن و سنت کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اس کے اہل ہو گئے ہیں کہ ایک
یا چند آیات کا انگریزی ترجمہ دیکھ کر ”اجتہاد“ کرنے بیٹھ جائیں۔

۱۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۴۱ کا سلب (د) اگرچہ شریعت کسی شخص کو اپنی مطلقہ کو
یکمشت کوئی بھی رقم (خواہ وہ عورت کے خرچ سے زیادہ ہو) کسی دوسرے کی حق تلفی
کے بغیر دینے سے نہیں روکتا لیکن اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۴۱: وَلِلْمُطَلَّقاتِ
مِمَّا عَمِلُوا بِالْمَعْرُوفِ وَفِي حَقِّهَا عَلَى الْمُتَّقِينَ د اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے۔ انہیں
بھی مناسب طور پر کچھ دے دیا کر حصہ کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر اسے استدلال کرنا
بالکل غلط ہے، کیونکہ متاع بکے معنی کسی شے پر بھی اس رقم کے نہیں ہو سکتے جسے مادہ بھاد (یعنی
استمراری طور پر Commandment) دینے کا حکم دیا گیا ہو جیسا کہ سپریم کورٹ کے
حالیہ فیصلہ میں اور اس سے پیشتر بھی اور فیصلوں میں کیا گیا ہے) اس سے یکمشت اتنی بڑی
رقم کا دینا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا جو کسی مطلقہ کی پوری زندگی کی کفالت کی ضمانت ہو۔
رحمہا کہ جسٹس کرشنا آڑے اپنے فیصلہ میں استدلال کے مور پڑیا ہے ملاحظہ ہو اسے۔ آئی

آر۔ سپریم کورٹ ۳۶۲/۱۹۷۹-سی۔ ایل۔ جے ۱۵۱ صفحات ۳۶۲ تا ۳۶۶ کیوں کہ
متاع کے مفہوم میں استمرار (Continuance) ہے ہی نہیں۔ دراصل آیت کا صحیح مفہوم
”تین ہوتا ہے۔ سورہ طلاق کی آیت نمبر ۴ سے ملاحظہ ہو: اَتُكِنُّوْهُنَّ مِنْ حَبْثِ
مَكْنَتِهِنَّ مِنْ دُجُوْمٍ وَّلَا تُنَازِلُوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْنَهُنَّ. وَاِنْ كُنَّ اُدْلُوْا
عَلَيْكُمْ فَامْتَحِنُوْهُنَّ حَتّٰى يَضَعُوْا حِمْلَهُنَّ. فَاِنْ اَنَزَلْتُمْ عَلَيْنَ لَحْمٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ

اُبْرَہْمَہُ۔ دَا اُبْرَہْمَہُ اَبْنِکُمْ بِمَعْرِضِہٖ۔ قرآنِ تعاسنِ تم فَنَسْتَوِیْ فِیْ کُلِّ اُخْرٰی
 (ان کو زمانہ عدت میں) اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو جیسی کچھ بھی جگہ کہیں بیسوا اور انہیں تنگ
 کرنے کے لیے ان کو نہ سناؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو
 جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے پھر اگر وہ تمہارے لیے ر بچے کو) زودہ پلائیں تو اس کی
 اجرت انہیں دو۔ اور پچھلے طریقے سے (اجرت کا معاملہ) باہمی گفت و شنید سے طے کر لو لیکن
 اگر تم نے (اجرت طے کرنے میں) ایک دوسرے کو تنگ کیا تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلانے
 گی) اسی آیت میں لفظ "متاع" بھی نہیں ہے بلکہ صاف "نفقہ" ہے۔ اب "قرآنِ فہمی" کا دعویٰ
 رکھنے والے حضرات (اور محترم صحابیان بھی) یہ بتلائیں کہ جب مطلقہ حاملہ کا نفقہ صرف
 وضع حمل تک ہے (جو کہ اس کی اصل عدت ہے) تو کس قانون عرف یا عقل کی رو سے
 غیر حاملہ مطلقہ کا نفقہ تا نکاح ثانی یا تا عمر رہ سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے اس قدر خلاف عقل
 قانون کی کون امید کر سکتا ہے؟

پھر قرآن کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہ رہنی چاہیے کہ قرآن نہ تو کسی پہاڑ
 پر نازل ہوا نہ ہی چودہ سو سالوں تک خلا میں معلق رہا اس طرح جب ہم بیسوا د جی
 صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی اور امت کے تعامل پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا
 ہے کہ دراصل آیت ۲: ۲۳۱، ان مطلقہ عورتوں کے لیے ہے جن سے خلوت نہ ہوئی ہو اور
 اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ اس بے زبان عورت کو کم از کم کپڑوں کا ایک آدھ جڑاڑ نصف
 ہر کے علاوہ) ضرور دے دیا جائے۔ ترتیب کلام ملاحظہ ہو آیات ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶ اور ۲۳۷
 کے بارے میں ہے جو فوت ہو گئے ہوں اور آیات ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، اُن لوگوں کے بارے
 میں ہے جنہوں نے ہاتھ لگانے سے قبل منکوحہ کو طلاق دے دی ہو۔ اسی ترتیب سے
 آیت ۲۳۰ میں مذکورہ بیوہ کے لیے وصیت کی تلقین ہے۔ یہ حکم وراثت کی آیات
 نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو گیا) اور آیت ۲۴۱ میں ان مطلقات کے لیے تلقین ہے

جن کے ساتھ خلوت نہ ہوئی ہو۔

لیکن آیت کو اطلاق معنوں میں مراد لینے کی صورت میں اس کا حصر لازمی طور سے آیت اطلاق - ۶ سے جوگا۔ ورنہ قرآن میں (لعوذ باللہ) تعارض لازم آئے گا۔

(ب) یہ آیت آیت وصیت ۲: ۲۴۰ کے فوراً بعد آئی ہے اور محترم نبی صاحبی نے پیراگراف ۷ میں دونوں آیتوں کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ کسی قانون داں ذہن سے بجا طور سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ آیت ۲: ۲۴۱ کو بھی وصیت نبی کے معنوں میں لے لیتا کیونکہ ایسا کرنا زیادہ آسان تھا۔ لیکن محترم نبی صاحبان نے یہ قابل قدر نکتہ اس لیے اختیار نہیں فرمایا کہ اس سے ان کا مقصد فوت ہو جاتا تھا۔

(ج) ”متاع“ کے لفظ سے یہ غلط فہمی دراصل عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن سے پیدا ہوئی ہے۔ جنہوں نے ”متاع“ کا ترجمہ ”maintenance“ (رکناہ یا نفقہ) کیا ہے۔ لیکن ہم حیران ہیں کہ محمد طفر اللہ خاں، علامہ خادم رحمانی نوری، محمد مارہادیوک پکھمال اور بری کے ترجموں، نیز بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز کے ترجمہ میں ”نفقہ“ کا لفظ مطلق نہیں استعمال کیا گیا۔ پیراگراف ۱۵-۱۶-۱۸-۱۹-۲۰ اور ۱۷ سید امین الرحمن رضوی صاحب (Cinderella) کی تحریری بحث میں اسی نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا۔ رحمت روزہ دعوت کا مسلم پرسنل لائبریاں ان تمام ترجموں سے صرف نظر کرتے ہوئے (اور خاص طور سے آربری کے ترجمہ کو) صرف عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ کو اختیار کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی ایک ترجمہ محترم عدالت کے مفید مقصد تھا۔

۷۔ مطلقہ کو صرف تاعدت نفقہ دینے کی عادت اور مصلحتیں | (۱) اسلام میں تین قسم کے قسٹوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ (۱) نسب - (۲) رضاعت - (۳) مصاہرت (ملاحظہ ہو النساء - ۳۳)

لیکن ان میں سے صرف دو ہی انسانی خاندان کی بنیاد ہیں۔ نسب اور مصاہرت جیسا کہ سورہ زکریٰ کی آیت نمبر ۵ میں کہا گیا ہے۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ

نَسْبًا وَصِثْرًا (اسد ہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا پھر اس سے نسب اسد سسرال کے دو انگ انگ سلیسے چلائے)۔ لیکن رشتہ زوجین کے درمیان اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک نکاح کا تعلق باقی رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی عورت کو طلاق دینے کے بعد اس کی حقیقی بہن، خالہ یا بھوپھی یا بھتیجی یا بھانجی سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ صرف اس کا مان مستثنیٰ ہے کیونکہ عورت کے مدخولہ ہوتے ہی وہ ماں کے درجہ میں آجاتی ہے) پھر کیا ہمارے موجودہ مصلحین اور واضعین قانون چاہتے ہیں کہ اگر ایک بہن کو طلاق دینے کے بعد کوئی شخص دوسری بہن سے نکاح کرنے تو اس شخص کی کل آمدنی ایک ہی خاندان کی کفالت کی ذمہ دار ہو کر رہ جائے:-

رب) دوسرا سبب مطلقہ کو صرف عدت کے زمانہ تک نفقہ دینے میں یہ ہے کہ اسلام ہر شخص کو عزت نفس کی تلقین کرتا ہے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَلْيَدُ اَلْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اَلْيَدِ اَلْاَسْفَلِ (صحیحین، ترمذی، نسائی) یعنی اوپر کا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے)۔ اس طرح آپ نے دست سوال دراز کرنے کی ہمت شکنی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلِلّٰهِ اَلْعِزَّةُ وَلِرِسُوْلِهِ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلْمُنَا فِقُوْنَ (۸) عورت تو اللہ کے لیے اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے۔ جب کسی عورت کا اس کے شوہر سے رشتہ منقطع ہو گیا ہو تو آکا اس کی طرح اس کے ٹکڑوں پر پلنا عورت کی عزت نفس کے خلاف ہے۔ عدت کا زمانہ اس لیے مستثنیٰ ہے کہ اس عرصہ میں استبراء رحم کی خاطر اپنے سابقہ شوہر کے لیے عورت کی رہتی ہے، اور دوسرا نکاح نہیں کر سکتی تاکہ اگر اسے حمل ہو تو اس کا نسب قلط ملط نہ ہوتے پائے۔ اسی وجہ سے زمانہ عدت میں واضح الفاظ میں نکاح کا پیغام دینا بھی ممنوع ہے۔ (رج) اللہ تبارک و تعالیٰ کسی بھی مرد یا عورت کا غیر شادی شدہ رہنا پسند نہیں کرتا چنانچہ ارشاد ہے: وَ اَنكحُوْا اَوْلَادَیْہِمْ مِّنْکُمْ وَ الصَّالِحِيْنَ مِّنْ عِبَادِکُمْ وَ اِمَّا نِکْمُ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَاءَ یَغْنِیْہُمْ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِہٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (النور-۳۲)

”تم میں سے جو لوگ مجرّم ہیں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے، اسی وجہ سے بیواؤں کے نکاح کی تلقین کی گئی ہے اور چار تک شادلوں کی اجازت دی گئی ہے: *وَرَأَتْ خِفْتُمْ دَرًا لَا تُقْسِرُوا فِي الْيَمِينِ فَإِنْ كُنْتُمْ مَأْكُوبَ أَعْيُنٍ مِنَ الْمَاءِ صَبْتُمْ وَبَاعَ (النساء ۳۰)* اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دین تین اہل چار چار سے نکاح کر لو۔ شادی کرنے کی غرض دغایت یہ ہے کہ معاشرہ پاک و صاف رہے۔ کیونکہ زنا اسلام میں قابلِ تعزیر جرم (Panal offence) ہے جس کی سزا غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے (النور ۱۲) اور شادی شدہ کے لیے رجم (مسلم، بوداؤد، نسائی) ہے (اس لیے یہ اسلامی مزاج کے خلاف بات ہوئی اگر کسی مطلقہ کے لیے تازہ نکاح ثانی یا تادم نفقہ کا سابق شوہر کی طرف سے انتظام کر کے اسے بے فکر کر دیا جائے)

(د) جب ہر مرد اور عورت کے لیے شادی کرنا ضروری ہو تو مرد کے ساتھ یہ کس وجہ سے انصافی ہوگی اگر اسے نکاح ثانی کے بعد اپنی منکوحہ اور مطلقہ دونوں کا خرچ برداشت کرنا پڑے۔ اگر وہ دہرا خرچ نہ برداشت کر سکے تو بجائے نکاح ثانی کے کسی عورت سے ناجائز تعلیق پیدا کر کے رجم کا سزاوار ہو جائے۔

(ک) مذکورہ صورت میں اس مرد کو دوسری بیوی یعنی موجودہ منکوحہ کے حقوق یا راستہ متاثر ہوتے ہیں۔ کیا یہ دوسری عورت کے ساتھ تا انصافی نہیں۔ واضح رہے کہ طلاق کے اسباب کی اگر چھای بین کی جیسے تو مرد ہی ہمیشہ لازماً تصور دار نہیں ٹھہرے گا۔ پھر آخر اسے اور اس کی دوسری بیوی کو کس جرم کی سزا دی جائے گی۔

۱۰۔ اگر مطلقہ کو تادم نفقہ نہ دیا جائے تو اس سے ان تمام لوگوں کے حقوق

مجرد ہوں گے جن کی کفالت از روئے شرع مرد کے اوپر واجب ہے۔ جس میں زوجین کی مشترک اولاد کے علاوہ اس مرد کی کوئی عزہ مطلقہ بھی ہو سکتی ہے۔ جسے اپنے سابق شوہر سے اس لیے نفقہ نہیں مل رہا ہے کہ وہ سپریم کورٹ تک جانے کی حیثیت نہیں رکھتی۔

اور اگر مطلقہ کو ترکہ میں سے حصہ دلایا گیا تو اس سے وراثت کے تمام احکام مجرد و متاخر ہوں گے۔

(۲) ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ مزاجی موافقت۔ بیوی کی زبان درازی یا کوئی اخلاقی عیب مثلاً نظر بازی وغیرہ کی وجہ سے شادی کے فوراً بعد یا سال دو سال کے بعد اسے طلاق ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں یہ نفقہ مطلقہ "تحریر طلاق" کے بجائے "تحریر نکاح" نہیں شمار ہوگی۔ ۹۔ واضح رہے کہ حرام کاری وہ عیب ہے جس کے سبب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی علیحدگی کی اجازت دی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ انسانی مزاج کی کمزوریوں سے واقف ہے جس طرح جہیز کی لالچ میں ہندوستان میں معصوم نو شادی شدہ عورتوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ اسی طرح مغربی سوسائٹی میں ان کے بارے میں سبکدوش ہونے کے لیے عورتوں کا قتل ایک معمول بن چکا ہے۔ اللہ کا کتنا بڑا فضل ہے کہ اسلامی معاشرہ اس لعنت قتل سے دونوں تعلقات سے پاک ہے۔ کیا ہمارے "مصلحین" چاہتے ہیں کہ اب بجائے طلاق دینے کے ان میں قتل کرنے کی دبا بھیل جائے۔

یا طلاق یافتہ ہونے کے بعد بھی اسے نفقہ دینے کی وجہ سے جن افراد کا مالی نقصان ہو رہا ہے وہ اسے قتل کرنے کے دسپے ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی المباحات قرار دینے کے باوجود طلاق کی اجازت جو عطا فرمائی ہے تو اس میں بھی مصلحت کا رفرما ہے۔

(۴) قانون کی کتابوں میں مسلمانوں کی شادی کو عمرانی معاہدہ (Social Contract) کہا گیا ہے رطیب جی مسلم لا صفحہ ۳۸ و ۵۰ :- طاہر محمود۔ مسلم لاہ انڈیا۔ صفحہ ۷۴ ملا۔ محمد ن لاہ ازیم ہدایت اللہ مارشد ہدایت اللہ صفحہ ۸۲) جو کچھ شرائط کے ساتھ تکمیل پاتا ہے۔ بعد طرفین کو اس معاہدہ کو نسخ کرنے کا طلاق یا خلع کی صورت

میں اختیار ہوتا ہے (ہیں قانون معاملات) (Law of Contract) فریق ثانی کے کسی دوسرے اور معاہدہ کی تکمیل تک فریق اول کے اوپر "مادان معاہدہ" حائد کیا گیا ہو، اگر کوئی قانون داں (مختصہ منجز) ہمیں اس سے مطلع فرمائیں تو عنایت ہوگی۔

(۱) قانون اور اخلاق کے دائرے ہمیشہ الگ الگ ہوا کرتے ہیں۔ ہمیں بہت سے معاملات میں بعض کمزوروں کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے، لیکن عدالتیں ان کے حق میں فیصلے اس لیے نہیں دیا کرتیں کہ قانون اس کی تائید و حمایت نہیں کرتا کسی اخلاقی فضیلت کو قانون کے ذریعہ موکد نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام میں یتیموں کے حقوق کے بارے میں سخت تاکید ہے (النساء: ۳۰) لیکن ان کے ساتھ سلوک کو موکد کرنے کے لیے یتیم لڑکیوں یا ان کی ماؤں کے ساتھ نکاح کی ترغیب دی گئی ہے جہاں تک کہ اسی سلسلہ میں چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ چودہویں کا اسلام نے اتنا حق رکھا ہے کہ رسول اللہؐ کو گمان ہو کہ انھیں ورثہ میں شریک کر دیا جائے گا۔ (بخاری: مسلم: ابوداؤد: ترمذی: ابن ماجہ اور مسند احمد بن حنبل) لیکن قانوناً ایسا نہیں کیا گیا۔ یتیم پوتے کے لیے وصیت کی شکل میں گنجائش موجود ہے، لیکن یتیمی۔ قرابت اور صلہ رحمی کی سہ گو نہ اخلاقی قہود کے باوجود ان کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا گیا۔ کیونکہ قانوناً وراثت اولاد کو منتقل ہوتی ہے۔ اگر اس کا دائرہ پوتوں تک وسیع کر دیا جائے تو اس سے بڑی قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔

کیا کوئی قانون داں رائج الوقت قوانین میں کسی ایسی دفعہ کی نشاندہی کر سکتا ہے جو اخلاقی فضیلت کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہو۔ جب ایسا نہیں ہے اور ہرگز ایسا نہیں ہے تو صرف مطلقہ ہی کے بارے میں اس کے سابق شوہر کو کیوں یا بند کیا جائے؟ واقعہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا یا اپنی شریعت کے ساتھ قلبی لگاؤ میں جس جذباتیت

کا قطعہ مسلم عوام کو دیا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ جذباتیت کا دخل اس غیر معقول استدلال اور قانون سازی میں ہے جو نفقہ مطلقہ کے نام سے باجبر مسلم کو ہر مسئلہ کیا جا رہا ہے۔

ان تمام معلوم اسباب اور ان نامعلوم اسباب جن تک ہمارے ذہن و فکر کی رسائی نہیں ہو سکی ہے) کے ہوتے ہوئے اور اسلامی معاشرہ کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص رخیہ خواہی کی نیت ہی سے سہی (اسلامی قانون کو تبدیل کرنے کی بات کہتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اسے اسلام کا نظام شریعت ہی نا پسند ہے تو اگر وہ مسلمان ہے تو اسے اپنے اسلام پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کیونکہ اسلام کا مطالبہ ہے: ﴿وَدُخِلُوا فِي السَّلامِ کَافَّةً﴾۔ (البقرہ - ۲۰۸) یعنی پورے پورے مسلمان بنو یہ ﴿أَفَتَوَدُّونَ بَعْضُ الْکُتَّابِ وَتُکْفِرُونَ بِبَعْضِهِ﴾۔ (البقرہ - ۸۵) کہ کتاب الہی کے کچھ حصوں پر ایمان لایا جائے اور کچھ سے انکار کیا جائے ”یہودیوں کی خصلت“ ہے۔

۸۔ الٹی منطق | (۱) ماہرین قانون کی خدمت میں عرض ہے کہ کسی اسلامی مسئلہ میں رائے دینے سے قبل اسلامی قانون کا مزاج سمجھ لیا کریں۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک پورا نظام قانون ان کی نظر میں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ارتقاء قانون اسلامی کی چودہ سو سالہ تاریخ کو نظر انداز کرنا سب سے بڑی جہالت ہے

(ب) غیر مسلم معاشین سے درخواست ہے کہ قاضی جی پہلے اپنے گھر کو دیکھ لیں شہر کے اندیشے میں ڈبلا ہونے کی انہیں فرصت بھی نہ ملے گی۔ مسلم معاشرہ باوجود اپنی تمام تر کمزوریوں کے الحمد للہ ابھی تک ان بہت سی خرابیوں سے محفوظ ہے جن میں ان کا معاشرہ گلے گلے ڈوبا ہوا ہے۔ یہ جہیز کی اموات، دیوداسیاں، سستی، انسانی قربانی، تانترک رسمیں اور ”معاشرہ“ کو پر دان چڑھانے کے لیے رکشرت ازدواج کی ممانعت اور طلاق کی مشکل کے سبب سے) بیویوں کا قتل ایسے ”حقائق“ ہیں جنہیں چھوڑ کر اسلامی معاشرہ کے ”سراب“

کے پیچھے دوڑنا ان کی سب سے بڑی حماقت اور جہالت ہے۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا چنے سے قبل کم از کم اپنی آنکھ کا شہتیر تو نکال لینا چاہیے۔

(ج) ہم حیران ہیں کہ معدودے چند مطلقہ مسلم عورتوں پر ”مبینہ مظالم“ کے خلاف تو یہ ارباب دانش، اربابِ قلم اور صحافی ایک ”رزمگاہ“ سجائے جوتے ہیں، لیکن ان برادرانِ بیواؤں اور اُن کے یتیم بچوں کا کوئی درد اُن کے دل میں آج تک کیوں نہیں پیدا ہوا جو فرقہ وارانہ فسادات میں اکثریت کے ہاتھوں اور پولیس کی گولیوں کی وجہ سے اس حالتِ زار کو پہنچے ہیں۔ اگر اُن کے دل میں واقعتاً انسانیت کا کچھ احترام ہوتا اور مظلوموں کی وادہ رسی کی انھیں کوئی فکر ہوتی تو سب سے پہلے اُن یتیموں اور بیواؤں کی خبر لینی چاہیے تھی۔ اور حکومت کو مجبور کرنا چاہیے تھا کہ بیواؤں کے لیے تاحینِ حیات یا نکاحِ ثانی معقول وظیفہ اور یتیم خانوں کی کفالت اور شادی اور یتیم لڑکوں کی کفالت اور روزگار کا انتظام کرے۔ احمد آباد، گجرات اور پورے ہندوستان کو جانے دیجیے۔ شہر بھونڈی کے صرف انصاری باغ کی جس قدر بیوائیں اور یتیم بچے ہیں ان کی تعداد پورے ہندوستان کی ان نام نہاد ”مبینہ اسلامی قانون“ کی ستائی ہوئی عورتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ آخر ان کے لیے اُن حضرات نے کیا کیا؟ ان کی فکر معرکس کا تو یہ حال ہے کہ جہاں انسانیت جیچتی ہے وہاں یہ راگ لاتے ہیں کہ سب دیکھ بہتر ہے۔

(د) یک زوجگی (monogamy) کی دکالت کرنے والے اور اسلامی قانون کی کثرت ازدواج (Polygamy) پر دایلا کرنے والے ذرا اپنے معاشرے میں کثیر اناث (Surplus women) کا بھی جائزہ لیں۔ اور اس سیل دبا کے آگے ابھی سے ہٹنا نہ دھنا شروع کر دیں۔ عائلی زندگی میں قوانین کی سختی کی وجہ سے وہ جن امراض میں گرفتار ہو گئے ہیں ان کی کبھی تشخیص فرمالیں۔ ان سب کا علاج انھیں اسلامی طریقِ ازدواج میں مل جائے گا۔ انشاء اللہ۔

۹۔ مغربی معاشرہ بنام اسلامی معاشرہ | (۱) دراصل مغربی معاشرہ میں جس کی صد فی صد نقالی کی کوششیں ہندوستان میں ہو رہی ہیں۔ اور اسلامی معاشرہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے جس کی وجہ سے اسلامی نظام معاشرت کو نہ سمجھنے والے اس پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ مغرب میں جائداد اور خطابات وغیرہ صرف بڑی اولاد زریعہ کا حق ہیں۔ باقی تمام اولاد اور لڑکیاں کسب کے قابل ہوتے ہی معاشی استقلال کے چکر میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ شادی میں وہاں والدین کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہاں ترکہ کا جامع تصور ہونے کے بجائے وصیت (will) ضروری ہو ا کرتی ہے۔ وصیت کی غیر موجودگی ہی میں وہاں عدالتیں الاقرب فالاقرب کی بناء پر فیصلے کیا کرتی ہیں۔ جب کہ اسلام میں بچوں کی پرورش اور ان کی شادی کا پورا بار والدین یا دلی (قریبی رشتہ داروں) پر ہو ا کرتا ہے۔

(ب) مسیحی قانون (Christian Ecclesiastical Law) میں سوائے زمانہ کے علیحدگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ رمی۔ باب ۵۔ (۳۱-۳۲)۔ باب ۱۹-۳ تا ۹ مرس باٹ ۱۲ تا ۱۸۔ یوٹا باب ۱۶-۱۸) (اور کیتھولک چرچ اس پر حامل بھی ہے) یہودیوں کے یہاں اگرچہ کتاب استثنا باب ۱۴ میں طلاق کی اجازت دی گئی ہے لیکن جیسا کہ H.S.O. Henriques نے اپنے monographs میں تصریح کی ہے کہ یہودیوں نے بہت سے معاملات میں ملکی قانون سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اپنے بہت سے مذہبی قوانین پر عمل ترک کر دیا تھا۔ رانڈال کلوپیڈیا آف ایلیجیا ایڈ ایٹھکس۔ جلد ۸ صفحہ ۴۶۱ مطبوعہ نیویارک ۱۹۶۷ء) یہ اپنے تمام معاملات زندگی میں (باستثناء چند) ملکی قوانین کی پیروی کرنے لگے تھے۔

اس لیے ذہنی پس منظر میں جب عائلی ضروریات کے تحت انتہائی ناقص قسم کا اسلامی قانون کے برعکس، قانونی علیحدگی (judicial separation)

کا قانون نافذ کیا گیا تو مرد کی جائداد سے مطلقہ کو گزارہ بھی دلوایا گیا۔

(ج) قرون وسطیٰ کی پوری مسیحیت نے عورتوں کو جس قدر مذلت میں ڈال رکھا تھا

اس کے جواب میں انقلاب فرانس کے بعد ہی سے مساوات مرد و زن کی تحریک چل پڑی یہاں

تک کہ اس تحریک نے مرد و زن کے حیاتیاتی فرق (Anatomical &

physiological differences) تک کو نظر انداز کر دیا۔ جس کا ذکر تفصیل کے

ساتھ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ جلد بیستم صفحہ ۳۲۶ مطبوعہ یو۔ ایس۔ اے ۱۹۶۵ء میں

مل جائے گا) اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک مساوات (Equality of sexes)

تعمیل زن (Exploitation of women) پر منتج ہو گئی۔

(د) دیکھ دھرم میں بھی رشتہ نکاح ناقابل انقطاع تھا (انسائیکلو پیڈیا آف

ریلیجن اینڈ ایٹھکس جلد ۸ صفحہ ۲۵۳ نیو یارک ۱۹۶۷ء) اسی وجہ سے یہاں مرنے کے

بعد عورتیں سستی ہو جایا کرتی تھیں۔ انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے کی کوششوں سے

اس رسم کی منسوخ کنی کے لیے قانون بنایا گیا تو دوسرے مسائل پیدا ہونے لگے۔ بیویں

صدی کے نصف تک پہنچے پہنچے ہندوستان میں مغربی تہذیب نے گھر کر لیا اور آزادی

کے بعد ہر چیز مغربی عینک سے دیکھی جانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مغربی تہذیب اپنی تمام تر

ہوئیوں سمیت مستول ہو گئی اور اس سے جو مسائل پیدا ہوئے ان کے ازالہ کے لیے

وہی ترکیبیں اختیار کی جانے لگیں جو مغرب میں اختیار کی گئیں (تفصیل کا موقع نہیں ہے)

(۵) مسلمان ایک غالب تہذیب کے این ہونے کے باوجود انیسویں صدی کے

اختتام تک روئے زمین پر ہر جگہ مغلوب ہو چکے تھے اس لیے ان کے اندر بھی انکار و اعمال

کی بیماریوں نے جڑ پکڑ لی۔ لیکن مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ آبِ حیات اپنے پاس موجود ہونے

کے باوجود انھوں نے بھی مغربی فسطائیوں سے اپنا علاج کرنا شروع کر دیا جو اپنی غلط اور

ناقص تشخیص و تجویز کی وجہ سے ایک عالم کو نہ صرف بیمار بلکہ قریب المرگ کر چکے تھے ہندوستان

میں یہ اور بہت سی رواجی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے جن میں اکثریت مبتلا تھی لیکن چونکہ ان کے اندر ابھی اپنے مسلمان ہونے کا احساس باقی تھا۔ اس لیے اگرچہ ایک ایک کر کے وہ اپنے عناصر تشخصی (Elements of identity) سے محروم ہوتے چلے جا رہے تھے لیکن ان میں اپنے مذہب اور شریعت کی طرف پلٹنے کی ترغیب باقی تھی۔ یہی سبب ہے کہ انھیں جب بھی اللہ کے نام پر بلایا جاتا ہے ان کی زبان سے فوراً بلیک کی صدا آتی ہے۔

۱۰۔ مطلقہ کیا کرے۔ | مغربی معاشرہ بنام اسلامی معاشرہ کی یہ ہے وہ کشمکش جس کے درمیان یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ اگر مطلقہ کو تازہ نکاح ثانی نفقہ نہ دلوایا گیا تو وہ کیا کرے گی؟ یہ سوال لوگوں کے ذہنوں کو اس لیے پریشان کیے ہوئے ہے کہ معاشرہ کے عناصر کا مزاج ترکیبی ہی بدل گیا ہے۔ غیر اسلامی سوسائٹی میں اسلامی احکام فٹ کر ناگول خانے میں چو کوہ چیز کا فٹ کرنا ہے۔ یہ عدم توازن مغربی معاشرہ کی نقالی سے پیدا ہوا ہے جسے حالات ملکی نے اور کچھ ہماری عدالتوں کی ہمدردانہ دلچسپی نے اس ٹوٹ تک پہنچا دیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے معاشروں کے برخلاف اسلامی معاشرہ میں حقوق و واجبات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ در اصل مطلقہ کا مستقل صحتمند اسلامی معاشرہ میں کبھی بھی دائمی فکر کا مستحق نہیں رہا۔ اور غریب خاندانوں میں آج بھی یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسے ”مسئلہ“ تو بنایا ہی ان خوش باش عورتوں نے ہے جو سپریم کورٹ تک جھلنے کا ”شاہی خرچ“ برداشت کر سکتی ہیں۔ یا پھر ان کے اوپر کسی ”ایجنسی“ کا ”دست شفقت“ ہے، جو انھیں یہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور اس کا مقصد حب علی نہیں بلکہ بغض معاویہ کے مثل شریعت اسلامیہ کے ساتھ ”بغض“ کا اظہار ہے۔

اس تہدید کے بعد ان اسباب کی نشاندہی کی جاتی ہے جن کی وجہ ہے ”نفقہ مطلقہ“

اسلامی شریعت یا اسلامی معاشرہ میں کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا اور آج بھی اس کا حل اسی کی طرف رجوع کرنے میں ہے۔

دلی دراصل اسلام میں عقیدہ ثانی (خواہ مطلقہ کی ہو یا بیوگان کی) کوئی معیوب

بات ہی نہیں۔ اور ہمدردی کے نقطہ نظر سے خصوصیت کے ساتھ بشرطِ عدل شریعت

نے چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دے رکھی ہے، جیسا کہ سورہ نور کی آیت نمبر ۳۲

اور سورہ نسا کی آیت نمبر ۳۵ میں گزر چکا۔ مطلقہ یا بیوگان کے مسئلہ سے قطع نظر اگر ہم مسلمانوں

میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش کے تنا سب کا مطالعہ کریں تو یہ خوفناک حقیقت

معاشرہ بھی افراطِ زن یا تکثیرِ اثاث (Sex ratio) کی شکل اختیار

کرنے والا ہے۔ آخر اس مسئلہ کا حل بھی سولہ کثرت از دواج کے اور کیا ہو گا۔

(ب) اسلام نے عورتوں کو جائیداد اور مال رکھنے اور کمانے کی آزادی دے رکھی ہے۔

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء۔ ۳۲) جو کہ

مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق

ان کا حصہ ہے لیکن ان کا نفقہ شوہروں پر فرض ہے۔ الرِّجَالُ كَالْأُمُوتِ عَلَى النِّسَاءِ مَا كَفَّلَ

اللَّهُ مِنْ بَعْضِهِمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَكْفَرُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ۔ (النساء۔ ۳۳) مرد عورتوں پر

قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر نفیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد اپنے

مال خرچ کرتے ہیں۔ اس طرح مسلم عورت مغربی عورت کے مقابلہ میں دھڑے فائدے میں ہے۔

پھر اسے ہر کی صورت میں شوہر سے رقم ملتی ہے۔ دوسرے مذاہب کی عورتوں کے برخلاف

مسلم عورت کو بحیثیت بیٹی کے باپ اور ماں سے بحیثیت ماں یا دادی یا نانی کے بیٹے، بیٹی یا

پوتے، پوتی یا نواسے، نواسی (حسبِ حالت) بحیثیت بیوی کے شوہر سے اور بحیثیت

کلانہ کے بھائی یا بہن سے، بحیثیت خالہ کے بھانجے سے اور بحیثیت بھوپتی کے بھتیجے سے

بھی رز دی الارصا ہونے کی وجہ سے) وراثت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ وصیت کی صورت میں بھی

اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ

(د) عَنْ سُرَاقَةَ ابْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَلَا أَدُلُّكُمْ
وَعَلَى أَفْضَلِ الصَّدَقَةِ ابْتِغَاءً مَرْدُودَةً إِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ (ابن ماجہ)
سراقہ بن مالک کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں نہ بتاؤں تم کو بہترین صدقہ کیا ہے؟
اس بیٹی کی کفالت عظیم ترین صدقہ ہے جو تیرے پاس لوٹاؤ گی مگر یہ ہے اور تیرے سوا کوئی اس کے
لئے کمانے والا نہیں ہے۔

یہ حدیث صاف طور سے باپ کو مطلق بیٹی کے نفقہ کا ذمہ دار قرار دے رہی ہے لیکن
اگر باپ زندہ نہیں ہے یا گمانے کی ذمہ داری اس کے بیٹے کے اوپر آگئی ہے تو یہی حکم بیٹے کی طرف
پلٹ آئے گا جیسا کہ ان تجمعیوں (الاحتیاج - النصار - ۲۳) (دو بیٹوں کا ایک ساتھ
نکاح میں جمع کرنا حرام ہے) کے حکم میں خالہ بھانجی اور بھوپھی بھتیجی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے
صدقہ کے لفظ سے کسی کو مغالطہ نہ ہو کہ یہ صرف اخلاقی فضیلت حاصل کرنے کے لئے
تشویق (رغبت دلانا) ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ إِذَا انْفَقَ
الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ وَلِيُّ صَدَقَةٍ (صحیحین) جب آدمی اپنی بیوی (بچوں اور
زیر کفالت لوگوں) پر زاجر آخرت کی نیت سے اخراج کرتا ہے تو یہ اس کے لئے صدقہ
(یعنی اجر و القام کا کام) بنتا ہے، اور سورۃ نسا کی آیت ۲۳ (جو اوپر نقل ہو چکی ہے) کی
رو سے بیوی کی کفالت شوہر کے اوپر فرض ہے، یہاں تک کہ مرد کی قوامیت کے دو اسباب
میں سے ایک سبب ہے۔

اس طرح اگر کسی دو عمر روگی کی طلاق ہو چکی ہو یا شادی ہی نہ ہوئی ہو یا نہ ہو رہی ہو تو اس
کا نفقہ اس کے باپ یا بھائی یا ولی کے اوپر فرض ہوتا ہے۔

(و) اگر مطلقہ ضعیف العمر ہے تو ظاہر کہ اس کے جوان بیٹے بھی ہونگے ایسی صورت میں
ان بیٹوں کے اوپر ماں کی کفالت فرض ہے کیونکہ علحدگی کے بعد مرد سے مصاہرت کا تعلق

باقی نہیں رہا لیکن لڑکے سے نسب تعلق ناقابل انقطاع ہے اولاد کے اوپر والدین کا جو عظیم حق ہے اسے اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ اَمَّا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْكِبَرِ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُولُ لَهُمَا آفٌ وَلَا تُهْرَاوُا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا۔ وَأَخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ انْصَحْهُمَا كَمَا نَصَحْتُ بَيْنِي صَغِيرًا۔ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِهِمَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَفْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا۔ (بنی اسرائیل ۲۲ تا ۲۵) تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی، والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں آف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ ”پروردگار! ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے مگر تم صراحت نہ کر رہو تو وہ ایسے لوگوں کیلئے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بزرگ کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ وَوَضِعْنَا الْإِنْسَانَ بَوَالِدَيْهِ أَحْسَنًا حَلَّةً أُمَّةً كَرُمًا وَوَضَعْنَاهُ كَرُمًا دَحْلَةً وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا، حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ امْتَدَّاهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ انْصَحْ بَيْنِي وَأَنْصَحْ بَيْنَكَ الْإِنْدَىٰ أَنْصَحْتُ عَلَىٰ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي مِنْ ذُرِّيَّتِي إِنِّي بُنِيتُ الْبَيْتَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (الاحقاف ۱۵) ہم نے انسان کو بہایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے، اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے محل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچ گیا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا

”اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔“

غور فرمائیے کہ یہ ساری خدمات (خصوصاً ضعیفی میں خدمت وغیرہ) کیا انھیں خالی پیٹ رکھ کر کی جائیں گی، یہ بھی غور فرمائیے کہ آیت نمبر ۲ میں صاف صاف صاف ماں کا حق زیادہ بتایا جا رہا ہے، حدیث میں ہے کہ ”والدین تمہاری جنت اور جہنم ہیں (ابن ماجہ) جنت ماں کے قدموں تلے ہے (مسند احمد) والدین کے حقوق کی احادیث بے شمار ہیں جن کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں ہے۔“

(نما) اسلامی نظام حکومت میں کسی بھی معذور کی آفری ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے ہندوستان میں جہاں یہ نظام اس وقت قائم ہے نہ مستقبل قریب میں، نظام ہراس کے قائم ہونے کی امید ہے تمام مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ کم از کم زکوٰۃ اور بیت المال کا اجتماعی شرعی نظام قائم کریں، معذوروں کی کفالت کے علاوہ یہ بیت المال مسلمانوں کی اور بہت سی اجتماعی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ شاہ بالو | شاہ بانو کا کیس بالکل صاف ہے ان کے انفق کی ذمہ داری کلی طور پر ان کے جوان اور خود کفیل بیٹے کے اوپر ہے۔ اور انھیں کے ساتھ وہ رہ بھی رہی ہیں انھوں نے مسلم سنیہ شورشک منڈل کے جلسہ غیر مقدم میں صاف فرمایا ہے کہ یہ کیس وہ صرف اس لئے لڑی ہیں کہ عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو (یعنی مسلم پرسنل لاغیم ہو) ورنہ انھیں نفقہ کے سلسلہ میں کوئی پریشانی نہیں تھی اور ان کے برخوردار سعادت اطور نے اس پر صاف کیا ہے (ملاحظہ ہو رپورٹ مسلم سنیہ شورشک منڈل پونا انڈین اکسپریس بمبئی ۲۰ جولائی ۱۹۸۵ء) پس اب کیا فرماتے ہیں اس بیچاری ضعیفہ مطلقہ کے بارے میں جسے

سڑک پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے وہ لوگ جو از و یاد ہمدردی میں دین و شریعت کی ساری حدیں عبور کر گئے تھے۔

۱۲۔ محترم جج صاحبان متوجہ ہوں۔ مداخلت کا پیرہہ چاک کرنے اور شکوک و شبہات کی دیوار ڈھادینے کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ نفس فیصلہ کے بارے میں عدالت کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے معزز جج صاحبان سے براہ راست خطاب کیا جائے۔

(۱) معزز جج صاحبان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے پہلے ہی سے یہ یقین فرمایا ہے کہ اسلام نے عورتوں کا درجہ گھٹا دیا ہے پھر اس سے یہ تاثر قبول کیا ہے کہ اسلامی قانون میں عورتوں کو انصاف نہیں مل سکتا، مزید یہ کہ اصلاح حال اور عورتوں کو فائدہ پہونچانے کے خیال سے اگر اسلامی قانون کی کوئی ”فائدہ بخش“ تعبیر ہو سکتی ہو تو یہ اسلام اور موجودہ حالات کے درمیان مفاہمت ہوگی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے رد و قبول کا ایک ”ذاتی“ معیار پیدا کر کے پورے کیس کو قابل اعتراض مواد سے پر کر دیا ہے بقول شاعر؎

خشت اول چوں ہند معمار کج تاثریامی رود دیوار کج

(۱) اس سلسلہ میں معزز جج صاحبان نے ”نو“ کا ایک مقولہ نقل کرنے کے بعد ایڈورڈ ولیم لین کی یہ رائے نقل کی ہے کہ اسلام کا مہلک ترین پوائنٹ عورت کے درجہ کو گھٹا دینا ہے (سیراگراف اول) ہم نے اب تک قرآن و حدیث اور تاریخ کے حوالوں سے جس قدر گفتگو کی ہے وہی یہ ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ عورت (یعنی صنف نازک) کو مردوں کے استحقاق سے بچانے اور معاشرہ کو اس کی ”نسوانی صلاحیتوں“ سے مستفید کرنے کے لئے اسلام نے جو قوانین دیتے ہیں نہ اب تک کے ارتقائی قانون کی تاریخ میں اسکی مثال ملتی ہے نہ ہی ابھی تک اس سے بہتر قانون کا تصور کیا جاسکتا ہے مردوں اور عورتوں کے درمیان حیاتیاتی فرق جسکی تفصیل کی طرف پیراگراف ۹ (ج) میں

اشارہ کیا جا چکا ہے، کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتلایئے کہ کیا مغربی قانون اور معاشرہ نے عورت کو واقعی انصاف دیا ہے جس کے لئے ہم قدم قدم پر انکی نقالی کریں ہم اسلامی قانون کا ابتدائی یا دور وشت (Jumit: ne age) کے قوانین معاشرت سے مقابلہ کر کے اسلام کی VALVE گھٹانا نہیں چاہتے۔ ہمارا تو چیلنج ہے کہ مغربی دنیا ایڈورڈین اور ہمارے معزز نج صاحبان ایک سمینار کے اسٹیج سے موجودہ اور مستقبل میں متوقع قوانین معاشرت کی اسلامی قوانین پر برتری ثابت کریں، ابھی تو یہ مصاحبین مقننین اور آئین سازان بہت سے نکات تک پہنچ بھی نہیں پائے ہیں جن کے بارے میں اسلام رہنمائی کرتا ہے، ہماری درخواست ہے کہ اور چیزوں کے ساتھ ہمارے محترم نج صاحبان کم از کم اسلام کے نظام وراثت ہی کا مطالعہ فرمائیں، تو انہیں حیرت ہوگی، قانون وراثت میں اسلام نے قوانین کی کن ٹرف نگاہوں کو ملحوظ رکھا ہے ہماری رائے میں کسی اسلامی مسئلہ میں اسلامی نقطہ نظر سے فیصلہ کرتے ہوئے ایک متعصب و بیانی جس کی اسلام دشمنی سے تمام پڑھانکھا طبقہ واقف ہے کی تحریر پیش کرنے سے قبل محترم نج صاحبان کو یہ ضرور سوچنا چاہیے تھا کہ اس سے قانون اور انصاف کس حد تک محروم ہو رہا ہے۔

(۲) محترم نج صاحبان نے دوسری زبردست ٹھوکرا سی بیڈا گراف اول میں کہا ہے

جب وہ غلط طور سے توقع کرتے ہیں کہ شاید پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بات نہ فرمائی ہوگی کہ عورت طہرہ پیل سے پیدا کی گئی ہے اگر تمہارے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اس لئے اپنی عورتوں سے نرمی کا سلوک کیا کرو، شاہد محترم نج صاحبان عورت کی نفسیاتی کیفیات سے واقف نہیں ہیں جو ہر ماہ اپنے مخصوص ایام میں نیز زمانہ حمل اور ایام رخصت میں کس قدر ذہنی انتشار کا شکار ہو جایا کرتی ہے مردوں کو یہ بات اس لئے کہی گئی ہے کہ وہ ان حالات میں اس کی ذہنی کیفیت کا خیال کرتے ہوئے اسے کوئی مسرتانہ

دے بیٹھیں، چنانچہ اسی وجہ سے ان اوقات میں طلاق دینا بھی منع ہے (الطلاق - ۱)

ہم محترم جج صاحبان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اختلاف الفاظ کے ساتھ بخاری (کتاب النکاح) مسلم (کتاب الرضاع) دارمی (کتاب النکاح) اور مسند کی خلیفہ پانچ میں صفحہ آٹھ پر موجود ہے ہم حیران ہیں کہ آدمی جب کسی چیز کی مخالفت پر اترتا ہے تو اس سے کیسے معکوس استدلال سرزد ہونے لگتے ہیں،

(ب) محترم جج صاحبان نے مہر کی اصطلاحی حیثیت "Womenolature" پر پیرا گراف نمبر ۲ میں کافی بیش قیمت گفتگو فرمائی ہے یہ بحث قانون کی کتابوں اور تاریخ عمرانیات کی کتب (Hogben's Law of Marriage) میں بھی مل جاتی ہے لیکن ہم حیران ہیں کہ یہ نفقہ مطلقہ جو ماہ بچہ واجب الادا ہے قانون معاہدات (Contract Law) کی کس اصطلاح کے تحت آتا ہے بالفاظ دیگر "مہر" وہ رقم ہے جو بطور (Receipt) بوی کو دی جاتی ہے نفقہ مطلقہ بعد عدت کیا چیز ہے جو مطلقہ کو دینے کا حکم دیا گیا ہے اسے بھی کوئی نام عطا فرما دیا جائے۔

(ج) جب ایسا فرض کر لیا گیا ہے کہ شاخصا ہوتے ہی عورت اپنے تمام پرانے صلبی رشتے منقطع کر لیتی ہے (بلکہ اس کی یاد دہانی کرانے پر محترم جج صاحبان نے پیرا گراف ۳۱ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو لتاڑا ہے) گویا کہ تعلقات نسب کا ایک لامحدود خلا ہے جس میں عورت "مساہرت" کی عرف ایک نازک ڈور سے ٹکی ہوئی ہے کیا حرج تھا اگر شادی سے قبل کا بھی والدین کا خرقہ اس سابق شوہر سے دلوادیا جاتا اور نہ بصورت دیگر ہم یہ دریافت کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ یہ خلا کب سے پیدا ہوا؟

(د) اگر طلاق دینے کے فوراً بعد یا دوران تنقیح مقدمہ اگر شوہر کی موت ہو گئی ہوتی تو محترم جج صاحبان کیا فیصلہ دیتے؟ یہی صورت حال اس وقت پیدا ہو سکتی ہے اگر یہی (مطلقہ) سے پہلے شوہر (سابق) کا انتقال ہو جائے پھر محترم جج صاحبان اس کیلئے

کونسی صورت تجویز فرمائیں گے؟

یہ ایسی عورت کو ترکہ دلویا جائے گا؟ گویا کہ اسلامی قانون وراثت میں بھی کترہیت ہوگی!!

(۵) محترم جج صاحبان نے ضابطہ فوجداری کی ۱۲۵ پر قانونی طور سے پیراگراف ۱ میں گفتگو فرمائی ہے لیکن یہ بات فاضل جج صاحبان کے علاوہ کسی اور قانون کے طالب علم کی سمجھ میں نہیں آئی پیراگراف ۲۸ میں انھوں نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ شاید دفعہ ۱۲۷- (۳) ب کی شمولیت (۱) اسلئے غلط ہیں آئی کہ طلاق کے وقت مہر کا ادا کرنا

بھی ضروری تھا یعنی (دفعہ ۱۲۷) (۳) ب کی سیشنل لار کے تحت جن واجبات کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد مہر ہے، یہ بات نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ مسلم پرسنل لار بورڈ نے اپنے بیان تحریری میں دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کی شمولیت کی پوری تاریخ اور اس میں اپنے رول کا ذکر کیا ہے بلکہ اس ذیلی دفعہ کے الفاظ کے بھی خلاف ہے، محترم جج صاحبان نے مسٹر لام لو اس مردھا کی تقریر کا اقتباس (راجیہ سمجھا ۱۸ دسمبر ۱۹۷۶ء) پیراگراف ۲۷

میں نقل فرمایا ہے اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ حکومت اہل و زرا، تمام کے تمام یکساں شہری قانون بنانے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن مسٹر مردھانے صاف کہا ہے کہ دفعہ ۱۲۷ کی موجودگی میں (دفعہ ۱۲۷) (۳) ب سے ایک استثنیٰ پیدا کرنا اور اصل قدیم حد جدید کے درمیان ایک مفاہمت ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حکومت چونکہ یکساں سول کوڈ بنانا ہی چاہتی ہے، اس لئے دفعہ ۱۲۷ (۳) ب سے مراد مہر لے لیا جائیگا بالکل غلط ہے یہ مفاہمت قدیم اور جدید کے درمیان نہ ہوگی بلکہ قانون اور محترم جج صاحبان کے درمیان ہوگی کیونکہ ”مہر“ ہر حال میں واجب الادا ہے اور علم احادیث کی صورت میں عورت اس کے لئے دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کی موجودگی کے بغیر بھی استغاثہ دائر کر سکتی ہے۔

(۶) یہ بات کہ دفعہ ۱۲۷ (۳) ب مسلم پرسنل لار کے تحت مسلمانوں کے لئے ایک

استثنا کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے قبل بعد عدت نفقہ کے جتنے کیسز فیصل ہوئے ہیں ان سے مسلم پرسنل لا میں صریحی مداخلت ہوتی ہے خود اسی کیس کی کاروائی سے ظاہر ہوتا ہے جس کا ذکر پیرا گراف ۳ میں کیا گیا ہے۔ مسٹر جسٹس مرتضیٰ فاضل علی اور مسٹر جسٹس ور دراجن نے اس کیس کو ایک بڑی دستوری پنچ کے حوالہ کئے جانے کے دو اسباب بتائیں (۱) ۲ ایلن ہی، آر ۵۷/۱۹۷۹ اور ۳ ایلن ہی، آر ۱۱۲۷/۱۹۸۰ کیسز کا فیصلہ دو اسباب سے نظر ثانی کا محتاج ہے ایک تو یہ کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۷ (۳) ب ظہر الفاظ میں ان شو ہرول پر سے دفعہ ۱۲۵ کے الفاظ کو باقوت کر دیتی ہیں جنہوں نے اپنی مسئلہ کو مہر اور عدت کا خرچ ادا کر دیا ہو۔

(۲) یہ فیصلے طلاق کے بنیادی تصور کے بھی خلاف ہیں اور ان سے مسلم پرسنل لا (شریعت) پبلیکیشن ایکٹ کے سکشن ۲ کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ یہ امر واقعاً محلِ توجہ ہے کہ مذکورہ دونوں ججوں کو جسکی رائے یقیناً اس کیس کے موجودہ فیصلے کے برخلاف ہوتی اس پنچ ہی میں متامل نہیں کیا گیا کیا واقعی ہمارے ان پانچوں ججوں کا جو اس پنچ میں شریک تھے یہ گمان ہے کہ سپریم کورٹ کے باقی تمام ججوں کی بھی اس کیس میں یہی رائے ہوتی؟ اگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ مذکورہ دونوں ججوں کے اختلاف رائے سے ظاہر ہے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس کیس کو قانون سے زیادہ، "خواہش" کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا ہے۔

یہ ہیں وہ سوالات جو شاہ بانو کیس کا فیصلہ پڑھ کر ذہن میں گذرتے ہیں اور ہم متنب ہیں کہ نئے صاحبانِ ان کے جوابات ضرور ارشاد فرمائیں۔

۱۳۔ شریعت کیا ہے؟ اب ہم مسلم عوام کی خدمت میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آج ہم فقط شریعت کا لہرہ لگا رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ شریعت ہے کہاں؟ شریعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: شرع لکم من الدین ما وصیٰ

بِهِ نُوْحًا وَالَّذِي اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وُعِدْنَا بِهِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰى اِنْ اَقِيْمُوا
 الدِّيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا فِيْهِ - كِبْرًا عَلٰى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ - اِنَّهُمْ يَخْتَصِمُوْنَ
 اِلَيْهِ مِنْ اِثْنَاءُ وَجِهَتِيْ اِلَيْهِ مِنْ يَنْبَغِ (الشوری - ۱۳) اس نے تمہارے
 لئے دین کا وہی طریقہ (شریعت) مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے
 اب) تمہارے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور
 عیسیٰ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو
 یہی بات ان مشرکوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہ گواہ گزری ہے جس کی طرف (اے نبی) تم انہیں دعوت
 دے رہے ہو، انہیں چاہئے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دیکھ
 ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ اس آیت میں لفظ "شرع"، استعمال ہوا ہے اس کا مطلب
 یہ ہوا کہ "اقامتِ دین" ہی شریعت ہے اور تمام انبیاء کو یہی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ
 کو قائم کریں۔ دین بھی کامل ہو چکا ہے جیسا کہ ارشاد ہے اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنََكُمْ
 وَاشْتَمَلْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَاضِيْتُ لَكُمْ اَلْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ - ۳) آج
 میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے
 اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

معلوم ہوا کہ پوری امت مسلمہ اس کی مکلف ہے کہ پورا دین قائم کرے اور یہی شریعت
 ہے، شریعت ایکٹ کے نام سے جب تک ہم ایک نہایت محدود اور مختصر اسلامی زندگی
 پر قانع رہنے کی کوشش کریں گے تو قدم قدم پر طاغوتی قوتوں سے ٹکراؤ ہوگا اس
 ضرورت اس کی ہے کہ پورے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

۱۴۔ علماء کرام کی خدمت میں | آج ہم افلاسِ علم و عمل کے جس درجہ تک پہنچے

نہیں اس کی ذمہ داری سے علماء بری نہیں ہو سکتے جو صرف علوم انبیاء کے ایسے ہیں
 بنی اسرائیل کے نبیوں سے مشابہ ہیں ہم نے اگر بنی اسرائیل کی تفریق درود رکھی ہو

شریعت کو دین سے الگ نہ کر دیا ہوتا تو آج اس حال کو نہ پہنچتے ہم جاہلیت سے مصالحت
کی خاطر شرائع اسلامی کے ہرگز تہہ سے ستون کو قلمبندی سے دیکھتے رہے اور اس پر قانع
ہوتے رہے ہمارے سامنے سورہ مائدہ کا ساتواں رکوع پورا کا پورا موجود رہا لیکن ہم
اپنے نفس کو مطمئن کرتے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے بارے میں ہے، اللہ تعالیٰ نے تہدید
فرمائی: **اَوْحَكُمُ لِلْجَاهِلِيَّةِ مَيْخُونٌ (المائدہ: ۵۱)** تو پھر کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ
چاہتے ہیں، لیکن ہم نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا **مَنْ يَحْكَمْ
بِمَا نَزَّلَ اللَّهُ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْبَاقُونَ - اِلَّا يَسِفُونَ**
(آلکاف: ۴۴ - ۴۵ - ۴۶) جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق
فیصلہ کریں تو وہی باقی رہیں۔ ظالم ہیں۔ فاسق ہیں۔ ہم نے یہاں فیصلہ کا مفہوم سمجھنے
اور سمجھانے میں ”مصلحت و وقت“ سے کام لیا۔ ہندوستان میں قوانین اسلامی کا تیا پانی
ہوتا رہا اور ہم ”ملک ملک دیدم دم نہ کشیدم“ کے مصداق **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ
وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ۵۶)** کی یہی تفسیر کرتے رہے کہ انسان
کی تخلیق کا مقصد اطاعت نہیں (صرف عبادت ہے) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید احمد شہیدؒ
سے لیکر علمائے صاف پور تک کی ساری قربانیاں ہمارے لئے نہ اخلاف، کی ایک شاندار
تاریخ بن کر رہ گئیں۔ اور ہم بھی تاریخ اپنی الاریوں میں سا کر آج ”اسلاف پرستی“ کی یاد
تازہ کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشن کو زندہ رکھا ہوتا پھلی ایک
صدی میں جو تغیرات ہوئے ان پر قانع نہ ہو گئے ہوتے تو شاید آج اس کی نوبت نہ آتی
کہ ہم اسلامی شریعت کی اس آخری کڑی (پرستل لام) کو دانوں سے پکڑنے کی انتہا
تک پہنچا دیئے جاتیں، آج بھی جبکہ یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ اسلام میں سیاست
بھی داخل ہے ہم لوگوں کو خبردار کیا کرتے ہیں کہ دین کی سیاسی تغیروں سے ہوشیار رہیں
اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صاف علم اور ہر صاحبِ علم کو ذی فہم و ذی شعور بنائے آمین۔

۱۵۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے کرنے کا کام | اس بات کے درست ہونے میں کوئی

شبہ نہیں کہ معاشرہ کا جو ضابطہ ہے اور جس کی وجہ سے حکومت یا عدلیہ کو مسلم پرسنل لا میں دخل اندازی کا موقع ملتا ہے اس کا سب سے بڑا سبب مسلم معاشرہ میں پھیلی ہوئی جہالت ہے اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی آہ و زاری سے حکومت کو باخبر رکھے، (یہ کام حکومت کی سی آئی ڈی بہت اچھی طرح کرتی ہے) یا اس سے کچھ مطالبات کرتا رہے بلکہ اسے چند اوراقیات بھی کرنے چاہئیں۔

(۱) لوگوں کو نکاح و طلاق، نفقہ، سکنتی اور تکلیف وغیرہ کے مسائل سے روشناس کرایا جائے۔ تکلم اگرچہ طلاق واقع ہونے کے لئے شرط نہیں ہے لیکن کے اختلافات کا یہ وہ علاج ہے جو امثلہ سے جو تجربہ کرنا ہے۔ *وَأَنْ حَفَّتْ شَفِيقًا بَيْنَهُمَا فَاِغْتَا* *حُكْمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحُكْمًا مِنْ أَهْلِهَا* ای بکریداً *أَمْلًا لِّحَا* *يُوفِقِ* *اللَّهُ* *بَيْنَهُمَا* (البیہ: ۲۵) اور اگر کہیں تم لوگوں کو میاں بیوی کے تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کر دو۔ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو امثلہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا، ہم نے اللہ کا بتایا ہوا نسخہ شفا اپنے معمولات مطبے خارج کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے تفریق بین الزوجین کا تناسب بڑھ گیا ہے جب لوگوں کو عائلی قوانین کے مسائل سے کما حقہ واقفیت ہو جائیگی، تو انشا اللہ معاشرہ کے مسائل بھی کم ہو جائیں گے،

(ب) اجتہادی اور اختلافی مسائل میں مختلف الفکر علماء کے درمیان مذاکرات منعقد کر کے "سیر" دآسانی کی راہ اختیار کی جائے، بین ہلاقوں کے بارے میں ائمہ دین اور اصحاب قاسم کا ائمہ اربعہ سے اختلاف مشہور ہے۔ چند سال پہلے مفتی عتیق الرحمن جوہر کی صدارت میں اس مسئلہ پر احمد آباد میں ایک سمینار منعقد ہوا تھا۔

جس کی وجہ سے علماء کے درمیان اختلاف فکر کم ہوا تھا۔

طلاق مکرہ (جبری طلاق) کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ بہت معروف ہے۔ اسی طرح طلاق غضبان اور طلاق سکران (غصہ یا تشہ کی حالت میں دی گئی طلاق) امام تیمیہ علیہ الرحمہ جیسے اجل علماء کے نزدیک واقع نہیں ہوتی۔

”متشددین فی الفقہ“ سے درخواست ہے کہ وہ کم از کم مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسی فکر اور حرارت پیدا کریں، جنہوں نے زوجہ مفقودہ اخیر کی مدت انتہا کے بارے میں عورتوں کو ارتداد سے بچانے کے لئے فقہ حنفی کو چھوڑ کر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فتویٰ صادر فرمایا تھا، (ملاحظہ ہو ان کی کتاب الحیلۃ الناجیۃ للتحلیۃ المعاجزۃ) اسی پر جنون اور عتین (نامرد) کو قیاس کیا جاسکتا ہے، اجتہاد پر ایک ثواب اور صحیح اجتہاد پر دہرے ثواب کا اجزاء ہیں یہ نصیحت دیتا ہے کہ اختلافی مسائل میں سہل ترین راہ عموماً (اور فتنہ کے احوال کی صورت میں خصوصاً) اجتہاد کی جانی چاہئے اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے ”یُریدُ اللہُ مَکُتُّہُ اَیُّسُہُ وَلَا یُریدُ مَکُتُّہُ الْحَرَامُ“ (البقرہ - ۱۸۵) اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نہی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا پس اگر اختلافی مسائل میں تفسیر کی راہ اختیار کی جائے تو یہ فتنائے قرآنی کے عین مطابق ہوگا، (حجۃ) جگہ جگہ شرعی بنچائیں قائم کرے جہاں ہر مرد و عورت کی جائز شکایات کا مدارک ہو، کیونکہ عدالتیں انہیں مقدمات کو فیصلہ کیا کرتی ہیں جو داد دہی کے لئے ان کے یہاں داخل کی جاتی ہیں اگر مسلمان ان عدالتوں میں جانا چھوڑ دیں تو وہ ہوا میں فیصلے صادر نہیں کر سکتیں۔ یہ تو دراصل ہم ہیں جو انہیں مداخلت فی الدین کی دعوت دیتے ہیں۔

(د) ایک مرکزی قانونی بورڈ تشکیل دے جس میں ایسے قانون دانوں کی خدمات حاصل کی جائیں جو دین کا بھی علم، فہم اور شعور رکھتے ہوں تاکہ وہ ہول کے رنج کو دیکھتے رہیں

اور ہندوستان کے تمام قانون ساز اداروں میں جو بھی حل پیش ہوں ان کا مطالعہ پیش کر کے شریعت اسلامیہ کے نقطہ نظر سے ان کے انتظامات کی نشاندہی کریں گزشتہ سالوں میں پاس کئے گئے قوانین کا مطالعہ کر کے ان کے اسلامی شریعت سے متصادم دفعات کی بھی نشاندہی ضروری ہے۔

(۱) ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ (۱) قانونی طور سے بذات خود قابل اعتراض ہے جس پر آج تک مقننہ نے غور کیا نہ عدلیہ نے یہ دفعہ صرف ان عورتوں کو تحفظ دیتی ہے جن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے آخر اس "نفع" سے وہ عورتیں کیوں فائدہ نہیں اٹھا سکتیں جو کسی طرح محنت و ملازمت کر کے اپنا خرچ چلاتی ہیں۔ یہ قانون کی عدم مساوات۔

(۲) سب سے جس کے تحت ہر مطلقہ کو برابر کے حقوق نہیں مل رہے ہیں دیکھئے اسلام نے عورتوں کو مال رکھنے اور کمانے کی آزادی دی ہے لیکن اس کا نفقہ شوہر کے اوپر فرض ہے۔ اس بارے میں کمانے والی یا نہ کمانے والی کے درمیان کوئی تفریق نہیں دراصل دنیا کو اس الٹی قانون (قرآنی قانون) سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے، ہماری رائے ہے کہ حکومت ہند اگر ہندوستان کی تمام عورتوں کے ساتھ انصاف کرنے میں واقعی مخلص ہے تو اسے سب سے پہلے یعنی مرحلہ اول میں اسلام کا پورا عائلی نظام اختیار کر لیا جائے اس کے بعد ہی اسے اس نظام کی برکتوں کا اندازہ ہو گا لیکن یہ نظام ان تمام غیر اسلامی استقامات سے عرف نظر کرتے ہوئے اختیار کرنا چاہئے جو موجودہ شریعت ایکٹ میں پائے جاتے ہیں۔ ورنہ

۱۶۔ مقننہ اور عدلیہ سے (ب) مقننہ (دستور کی آرٹیکل ۳۰ تا ۳۵)

۳۰ تا ۳۵ متعلقہ بنیادی حقوق کی پابندی ہے گو نگ ناتھ کیس (سپریم کورٹ اے آئی آر ۱۹۶۸ کے بنیادی حقوق)

(گورنمنٹ اموروں)

۱۷۔ فوقیت دی ہے دستور کی آرٹیکل نمبر ۳۴ مسلمانوں کے

تعلق سے ہمیشہ غلط فہمیاں پیدا کرتی رہی اس لئے اسے خارج از دستوری کر دینا مناسب ہوگا، لیکن اگر کچھ معاملات میں اس میں مائع ہوں تو جس طرح آرٹیکل ۲۵ (۲) (۱) سے سکھوں کا کرپان رکھنا مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اسی طرح آرٹیکل ۲۲ کے اثرات سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دینا چاہئے۔ ہسپتال میں اگر زوجین کے تعلق سے کوئی دشواری پیش آرہی ہو تو جو فریق اسلامی قانون کی بے حتمی کا متعجب ہو اس پر حرج مانہ کرنے کا قانون بنایا جاسکتا ہے۔ جس کی رقم لازماً فریق ثانی کو دی جانی چاہئے جیسے کوئی مرد اگر اپنی بیوی کو غیر مشروع طلاق دے تو طلاق تو واقع ہو جائے گی لیکن اس طریقہ زیر مشورہ کو سزا کے طور پر شوہر سے جو رقم وصول اسے عدالتی خرچہ میں محسوب کرنے کے بجائے) مطلقہ کو دیا جائے۔ مزید یہ کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۷ (۲) ب کو دفعہ ۱۳۵ کے ساتھ منظم کر دیا جائے یا دفعہ ۱۲۵ (ب) کی تشریح میں بیوی کی تعریف سے مطلقہ کو خارج کر دیا جائے۔

(۴) عدالتوں کا کام یہ ہے کہ جذبات سے مبرا ہو کر قانون کا انطباق کہا کریں اور یہ پتلا چھوڑ دیں کہ وہ تمام قوانین بشمول قرآنی قوانین کی بھی تفسیر کا حق رکھتی ہیں سماجی مصلح بننا بھی ان کے فرائض میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ رائے الوقت قوانین کو نافذ کرنے کا اختیار ہی رکھتی ہیں، مسلم مسائل کے تعلق سے ان کے لئے یہ بھی فروری ہے کہ کسی شرعی نیچا پر سے اگر کوئی فیصلہ کر دیا ہو اور قوت نافذ نہ ہونے کی وجہ سے اسے نافذ کرنے سے وہ منذور ہو تو اس فیصلہ کو قانونی حیثیت دیں تاکہ اس کا نفاذ ہو جائے جیسا کہ عام نیچا قبیضہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نیز کسی نافذ شدہ فیصلہ میں دخل اندازی نہ کریں جیسا کہ امارت شریعہ ہمارے فیصلوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ان عدالتوں پر مسلمانوں کا اعتقاد بیکار ہو سکتا ہے۔ وکلمۃ اللہ ہی العلیا۔

عربی علوم و فنون

اور جدید یورپی ادب

شمیم الحسن امانت اللہ

علم و ادب کا سرمایہ رکھنے والی قومیں جہاں جاتی ہیں وہاں اپنے علمی اثرات، ثقافت کے نقوش اور تہذیب و تمدن کے ایسے روش و شمس منار سے چھوڑ جاتی ہیں جن سے دنیا ہمیشہ بہائی حاصل کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح عرب قوم اگر ایک طرف حریت و شجاعت، ہمت و استقلال اور عزم و ثبات کی پیکر تھی تو دوسری طرف علوم و فنون، حکمت و معرفت اور تہذیب و تمدن کی عظیم دولت سے ناواقف بھی تھی، اس قوم نے جن جن مقامات پر فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے وہاں علوم و فنون کے دریا بھی بہا دیئے۔ چنانچہ اپنی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے عربوں نے جہاں نہ لیں کو فتح کیا تو اسے عربی ثقافت اور علوم و فنون کا مرکز بنا دیا، اور پھر یورپ نے دل کھول کر اس گہوارۂ علم سے استفادہ کیا یورپ قرون وسطیٰ میں نہ صرف فلسفہ و ادب بلکہ دیگر تمام علوم و فنون میں عربوں سے بہت پیچھے تھا۔ لیکن عربوں کے انھیں ذخیروں سے استفادہ کر کے آج وہ اپنا سر فلسفہ اور ادب کے میدان میں بھی بلند کر رہا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اب اسے علم و فضل کے میدان میں دنیا کی قیادت کا دعویٰ بھی ہو گیا ہے۔ حالانکہ عمیق مطالعہ کرنے والوں اور اصحاب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ان کے بیشتر علوم عربوں ہی کے مزہبون و سنت ہیں، طب ہو یا حکمت، فلسفہ ہو یا منطق، کیمیاوی علوم ہوں یا ریاضیات کے لایخل مسائل، موسیقی ہو یا فنِ تعمیر، صنعت ہو یا تجارت، الغرض تمام علوم و فنون عربوں ہی کے اثرات سے متاثر ہیں۔

اہل یورپ کو قدیم یونانی فلسفہ سے مدد حاصل کرانے میں عربوں ہی کے علم و فضل کو دخل ہے۔

عربی کتب فلسفہ کے لاطینی زبان میں منتقل ہونے سے پہلے یورپ یونانی فلسفہ سے بالکل نا آشنا تھا، اسی طرح یورپ کو مدنی علوم سے متعارف کرانے میں اندلس اور صقلیہ کے علماء کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے، صقلیہ نے جو عربوں کے ۱۲۰ سالہ دورِ حکومت میں علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے اپنے علوم و فنون کی بارش سے پورے یورپ کو خوب خوب میرا کیا اور یہ اسی گلشنِ علم و ادب کی خوشبو ہے جس نے آج تک یورپ کی فضا کو معطر کر رکھا ہے۔

خود نورماندی بادشاہوں نے عرب علماء اور دوسرے مترجمین کی مدد سے بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبانوں میں ترجمہ کروایا، چنانچہ روجر ثانی نے اسلند میں مشہور عرب جغرافیہ ابو عبد اللہ محمد بن الادریسی کو پورے آباد علاقوں کا عربی زبان میں جغرافیہ تیار کرنے کا کام سپرد کیا تھا،

اندلس اور صقلیہ کے علاوہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یورپ کو مصر، سوریہ اور فلسطین نے بھی تہذیب و تمدن کے بہت سے خزانے دیئے ہیں۔

یورپ عربی حضارت اور ثقافت سے جس قدر متاثر ہوا ہے اس کا موجودہ دور میں پوری طرح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کے کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یورپ کی تاریخ میں قرونِ وسطیٰ کا زمانہ ابھام و غموض کی تاریکی میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ اصل حقیقت کا پتہ لگانا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اندلس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک طویل جنگ کے بعد جب اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوا تو وہاں کی فضا عربوں کے خلاف نفرت و تعصب اور بغضِ محمد کے زیر سے پوری طرح مسموم ہو چکی تھی، اور جس نے عربی اثرات کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اور تیسری وجہ جو نہایت اہم اور ناقابل تردید ہے وہ یہ کہ یورپ نے ہمیشہ دوسروں سے استفادہ کے بعد انھیں فراموش کر دیا ہے یورپ کے تمام مورخین پر آج بھی یہ تنگ نظری غالب ہے فلسفہ اور دیگر علوم کے علاوہ عربی شاعری اور شہزنگاری نے بھی یورپ کے ادب پر گہرا اثر

چھوڑا ہے۔ جسے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل یا بُرہان کی ضرورت نہیں۔ خود عربی ادب اور لٹریچر کا لاطینی زبانوں میں منتقل کیا جانا اس کا ایک بڑا ثبوت ہے اسی لئے ابوالعلاء المعری کی بعض مثنویاں اور ڈانٹے کے بہت سے اشعار میں کافی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور اسی طرح معری کی کتاب رسالۃ الغفران اور کومیڈیا مقدسہ میں بھی بہت سی جگہوں پر ہم خیالی پائی جاتی ہے مثال کے طور پر ایلوئی شاعرہ ڈانٹے، جہنم میں اپنے گشت کے دوران چند لاطینی شعرا سے ملاقات کرتا ہے۔ جو حضرت یحییٰ کی ولادت سے پہلے ہی مر چکے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ابوالعلاء المعری امرو القیس، نابغہ اور دیگر جاہلی شعرا سے جہنم میں ملاقات کرتا ہے اسی طرح یورپ کی شاعری میں اگر کہیں قافیہ کا استعمال نظر آتا ہے تو یہ بھی عربی ہی شاعر کی نقل ہے کیونکہ قریم یورپی شاعری اور خصوصاً یونانی اور لاطینی زبانوں کی شاعری میں قافیہ بجدی اور وزن کا برقرار رکھنا شعر سے ہی مفقود ہے، عربی شاعری کی اصناف میں نظموں، قوی تراویں، قصوں اور گالوں نے اپنے اثرات اور بھی زیادہ بچھوڑے ہیں کیونکہ اندلس کے اہل طرب یورپ کے شہروں میں جاتے اور موسیقی کے آلات ان کے ساتھ ہوتے جہاں جاتے محفلیں جمع جاتیں اور ہر طرف ان کے گالوں کا چرچا ہو جاتا۔ ان کی موسیقی کی دھوم پڑ جاتی، زبان کی شیرینی، چنگ و رباب کا دھن لوگوں کو اپنا سر دھننے پر مجبور کر دیتے اسی کے نتیجے میں گیارہویں اور بارہویں صدی میں یورپ میں پیدا ہونے والے شعرا میں ایک گروہ پیدا بھی تھا جو اشعار کو گاکر پڑھا کرتا تھا، اور ان کے پڑھنے کا طریقہ عربوں کے لہجے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ ان شعرا کو یورپ میں شعراء طرود بادوز کہا جاتا تھا لفظ طرود بادور کے بارے میں مستشرق ریمبرا کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی کے لفظ طرب سے مستق ہے یہ شعرا زیادہ تر ایسے اشعار کہتے تھے جو معنی کے لحاظ سے منسوب سے متعلق ہوتے ہیں جو عربی شاعری کی اہم صنف ہے شعراء طرود بادور کے اشعار اور اذنان و قوافی اندلس کے قوی تراویں سے بہت حد تک مشابہ ہوتے تھے جو اب تک عرب تک اس میں معروف رہے۔

قرون وسطیٰ میں یورپ میں بہت سے ایسے قصبے بھی لکھے گئے جو بلاشبہ عربی قصوں سے ماخوذ تھے چنانچہ عشق و محبت کی داستانوں میں اہل یورپ نے عروہ بن تزام، عفرار، قیس بن ذریج اور یسعی وغیرہ کا انتخاب کر کے عربی ناول نگاری سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

عربی ناول نگاری نے فرانسیسی ادب کو خاص طور سے متاثر کیا ہے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں فرانسیسی زبان میں بہت سے ایسے قصبے لکھے گئے جن میں عربی قصہ نگاری کا رنگ پوری طرح غالب تھا۔ مثال کے طور پر قصہ اوقاسین اور نیکیولیت کو بھیجے جہاں عربی رنگ پوری طرح واضح ہے۔ نیز اس میں ہیرو کا نام محض تھوٹری سی تریف کے بعد قائم کے بجائے اوقاسین رکھ دیا گیا ہے۔

قرون وسطیٰ میں عربی زبان کے جن قصوں کا ترجمہ لاطینی زبانوں میں ہوا ان میں کلیلیہ و دمنہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، جس کی وجہ سے یہ قصے سارے یورپ میں مشہور ہو گئے اور اور حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب کلیلیہ و دمنہ ہی نے پورے یورپ میں چوالوں اور چڑیوں سے متعلق ادب کی بنیاد ڈالی۔

اسی طرح سنہ ۱۲۰۰ء میں جب پہلی بار الف لیلیہ و لیلیہ کا ترجمہ لاطینی زبانوں میں شائع ہوا تو نہایت شہرت سے سارے یورپ میں پھیل گیا اور قارئین کے حلقے میں اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بعد متعدد مشرقی زبانوں سے بہت سے قصوں کے ترجمے یورپی زبانوں میں کئے گئے حتیٰ کہ یورپ کے بہت سے ادبا نے مشرقی اور عربی اسلوب کو اپنی ناولوں میں جگہ دیدینا شروع کر دیا، چنانچہ مستشرق (جی) نے اپنی کتاب تراش الاسلام میں لکھا ہے کہ ”میں یہ کہنے میں قطعی عار محسوس نہیں کرتا کہ اگر الف لیلیہ و لیلیہ نہ ہوتی تو ڈانیل ڈیفو اپنا شہرہ آفاق ناول ”روبنسن کروزو“، ہرگز وجود میں نہیں لاسکتا تھا، اور نہ ہی سویتسکی سفرنامہ ”کلیور ہی اس قدر مقبول ہوتا۔“

جسٹس بشیر احمد صاحب ^{قسط ۲}

حیات، شخصیت اور سیرت

از: محمد یوسف کوکن، پرنسپل، جمالیہ عربی کالج مدراس ۱۲

آپ نے ۱۹۴۷ء میں سیلون کا سفر کیا، اور وہاں سے ملائے گئے پھر ۱۹۴۸ء میں برما کا سفر کیا اور آٹھ لاکھ روپیہ نو کالج کے لئے جمع کیا پھر ۱۹۵۵ء میں مشرقی آفریقہ گئے اور مختلف جگہوں کا دورہ کیا اور سدرن انڈیا ایجوکیشن ٹرسٹ اور اس کے تحت بنائے ہوئے عورتوں کے کالج کے لئے بہت سا روپیہ جمع کیا، پھر ۱۹۵۹ء میں قاہرہ تشریف لے گئے اور وہاں کے وزیر تعلیم اور وزیر اوقاف اور مفتی امیر کسینی سے ملاقات کی، پھر انور السادات سے بھی ملے، اور شیخ الازہر سے بھی ملاقات کی، سفیر ہندوستان کے ہر ونے وزیر داخلہ ہند کو تار بھیجا کہ یہاں بھی روپیہ وصول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر وہ قاہرہ سے یروشلم، بیروت، دمشق، بغداد، بصرہ گئے، یروشلم میں بہت سے مقدس مقامات دیکھے، عراق میں کربلا کی زیارت کی اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر بھی حاضر ہوئے، بصرہ سے کویت بحرین اور قطر کے مختلف شیوخ سے ملاقات کی اور ہر جگہ عورتوں کی کالج کے لئے روپیہ وصول کیا، قطر میں شاہی مہمان رہے شاہ قطر نے ایک لاکھ روپیہ عنایت کیا، بیروت سے کراچی ہوتے ہوئے ۲ فروری ۱۹۵۹ء کو مدراس پہنچے، مئی جون ۱۹۵۹ء میں فریضہ حج ادا کیا، شاہ فیصل سے ملاقات کی اور انھیں توجہ دلائی کہ ہندوستانی عربی طلبہ کو سعودی مملکت کی یونیورسٹیوں میں مزید عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی گنجائش پیدا کی جائے شاہ فیصل نے کہا ہم ضرور اس کا انتظام کریں گے،

اس سال کے اواخر میں انھوں نے ملیشیا کا دورہ کیا اور بہت سارے وسیع مجمع کیا ۱۹۶۰ میں وہ امریکہ گئے اور مختلف جگہوں کا دورہ کیا اور مختلف حضرات سے ملے، مونٹریال میں مشہور مستشرق پروفیسر کانت ویل اسٹیم سے ملے، اور اس کے منعقد کئے ہوئے متاعری میں شرکت کی، انھوں نے وہ نظریں سنائیں جو انھیں یاد تھیں، انھوں نے بفلو نیورسٹی دیکھی اور نیا گرا آبشار بھی دیکھا کارنل یونیورسٹی میں ہوم سائنس ڈیپارٹمنٹ دیکھا نیویارک میں یو، این، او اسمبلی کے ایک اجلاس میں حاضر ہوئے، مسٹر شیرمان کوپر سابق سفیر امریکہ دہلی سے بھی ملاقات کی، واشنگٹن میں سابق سفیر امریکہ دہلی مسٹر چسٹر لوس سے ملاقات کی،

امریکہ سے وہ لندن آئے اور دوکنگ مسجد دیکھی اور نماز پڑھی لندن یونیورسٹی کے رجسٹرار سے تعلیمی معاملات پر گفتگو کی، لندن سے پارلیس اور برلن ہوئے ہوئے جنیوا آئے، قادر حیدر دم ڈی سونرا سابق پرنسپل لیولا کالج مدراس کے توسط سے یوپ سے ملاقات کی، وہاں سے بیروت پہنچے اور وہاں سے فروری ۱۹۶۱ء میں کراچی آئے پھر ۱۵ فروری کو بمبئی پہنچے، پھر مدراس آئے۔

مارچ اپریل ۱۹۶۱ء کو ماریشیس گئے، اور مختلف لوگوں سے ملے، انھوں نے وزیراعظم مسٹر رام نلام سے بھی ملاقات کی،

نومبر ۱۹۶۱ء میں شیخ الاسلام ہرڈاکٹر عبدالحکیم محمود کی دعوت پر مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی آکٹویس کانفرنس میں شریک ہوئے، انوار اسادات سے بھی ملے وزیر اوقاف شیخ متولی شعراوی سے بھی ملاقات کی اور جدہ، مکہ، ریاض، قطر، کویت، بھتی ہوتے ہوئے دسمبر ۱۹۶۱ء میں مدراس پہنچے۔

ستمبر ۱۹۶۱ء میں وہ کناڈا گئے اور مختلف شہر مل کا دورہ کیا اور پھر لندن ہوئے ہوئے دہلی پہنچے اور وہاں کے شیوخ سے ملاقات کی، شیخ سیف احمد القیر کوکالج

کے اندر دس منزلہ عمارت کے افتتاح کا درخواست کی، مگر وہ مدراس نہیں آ سکے انھوں نے پھر دوسرے کناڈا کا سفر کیا، دوسری مرتبہ ان کے واپسی پر پونچنے سے پہلے ہی کالج میں اسٹرائک شروع ہو گئی، جسکی وجہ سے ان کا دل ٹوٹ گیا، اس کالج کو عورتوں کی یونیورسٹی بنانے کا عزم بھی ختم ہو گیا گذشتہ سات آٹھ سال سے وہ حکومت تامل ناڈو سے کالج کے لئے کوئی مالی امداد قبول نہیں کر رہے تھے، اساتذہ اور طلبہ کی اسٹرائک کی وجہ سے حکومت وقت کے بعض قوانین ماننے پڑے اس وقت سے استانیاں حکومت سے تحولہ حاصل کر رہی ہیں۔

وہ علم پھر قانونی مسائل پر ایرادات اور تہمتیں کرتے رہے اور مختلف تعلیمی و سماجی کانفرنسوں کی صدارت کی، ان کے خطبے قانونی اور تعلیمی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں، اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو آئندہ نسل کی ترقی میں بہت مدد و معاون فائز ہوں گے، انھوں نے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی ترقی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا کہ جس پر انھوں نے وضاحت کے ساتھ گفت گو نہ کی ہو۔ یہ حکومت تامل ناڈو نے پرائیوٹ کالجوں کے اختیارات میں مداخلت کرنی شروع کی تو ان کے کڑا دھڑا جن میں سے اکثر ہندو اور مسیحی تھے، جسٹس صاحب مرحوم سے مشورہ کیا اور پھر ایک جمعیت ۱۹۵۸ء - ۱۹۵۹ء میں اسوشیشن آف مینیجٹس آف پرائیوٹ کالجس کے نام سے بنائی جس کے پہلے صدر مدراس ہائی کورٹ کے مشہور جج سر سٹروئی، ایل رتھراج تقرر ہوئے ان کی وفات کے بعد جسٹس صاحب اسکے صدر ہوئے تو انھوں نے حکومت وقت اور مدراس یونیورسٹی کی سب سے زیادہ داخل انداز پر سخت تنقید کی، اسکی وجہ سے مدراس یونیورسٹی اور حکومت وقت آگے نہیں بڑھ سکیں، امد مداخلت کرنی چھوڑ دی مگر اب بھی رد یہ کہ یہ مسائل اٹھ رہے ہیں۔ حکومت تامل ناڈو چاہتی ہے کہ ایس، ائی، ائی، ٹی، ویس کالج کا انتظام بنے ہاتھ میں لے لے، جسٹس صاحب نے یہ حکمی دی کہ اس کے خلاف سپریم کورٹ دہلی میں رٹ پٹیشن داخل کی جائیگی اب ان کی وفات کے بعد کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ کیا ہو گا۔

مسلم پرسنل

(اور حضرت مفکر ملت کی یاد)

از جناب محمد اظہر مدنی (اندو عرب پریس فیچرس)

قوموں اور ملکوں کی تاریخ کے سینہ میں ایسے بہت سے واقعات محفوظ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کسی ملت اور کسی ملک کے افراد کو اس وقت تک کسی اہم بلندا اور عظیم مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہو سکی جب تک ان کے اندر اتحاد و اتفاق یکا نگت اور اجتماعیت کے وہ جذبات پیدا نہیں ہو گئے جو کامیابی کی منزل سر بلندی کے درجہ اور خوشحالی کے مقام اند تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے، تاریخ صاف صاف اعلان کرتی ہے کہ ہر عروج کی بنیاد اتحاد و اتفاق کی طاقت و برکت پر ہی ہے اور ہرزوال کے پیچھے آپس کے انتشار و اختلاف کے سیاہ تاریک اور مہیب ظلمتیں موجود رہی ہیں جب جب کسی قوم اور کسی ملت کے افراد نے اپنے آپ کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرو کر اللہ کی رستی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیا اور باہمی تفریق سے اپنے آپ کو بچا لیا تو وہ آہن و فولاد کی دیواروں کو شکست دینے پہاڑوں کو مسخر کرنے طوفانوں کا مقابلہ کرنے اور سیلاب و طلاء ظلم کا رخ پھیرنے کے قابل ہو گئے گویا قرآن عزیز کے ارشاد مقدس "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا" کا عملی نمونہ جس قوم نے اپنے آپ کو بنالیا اور اللہ پر ایمان کامل کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا تو یہ دنیا و زمین و آسمان یہ در و دیوار یہ فضائیں ان کی کامیابی پر فخر کرنے اور دوست اور دشمن ان کی شہداء و فتوحات کے لئے خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہوئے عزت و سر بلندی، طاقت و سرخروئی عظمت و شوکت ان کے قدم چومنے پر مجبور ہوئی

وقت کے مغروب سرعم فرعونوں کی اکڑی ہوئی گردنیں خم ہوئیں یا ٹوٹ گئیں اور جب جب افتراق و انتشار کی تباہ کن ہوائیں چلیں اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے اختلافات بغض و عناد کے زہریلے جراثیم ان میں پیدا ہوئے تو عزت و سربلندی عروج و اقدار حکومت و شوکت کی فیل تن دیواریں اور سرفک محل زمین بے آدہ ہے۔ افلاس، ناکامیاں، ذلت و رسوائی اور پستی و منتری کی خواست سامانیاں کچھ اس طرح ان پر مسلط ہو گئیں کہ تاریخ میں عبرت و نصیحت کے درد انگیز باب کا اضافہ ہو گیا اور دنیا کی کمزور سے کمزور پست سے پست قوم ان پر غالب آ گئی۔

یہ وہ صاف و شفاف اور زکری ہوئی سچائی ہے جس سے انکار کرنا کسی بھی انصاف پسند انسان کے لئے ممکن نہیں ہے گزشتہ دنوں مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق کے بل کی ترتیب اس کی تکمیل اور پھر پارلیمنٹ کے ایوانوں میں حشر نیر طوفان آمیز ماحول اور بد شور فسادوں کے اندر اس کی عظیم الشان طریقہ پر کامیابی و منظوری ہے اس جیتی جاگتی حقیقت کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے کراچی میں کامیابی و برکت ہے۔ اور اختلاف و افتراق میں ہلاکت ہے۔

اس بل کی منظوری نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اگر حقائق کو دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے اور معقولیت و حقیقت پسندی کو جذبات پر غالب رکھا جائے تو مسائل کی ابھی ہوئی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور لیل و نہار کی گردشیں ان کے سامنے تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ (ہماری)

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد نمبر ۹۸ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ مطابق اگست ۱۹۸۶ء شمارہ نمبر ۲

- | | | |
|---|-------------------------------------|----|
| ۱۔ نظرات | جیل مہدی | ۲ |
| ۲۔ مسلم پرسنل امور اور حضرت مفکریت کی یاد | جناب اظہر صدیقی انڈو عرب پریس فیچرس | ۹ |
| ۳۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم اور برہان | مسعود الزور علوی کاکوروی | ۱۸ |
| ۴۔ ڈاکٹر نور النبی مرحوم | حمید رفیع آبادی، ایم، اے علی گڑھ | ۳۳ |
| ۵۔ ایڈز قدیم یونانی تصویر قرآن حکیم اور میڈیکل سائنس کی روشنی میں | اقبال احمد قاسمی ایم، ڈی | ۳۸ |
| ۶۔ ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ | د علم الادویہ | ۳۸ |
| ایک صاحب طرز النشا پرداز | محمد علام الدین، استاذ مدرسہ | ۴۷ |
| ۷۔ اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام | اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ | ۴۷ |
| | کمال جعفری | ۶۰ |

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۱۰ اگست کو ہندوستان کے سابق کمانڈر انچیف ارون کمار شریدتا دیدیہ کو پوتے چھاؤنی کے علاقے میں چار نامعلوم ہندو فوجیوں نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جبکہ وہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ سپر کا کھانا کھانے کیلئے گھر واپس لوٹ رہے تھے جنرل یڈر کا شمار فوج کے قابل ترین جنرلوں میں ہوتا تھا اور وہ محاذ جنگ پر بھی پہلے ۶۵ لاکھ اور پھر ۱۲ لاکھ کی جنگ میں شاندار خدمات انجام دے رہے تھے، اور دونوں بار انھیں فوجی اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا، پہلی بار وہ اس عہد پر ہندوستان کے کمانڈر تھے جس نے امریکن بیٹین ٹینکوں سے مسلح پاکستانی فوج کو شکست دینے کا کارنامہ انجام دیا تھا دوسری بار انھوں نے بتایا جاتا ہے کہ سائی میں برف تار پر قبضہ کرتے میں غیر معمولی اہلیت کا مظاہرہ کیا تھا جسے واپس لینے کیلئے پاکستانی فوج آج تک ناکام کوشش کر رہی ہے جنرل دیدیہ اپنی مدت ملازمت کے آخری ڈھائی برسوں میں ہندوستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف مقرر کیے گئے اور کسی بھی فوجی کے لئے یہ سب سے بڑا اعزاز مانا جاتا ہے اس سب سے بڑے عہدہ سے وہ گذشتہ ۶ ماہ پہلے ریٹائر ہوئے تھے اور اس وقت ریٹائرمنٹ کی پوسکون زندگی بسر کر رہے تھے ان کی فوجی زندگی کا سب سے بڑا اوجہم واقعہ — محاذ جنگ سے بھی زیادہ مازک اندہ فیصلہ کن واقعہ — امرتسر کے سنہری گردوارہ پر وہ فوجی کارروائی تھی جسے بعد میں آپریشن بلیو اسٹار کے نام سے موسوم کیا گیا، خود جنرل دیدیہ نے اس فوجی کارروائی کے بعد جس میں سکھ انتہا پسند لیڈر سنت بھنڈراں والے اور سابق فوجی کمانڈر رمل شہجنگ سنگھ

فوجی کارروائی کے دوران فوج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے اور سنہری گردوارہ کا ایک بڑا حصہ منہدم ہو گیا تھا، اپنی فوجی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ قرار دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس فوجی کارروائی کا فیصلہ انہی فوجی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ ثابت ہوا۔“

سنہری گردوارہ پر آپریشن بلیو اسٹار پر اگرچہ جنرل ویدیہ کی فوجی سربراہی کی مدت میں عمل کیا گیا لیکن موقع پر اس کارروائی کی کمان لیفٹننٹ جنرل سدرجی کے ہاتھ میں تھی جو آج کل ہندوستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف ہیں۔ اس اعتبار سے آپریشن بلیو اسٹار کے سلسلے میں جنرل ویدیہ کی ذمہ داری رسمی تھی، اور انھیں براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہی اس کارروائی کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے لیکن انکی اصل شہرت اور سکھ انتہا پسندوں میں ان کے خلاف ناگواری اور غم و غصہ کا سبب ان کا وہ طریقہ عمل بنا جو انھوں نے آپریشن بلیو اسٹار کے بعد سنہری گردوارہ پر حملے سے جوش میں آئے ہوئے ان سکھ فوجیوں کے خلاف اختیار کیا جو بغاوت کر کے فوج سے نکل گئے، اور جنھوں نے مختلف چھاؤنیوں سے بھاگ کر امرتسر کی طرف فوجی مارچ شروع کر دیا۔

جنرل ویدیہ کے حکم پر ان بھگتوں نے سکھ فوجیوں کے خلاف جن میں زیادہ تر تعداد زیر تربیت فوجیوں یعنی رنکر وٹوں کی تھی، فوجی کارروائی کی گئی، اور انھیں مختلف ریاستوں سے گرفتار کر کے کورٹ مارشل کے سپرد کیا گیا، اس فوجی بغاوت کی ناکامی اور بھگتوں کی گرفتاری کے بعد جب سیاسی دباؤ کے تحت ان کے ساتھ نرم سلوک کرنے کا سوال سامنے آیا تو جنرل ویدیہ نے نہ صرف اس تجویز کی مخالفت کی، بلکہ فوجی معاملات میں سیاستدانوں کی مداخلت کے اسکان کو پوری طرح مسترد کر دیا انھوں نے ایک فوجی سربراہ کی حیثیت سے فوجی نظم و ضبط کو سختی کے ساتھ برقرار رکھنے کا موقف اپنایا، اور صاف طور پر فوجی نظم و ضبط کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کارروائی کو کورٹ مارشل کے دائرہ

اختیار کا مسئلہ بتاتے ہوئے فوجی عدالتوں کے اختیار میں کسی بھی قسم کی مداخلت کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

جنرل ویدیر کا یہی سخت موقف اور یہی بے لچک طرز عمل انتہا پسند سکھ حلقوں میں ان کے خلاف غم و غصہ بلکہ نفرت و انتقام کے جذبات پیدا کرنے کا سبب بنا اور اس کے بعد انھیں مگم نام دھکی آمیز خطوط ملنے کا سلسلہ شروع ہوا، یہ سلسلہ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلہ کا آخری گناہ خط جو خالصتان حامیوں کی طرف سے تھا انھیں قاتلانہ حملے سے صرف دو دن پہلے موصول ہوا تھا جس کے بعد ان کے حفاظتی اقدامات اور زیادہ سخت کر دیے گئے تھے۔

جنرل ویدیر کے قاتلوں کا یقینی طور پر ان سطروں کی تحریر تک شخص نہیں کیا جاسکتا ہے، اسلئے حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی ہلاکت ضروری سکھ انتہا پسندوں کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے، لیکن جہاں تک ظاہری علامات کا سوال ہے اس سلسلے میں دہشت پسند سکھ تحریکوں کے ملوث ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور ظاہری علامت اور قیاسات بھی اس کے حق میں اشارہ کرتے نظر آتے ہیں ان کے علاوہ انکی ہلاکت کے بعد ایک خفیہ دہشت پسند تنظیم خالصتان کمانڈ فورس نے انکی ہلاکت کی ذمہ داری قبول کی ہے اور خفیہ پولیس کے حلقے اس مفروضے پر زبردست چھان بین میں لگے ہوئے ہیں کہ جنرل ویدیر کے قتل میں اس خالصتان دہشت پسند جڑ کا ہاتھ ہو سکتا ہے یہ خطرناک دہشت پسند پنجاب سے اس وقت سے غائب بتایا جاتا ہے جبکہ اس نے چھ پولیس ملازمین کو بیک وقت قتل کر کے انکی تحویل سے تین خطرناک دہشت پسندوں کو چھڑا لیا ہے، خفیہ پولیس کا خیال ہے کہ پنجاب میں دہشت پسندوں کے خلاف زبردست مہم کے نتیجے میں پونا۔ اس طرح کے خوفناک دہشت پسندوں کے لئے جائے امن ہو سکتی تھی

اسلئے عین ممکن ہے کہ انھوں نے پونا میں قیام کر کے جنرل ویدیہ کے قتل کا منصوبہ تیار کر لیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان تین خوف ناک دہشت پسندوں نے سکھ دیوشنگہ عرف سپاہی سمیت اس منصوبہ میں حصہ لیا ہو، جنھیں جندانے ۵ اپریل کو جالندھر کے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت کے احاطہ میں ۴ پولیس والوں کو گولی مار کر چھڑا دیا تھا،

اگرچہ ابتدائی خبروں میں صراحت کے ساتھ اس بات کو ظاہر کر دیا گیا تھا کہ عینی شاہدین کی شہادت کے مطابق جن چار حملہ آوروں نے جنرل ویدیہ کی کار پر گولیاں چلا کر کرائیوں ہلاک کیا ان میں سے کسی کے ڈاڑھی نہیں تھی لیکن یہ کوئی ایسا یقینی ثبوت نہیں جو اس بات کا فیصلہ کر سکے کہ ان کے قاتل سکھ نہیں تھے بلکہ اس قیاس کو تقویت پہنچانے والی ایک بات ہو سکتی ہے کہ انھوں نے پولیس اور عام لوگوں کے شہادت سے محفوظ رہنے کے لئے ڈاڑھیاں منڈوا دی ہوں، لیکن اسی کے ساتھ اور بہت سے امکانات کو نظر انداز کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا، جو شورش اور ہنگاموں کے زمانہ میں معاملات و مسائل میں قدرتی طور پر شامل ہو جاتے ہیں اس صورت میں کہ شکوک و شبہات کے لئے ایک خاص گروہ یا شخص موجود ہو کہتے ہی اندسونی اور بیرونی عناصر کے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ حالات کو مزید خراب اور پیچیدہ بنانے کیلئے ایک ایسے کام میں ملوث ہو جائیں جس میں انکی طرف خیال تک جانے کی گنجائش کم سے کم رہ جائے۔

بہر حال اب یہ بات تو مستقبل بعید کی ہر گز کم از کم فوری طور پر اس بات کی کوئی امید نہیں ہے کہ جنرل ویدیہ کی ہلاکت کا عقدہ اس طور پر حل کر لیا جائے کہ کسی کو اصل قاتلوں کے تشخص اور شناخت کے بارے میں کوئی شک باقی نہ رہ جائے فی الحال تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ جنرل ویدیہ کا قتل۔ سابق وزیراعظم اندرا گاندھی کے بعد دوسرے درجہ پر ایک بہت بڑا۔ بہت اہم واقعہ ہے اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

کہ وہ ایک ایسے فوجی جنرل کے قتل سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے ذریعہ منہی سے سبکدوش ہو کر پرامن اور خاموش زندگی بسر کر رہا تھا، اور جس کا کوئی تعلق سیاست انتظامیہ یا فوج کی کسی سرگرمی سے باقی نہ رہا تھا، اسی کے ساتھ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ جنرل ویدیہ کے قتل سے فوج کی مستعدی، اہلیت اور حفاظتی انتظامات کی شہرت کو زبردست اور ناقابل تلافی صدمہ پہنچا ہے۔ جو جنرل ویدیہ کی سلامتی کی پورے طور پر ذمہ دار تھی، اور جس پر اس کے سابق سربراہ کے تحفظ کا ذمہ داری کا فرض بلا شرکت غیرے عائد ہوتا تھا۔

جنرل ویدیہ کے قتل کا واقعہ اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ فوجی چھاؤنی کی حدود میں ہی پیش آیا تھا ہر ہے کہ اس بارے میں فوج کے پاس اس طرح کی کوئی معذرت موجود نہیں ہے کہ اسے اپنے سابق سربراہ کی زندگی کو لاحق خطرہ کی خبر نہیں تھی یا وہ اس کے وقت اور امکانات سے ناواقف تھی، انکی ہلاکت کے بعد اب تک جو تفصیلاً سامنے آسکی ہیں ان سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جنرل ویدیہ کے تحفظ اور سلامتی کے انتظامات ہر ممکن خطرے کو پیش نظر رکھ کر کیے گئے تھے، بلکہ وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ بھی لیا جاتا تھا۔ پوتے کے فوجی مرکز کے اعلیٰ افسر دل کا اعتراف ہے کہ جنرل ویدیہ کے حفاظتی انتظامات کا آخری بار جائزہ ۸ اگست کو لیا گیا تھا اور مقامی کمانڈر نے ان کے ساتھ ملاقات کر کے ان انتظامات پر ان سے تبادلہ خیال بھی کیا تھا۔ ان پر فوجی حلقوں کی اطلاع کے مطابق جنرل ویدیہ کیلئے دن میں ایک مسلح محافظ اور رات کے لئے دو محافظوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن جب وقت موعود آیا تو کسی محافظ کی ایک نہ چلیان پر حملہ کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ حملہ کے وقت جنرل ویدیہ خود کار چلا رہے تھے، اور انکی بیوی ان کے برابر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھیں، اور محافظ کچھلی سیٹ پر بٹھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گولی لگنے کے بعد جنرل ویدیہ کے ماتھے اسٹیرنگ پر کمزور پڑے اور ان کی

ماروتی کار بے قانو ہو کر ڈنگ گاتی ہوئی سڑک کے دوسری طرف چلی گئی اور اس اچانک اور غیر متوقع صورت حال سے محافظ کو نہ صرف فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکا بلکہ حملہ آوروں کو بھی فرار ہونے کا پورا موقع مل گیا۔

جنرل ویدیہ کی ہلاکت کے اس واقعہ نے جو کئی لحاظ سے غیر معمولی تھا ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ کو بھی بڑا صدمہ پہونچا یا ہے کیونکہ اس واقعہ کی بدولت انتظامیہ اور خفیہ پولیس کے ساتھ فوج کے ناقص انتظام کا بھی ثبوت پہلی بار دنیا کے سامنے آیا جنرل ڈی گاندھی جی اور سابق وزیراعظم اندرا گاندھی کے بعد ہندوستان کی تیسری ممتاز ترین شخصیت ہیں۔ جو تشدد اور دہشت انگیزی کی بھینٹ چڑھ گئی، اور اندرا گاندھی کے بعد دوسری بڑی شخصیت ہیں جو بظاہر پنجاب کے اندر پیدا ہونے والے اس تشدد یا دیگر ماحول کے سبب اپنی قیمتی زندگی سے محروم ہو گئی، جو جون ۱۹۸۴ء کے سنہری گرداز پر فوجی کارروائی کے بعد پیدا ہوا تھا، اور جس کے ختم کرنے کی کوئی کوشش بھی تک کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جنرل ویدیہ کے قتل کے اثرات بھی غیر معمولی انداز میں مرتب ہوئے۔ مثال کے طور پر آزادی کے بعد پہلی بار، پارلیمنٹ کا اجلاس کسی ایسی شخصیت کی تعزیت کے بعد ملتوی ہوا جو کسی ایوان کی ممبر نہیں تھی۔

ان کی ہلاکت کے واقعہ سے دہشت پسندوں کی عام گرنزاری کی مہم کے ذریعہ دہشت پسندوں کی اٹھائی ہوئی شورش سے خاتمہ کی توقع کو بھی نہ صرف صدمہ پہونچا ہے بلکہ اس کے پنجاب سے باہر دوسری ریاستوں تک وسیع ہو جانے کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود اس تشویش ناک صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دہشت پسندی اور تشدد کا خاتمہ صرف انتظامی کارروائیوں کے ذریعہ ممکن نہیں ہے پنجاب کے

ڈائریکٹر جنرل پولیس مسٹر سیر پونے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انتظامی سطح پر جو کچھ بھی ممکن ہے وہ تو ہم کر رہے ہیں لیکن اس سلسلے میں سیاست دانوں کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔ پھر تیسرا اور آخری نتیجہ جو اس قیمتی زندگی کے ضائع ہونے کی صورت میں نکلا ہے وہ یہ ہے کہ سیاست دانوں کے غلط اقدامات قوموں اور ملکوں کو ایسی بھرائی صورت میں مبتلا کرتے ہیں کہ ان پر قابو پانے میں برسوں اور قرونوں کی مدت لگ جاتی ہے اور یہ کہ کوئی قوم مکمل مایوسی کی حالت میں عاقبت اندیشی کے ہر تقاضے کو نظر انداز کرتے پر تیار ہو جائے تو پھر کوئی بڑی سے بڑی تادیب اور رد عمل کا خوف بھی اسے من مانے کام کرنے سے نہیں روک سکتا۔

مسلم پرسنل لار

اور حضرت مفکر ملت کی یاد

_____ از جناب محمد اظہر صدیقی اینڈ و عرب پریس فیمرس۔

اس میں خاک کی گنجائش نہیں ہے کہ اس بل کی منظوری سے فرقہ پرستوں، تنگ نظر سیاسی طامع آزمادوں اور مسلمانوں سے لٹھی پیر رکھنے والوں نیز ہندوستان کی جمہوریت قدر طلب، سیکولرزم کی عظمتوں اور ان اعلیٰ اقدار و روایات کے دشمنوں کو زبردست، ذلت منگ اور عبرتناک شکست ہوئی ہے۔ جو ہمارے ملک کی شان کو ساری دنیا میں سرخند کرتے چالی ہیں۔

ہم پورے خلوص کے ساتھ وزیراعظم راجیو گاندھی ان کے رفیق کار شری اشوک (وزیر قانون حکومت ہند) اور ان تمام حضرات کی خدمت میں ہدیہ تشکر و بریک پیش کرتے ہیں جن کے منصفانہ اور عدل پرور ذہن و فکر اس بل کی منظوری میں کاہلی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح ہندوستانی مسلمان، نوجوان سماجی مدینی کارکن اور مسلم جماعتوں کے ذمہ دار بھی قابل مبارکباد ہیں جن کے دل کی دھڑکنیں اک طرف ان کو اپنے اتحاد کا پر جوش مگر برہوش مظاہرہ کرنے اور دوسری طرف بارگاہ رب قدیر و کار ساز میں دست دعا باندھ کر سنبھلے ہوئے تھیں اور جن کے طرز عمل نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے چلے دیں و مذہب کی تعلیمات کے پورا پورا نمونہ معلوم ہوتے ہوں مگر ان کے دل و دماغ روح اور فکر و شعور اور جذبات اسلامی پوری طرح زندہ و تابندہ ہیں اور دین و شریعت کی حفاظت کے لئے وہ ہر قربانی دینے کیلئے تیار ہیں۔

ہم مسلمانوں کو یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ ایک مخصوص طبقہ نے ملک میں

ایک نئی پیدا کردی تھی جس میں حکومت ہند کے لئے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو سامنے رکھ کر کوئی بل منظور کرانا اور کوئی اٹل فیصلہ کرنا بچوں کا کھیل یا معمولی کام نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ یہ ایک طرح سے ایک خوفناک بلا خیز پرشور ملامت خیز موجوں کا سینہ چھو کر اس کشتی کو ساحل تک پہنچانا تھا جس سے ملک کا وقار بھی وابستہ تھا اور مسلمانوں کے غریبی جذبات کی توجہ پوری کائنات ہی جس میں مسمٹ آئی تھی حقیقت یہ ہے کہ اس ایک واقعے نے بہت سی مہلک و مایوس کن غلط فہمیاں کے تانے بانے بکھر کے رکھ دیے ہیں۔ اور ملک کی جمہوری و سیکولر قدروں کا چہرہ بکھر گیا ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم کو یہ بات بھی پوری طرح یاد رکھنی ضروری ہے کہ اس کامیابی میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ حقیقت بھی شامل ہے کہ مسلم رہنماؤں یا مخصوص مفکر ملت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی Nadwi مدظلہ العالی (مددِ سال انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے جہاں ایک طرف مادی کوششوں، تاہری دھڑ دھوپ، بھاگ دوڑیں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ملک میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک مسلمانوں میں بیداری کی ایک ایسی ہیرہ دوڑادی جسکی مثال گذشتہ ساڑیس سال میں ملنی مشکل ہے وہیں یہ حقیقت ہے اور شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے کہ حضرت علی میاں دامت بکاتہم نے اس سلسلہ میں دعاؤں کا بھی ایسا خاص اہتمام فرمایا جو اللہ کے مخصوص بندوں اور مایکرا کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ یہ فردِ حاضر میں ذکر و شغل کے حلقوں اور دعاؤں کی مجلسوں کے انجمن خاص میں کسی قسم کی ادنیٰ سی کوتاہی نہ آنے دینا اور خود اپنے طور پر ایک بزرگ ہرنیک بندے اور مخلص فردِ ملت سے دعاؤں کی خاص درخواست کرنا ایک مبارک و مسعود اور قابل تقلید معاملہ ہے اور حق یہ ہے کہ کامیابی کے لئے یہ بھی ہے لازمی اور ضروری —

اس طرح مسلمانوں نے بھی جگہ جگہ دعاؤں کا خاص اہتمام کیا۔ اساجد میں نمازوں کے بعد اور بعض جگہ مخصوص طور پر آیت کریمہ کے ختم پڑھ کر دعا کیے مانگیں۔ حدیثِ نسبت

کے طور پر یہ عرض کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ اکابر و بزرگوں کی برکت سے اس سلسلہ کار
ماتم الحروف کو بھی حق تعالیٰ نے دیوبند کی کئی ایک ساجد میں ختم آیت کو یکسر کرانے اور ختم
خواجگان کی پابندی کرنے کی توفیق اپنے کرم خاص سے عطا فرمائی جو لوگوں نے اس پر وگرا
میں شرکت کی اور دوسوڑی کے ساتھ حق تعالیٰ ان کو بھی اجر عظیم عطا فرما سے
آمین ۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ ہماری ملی قیادت
کے آسمان پر اس آفتاب درخشاں کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے گھٹا ٹوپ اندھیانہ
میں روشنی اور اجالا نظر آتا تھا،

ان کی فکر و بصیرت کے سامنے اکثر و بیشتر رہنماؤں کی بصیرت مانند پرچھائی
تھی، مگر ان کے اخلاق کریمانہ، وسعت ظرف اور ان کے قلب و ذہن کی کشادگی بھی
کسی کو یہ محسوس ہی نہ ہونے دیتی تھی کہ حضرت مفتی صاحب کی نظریں ان کا مقام و مرتبہ
کسی طرح فرو تو ہے یہ وہ خصوصیت تھی کہ جس نے ملت کی صفوں میں پھیلے ہوئے
انتشار و افتراق کو ختم کر کے تمام مسلم جماعتوں اور ان کے ذمہ داروں کے درمیان باہمی
یگانگت و اخوت اور ایک دوسرے کی پاسداری و برداشت کا وہ جوہر تاباں پیدا کر دیا
کوشش کی جس نے اخلاق، اشتقاق کی ظلمتوں کو آپس کی رعاداری و مروت کی روشنی میں
بل دیا، اور ملت اسلامیہ کا ایک متحدہ و مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں آگیا، جو برابر آندھیلوں
اور طوفانوں کے مقابلہ پر قائم رہا۔

آج جبکہ ملت اسلامیہ ہند کو اللہ رب العالمین نے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار فرمایا
ہے تو بجا طور پر ملت کا ہر ذی خواہ مسرور و شادان ہے مگر یہ حقیقت ناقابل انکار
ہے کہ حضرت مفکر ملت نے اتفاق و اتحاد کی جو اسپرٹ پیدا کی اور اس کے لئے جو محنت
اور مخلصانہ جدوجہد فرمائی وہ ہماری ملی تاریخ کا ایسا جلی عنوان ہے جو ماضی کی روشنی

سے حال کو سنوارنے اور مستقبل کو تباہناک بنانے کا ایسا ذریعہ بھی ہے جسکی بنیاد حضرت مفکر ملت جیسے سرتاپا اخلاص والی رہنما اور اسلامی مفکر اور درد مند صاحب بصیرت بزرگ کے خونِ دل و جگر پر قائم ہے۔

آج فتح و کامرانی کے ہنگامہ مستشرقین کی گونج میں حضرت مفکر ملت قدس سرہ کی عظیم الشان پر خلوص تاریخ ساز خدمات کے نقوش نمایاں ذہن و فکر انور پر جگمگ کر رہے ہیں۔ حضرت مفکر ملت مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی قدس سرہ کو ہم سے رخصت ہوتے دو سال ہو چکے ہیں۔ ۱۳ مئی ۱۹۸۴ء کو علم و شریعت اخلاق و شرافت فکر و بصیرت دانش مندی و بصیرت تدبیر و تفکر کا ایک آفتاب صوفیاں ملک و ملت کی قیادت کے آسمان کا ماہتاب درخشاں غروب ہو گیا تھا جسکی پر نور کرنوں سے گزشتہ سال ملک ملت اسلامیہ ہند کی بے لوث خدمات کی دنیا جگمگاتی رہی اور جسکی مخلصانہ رہنمائی، علم و حکمت، دین و شریعت تصنیف و تالیف اور اسلام کی ترویج و اشاعت کی کھیتوں کو سیراب کرتی رہی اور ہر قدم پر ملت کی صفوں میں اتحاد و اتفاق تھا قائم کرتی رہی۔

بلاشبہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ ملت اسلامیہ ہند کے لڑتے بھڑتے آپس میں الجھنے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے فرقوں اور باہمی چیلنشل اور اختلافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی جماعتوں کو اتحاد و اتفاق کی ایک لڑی میں پرے کے لئے مسلسل لگاتار اور انتھک جدوجہد کی مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی کشتی کو ساحل مرادیک پہونچایا۔

قدرتی طور پر اس موقع پر حضرت مفکر ملت اور دوسرے مدد مند اکابر امت کی یاد دل کے دروازے بند تنگ دیتی سنائی دیتی ہے جنہوں نے مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں سب سے پہلے دو ٹوک، بے لاگ اور دانشمندانہ انداز میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ

مسلمانوں کے پرسنل لائیں کسی قسم کی تبدیلی ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی۔
 اب سے چند رہ سو سال پہلے مفکرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی قدس سرہ
 سے ہندوستان ٹائمز کے ایک نمائندہ نے مختلف ملی مسائل پر ایک انٹرویو لیا تھا اس
 انٹرویو کے دوران پہلی مرتبہ یہ سوال سامنے آیا تھا کہ بومہرہ برادری کے مذہبی معاملات و
 رسوم کے سلسلہ میں حکومت — تارکنڈے کمیشن — قائم کر رہی ہے۔
 جو اس طبقہ کے مذہبی معاملات پر تحقیق و تفتیش کر کے کوئی رائے دے گا، اور
 فیصلہ کرے گا،

حضرت مفتی صاحب سے انٹرویو لینے والے اس نمائندہ نے سوال کیا کہ اس کمیشن
 کے سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے برجستہ اور صاف و بے لاگ
 الفاظ میں فرمایا کہ مسلک و مشرب کا اختلاف چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مگر یہ بات
 کسی صورت پسند و برداشت نہیں کی جائے گی کہ مسلم پرسنل لائیں کسی بھی طریقہ اور
 کسی بھی عنوان سے مداخلت کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جائے، بعض لوگ
 اس وقت اس مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر رہے لیکن جلد ہی ان کو اندازہ ہو گیا
 کہ حضرت مفتی صاحب کی فہم و فراست و دراندیشی اور اصابت رائے نے کتنی گہرائی سے مسئلہ
 کی اہمیت و نزاکت کو بھانپ لیا تھا، اور اس پر سخت احتجاج کیا تھا،

اسی طرح جنوری ۱۹۷۲ء میں حضرت مفتی صاحب نے آل انڈیا ریڈیو پر مسلم پرسنل
 کے موضوع سے دو تقریریں فرمائیں جن میں اس اہم مسئلہ کی تمام تفصیلات کو نہایت
 دانشمندانہ طریقہ پر — ایک پختہ کار صاحب طرز اور فن خطابت کے ماہر کی حیثیت
 سے چند سطروں میں سمیٹ کر بیان کرتے ہوئے صاف صاف اعلان فرمایا تھا کہ مسلم
 پرسنل لائیں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

ملت کے سوادِ اعظم اور علمائے کلام کے بڑے طبقہ، جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے

دانش اور عوام کی رائے اور پختہ عقیدہ و خیال کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسلم پرسنل شریعت اسلامی کا اہم جزرہ بلکہ اس کی روح ہے اور وہ ائمہ اور اسکے رسول کے احکام پر مبنی ہے یہ احکام قطعی ہیں اور رسیل و نہار کی کوئی گردش اور کسی انقلاب کی جو کچھ کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم نہیں ہو سکتی ایسا اقدام کیا جائیگا تو وہ دین و مذہب میں مداخلت بیجا کے ہم معنی ہو گا۔

پھر فرماتے ہیں کہ۔۔۔ صاف بات یہ ہے کہ جہاں تک مسلم پرسنل لا کے تعلق کا تعلق ہے اس میں کوئی ایسی راہ (تبدیلی کی) تلاش کرنا ایک جستجوئے ناکام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا کی وسعتوں کو اس سمندر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کا کنارہ نظر نہ آتا ہو، اس بحرناپید کنارے سے چند قطروں یعنی چند گنے چنے مسائل کو لیکر پرسنل لا میں تبدیلی یا ترمیم کا عنوان دینا مضحکہ خیز تو ہو سکتا ہے حقیقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔

ان چند جملوں میں مسئلہ کی جو روح سمیٹ آئی ہے اور تاریخی نے جس طرح ان جملوں کی صداقت کی گواہی دی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

اسی طرح مارچ ۱۹۸۰ء میں ہی یہ حضرت مفتی صاحب کا ہی دم، خم فکر و تدبیر اور بندہ برتھا جس نے دارالعلوم دیوبند

ایک نمائندہ اجتماع مسلم قائدین، علماء و دانشوروں باہرین قانون کا منعقد ہوا خوب یاد ہے کہ اس اجتماع میں حضرت مفتی صاحب نے علمائے کرام کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے یاد دلایا تھا کہ مسلم پرسنل لا میں حکومت کی طرف سے کسی ترمیم کو تو ہم برداشت نہ کریں گے لیکن مسلم معاشرہ میں جہل و نادانیت کی بنا پر جو مسائل پیش آئے گئے ہیں ان کی اصلاح بھی تو صرف ہمارے ہی ذمہ داری ہے۔

وہی اجتماع۔۔۔ تاریخ ساز عہد آفریں اور مسلمانان ہند کی پوری حیات ملی کی

نشانیہ ثابت ہوا تھا۔ کہ اس کے اندر ان ہی بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں مسلم پرنسپل لار کے مسئلہ پر مسلمانوں کے مختلف مسلکوں اور نقاط نظر رکھنے والے لوگوں، جماعتوں کے ذمہ داروں، دینی و علمی اداروں، مفکروں، ماہرین قانون اور دیگر لوگوں اہل فکر اصحاب کا ایک ایسا نمائندہ عظیم کنونشن بھی میں منعقد کیا جائے جس میں سب ہی مسلم طبقوں اور جماعتوں کو دعوت دی جائے،

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے یہ اجتماع بمبئی میں منعقد ہوا، حضرت مفتی صاحب اور حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ، مولانا سید منت احمد رحمانی منظر نے اپنی سوجھ بوجھ وسعت فکر و قلب ہشامہ روز محنت اور ناقابل فراموش جذبات اخلاص کے ساتھ اس کنونشن کو کامیاب اور مؤثر ترین بنایا۔ اس کو مسلمانوں کا ایک ایسا مضبوط پائیدار اور مستحکم اتحاد کی حیثیت دینے میں اپنا خون دل و جگر صرف کر دیا اور پوری ملت کو جسد واحد کی شکل میں پیش کر کے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا جس کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی،

اس زمانہ میں اس کنونشن پر ایک معروف اخباری نمائندہ نے یہ تاریخی تبصرہ کیا تھا۔ کہ انجمن دنوں کی (جب یہ کنونشن بمبئی میں منعقد ہو رہا ہے۔) خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کا ہر سرکردہ مسلمان ان دنوں میں بمبئی میں موجود ہے۔ ہر حال چوپاٹی کے میدان میں چاکس لاکھ ان دنوں کا جم غفیر یہ معلوم کرنے کیلئے بھیجیں تھا کہ اس کے اکابر اور رہنما کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس تاریخ ساز موقع پر حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے اس اجتماع میں جو تقریر کی وہ بھی تاریخ کا ایک شاہکار سمجھی گئی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا تھا کہ:

در یہ لاکھوں مسلمانوں کا ٹھٹھیں ماتا ہوا سمندر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ مسلمان دین و شریعت اور مسلم پرنسپل لار میں کسی قسم کی تبدیلی کو

ہرگز ہرگز برداشت نہ کرے گا، حکومت کے ذمہ دار یہاں آئیں اور آکر دیکھیں

کہ اس عظیم وبے مثال اجتماع کے دل کی دھڑکنیں کیا کہہ رہی ہیں۔

جہاں تک ہمارے پریس — نام نہاد قومی پریس کا تعلق ہے تو وہ کل

صبح آپ دیکھیں گے کہ اس کی کوئی خبر نہیں آئے گی۔ بلکہ اس اجتماع سے الگ ایک

بند کمرے میں جو چند آدمی۔ چند نام نہاد مسلمان۔ حمید دلوئی کی لٹری جو تنگ کر رہی

ہے اس کی خبر شائع ہوگی۔

حضرت مفتی صاحب نے پورے جوش ایمانی کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ حالات یہاں

کچھ ہوں اور یہیں چاہے کتنی ہی قربانیاں دیں پریس لیکن کسی طرح کی کورا تبدیل دین ضرورت

میں برداشت نہیں کی جائیگی۔

اس موقع پر کی گئی تقریر میں حضرت مفتی صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہ کس طرح

حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ اسی طرح قومی پریس کا وہ رویہ جس کی طرف حضرت مفتی صاحب

نے ایک پیش گوئی کے طور پر اشارہ کر دیا تھا آج اس کا کرار اسی پرسنل لا کے بارے

میں جیسا کچھ رہا ہے وہ اس ملک کی جمہوریت، نیک ناسی اور سیکولرزم کے دامن پر ایک

سیاہ بد نما اور رسوا کن داغ ہے،

اس تاریخ ساز اجتماع میں حضرت مفتی صاحب نے اپنے دیگر منتقلے گرامی سے

ملکر اتحاد ملی کا جو ایک عظیم الشان مرکز قائم کرایا تھا اتحاد کی جو اسپرٹ قائم کر دی تھی اور

زندگی کے آخری سانس تک وہ جس طرح مسلمانوں میں مسلم جماعتوں میں جس طرح اتحاد

فکر و عمل کا جذبہ پیدا کر نیکی کو شش کرتے رہے حتیٰ یہ کہ ان کے انتقال کے دو سال

بعد — مسلمانوں نے جس ملی اتحاد کا ثبوت دیا اور اس مسلم پرسنل لائیڈ نے جس

طرح دانش، مندی، بصیرت اور جوش مندی کے ساتھ پرسنل لا کی مہم کو کامیابی کی منزل

ملک پہونچا یا اس سے یقیناً حضرت مفکر ملت اور حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسے بزرگوں کی روحیں جنت میں خوشی سے پھولے نہ سمار ہی ہوں گی۔

اپنے اسلاف و اکابر کی یاد اور ان کے نقوش قدم اور ان کے افکار و تجربات کی تجلیوں اور ضیاء باریوں سے اپنے فکر و شعور اور اعمال و کردار کو منور کرنا اور سینوں کو ان سے معمور کرنا اگر کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نگراں ناقابل انکار سچائی سے بخوبی واقف ہیں کہ جو قوم اپنے بزرگوں، اسلاف کرام اور قومی ہیروؤں کو انکی عظیم شان خدمات کو بھلا دینے کا جرم عظیم کرتی ہے وہ اس دنیا میں عزت و سرخروئی اور عظمت و برتری کے ساتھ زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دی جاتی ہے، تو ہم آپ پوری دسوزی و درد مندی کے ساتھ گزارش کریں گے کہ حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہم اللہ کے لئے ایصالِ ثواب کا خصوصی اہتمام فرمائیں۔ اور ان کے چھوڑے ہوئے مشن اور تحریکوں کو بڑی سے بڑی قربانی دیکر زندہ و تابندہ رکھنے کی کوشش فرمائیں۔

امید کہ یہ گزارش صد البھر اثبات نہ ہوگی۔

مولانا اکبر آبادی مرحوم

(اور برہان)

مسودہ النیر شلوی کا کوری

بعض چیزیں اللہ تعالیٰ نے لازم و ملزوم پیدا کی ہیں۔ برہان کا نام آتا تھا تو ساتھ ہی مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کا تصور ابھرتا تھا گویا وہ اور ماہنامہ برہان ایک جزو لا ینفک تھے۔ یہ مانگتا تھا کہ وہ برہان سے اور برہان ان سے الگ ہی نہیں ہو سکتے۔

برہان کا سب سے پہلا پرچہ جولائی ۱۹۳۸ء / جمادی الاول ۱۳۵۷ھ میں ^{لبنفین} ندوۃ اہل دہلی سے جس کی تشکیل ۷ اعیان ثلاثہ کے ہاتھوں ہوئی جاری ہوا۔ اعیان ثلاثہ میں پہلا نام مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، دوسرا نام مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور تیسرا نام مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہم اللہ کا تھا۔

ماہنامہ برہان نے جولائی ۱۹۳۸ء سے آج تک جس قدر تاریخ، تہذیبی اور علمی و ادبی موضوعات پر متنوع مضامین شائع کیے وہ آپ اپنی نظیر ہیں، مولانا اکبر آبادی مرحوم کو برہان سے جیسا کچھ ربط و ضبط بلکہ قلبی لگاؤ اور عشق تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم باوجود اپنی گونا گوں مصروفیتوں، شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی کی صدارت، علمی اسفار، مدرسہ عالیہ کلکتہ کی انتظامی ذمہ داریاں اور دوسرے دنیاوی امور میں انہماک کے، برہان کے لئے مگر ہر قدر مقالات اور نظرات لکھتے رہے۔ سوائے ۵ فروری ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک کے رسائی کی ادارت و نظرات نویسی مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی۔ یہ ہاتھوں ہوتی رہی، اس کے علاوہ بھی دو ایک شمارہ

کی ادارت بعض اہم مجبوریوں اور بیرون ملک قیام کے باعث نہ کر سکے، مجھے خوب یاد ہے کہ علی گڑھ کے دوران قیام اکثر و بیشتر دماغی الجھنیں، پریشانیاں اور بیماریاں حائل ہونے کے باوجود برہان کے نظریات اور اسکی ادارت کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے۔

مولانا نے برہان کے ذریعہ ملک و ملت کی جس طرح بے لوث خدمت کی وہ ناقابل انکار ہے۔ یہ ان کا گراں مایہ احسان ہے کہ انھوں نے وقت کی نبض پہچان کر سیاسی معاشی، اقتصادی، اسلامی، ملکی و ملی مسائل، فرقہ پرستی، اقلیت، مسلمانوں میں ملی شعور کے فقدان، مسئلہ تعلیم، وقتی امور اور مستقل معاملات پر بڑے دلنشیں اور سلجھے ہوئے انداز میں قلم اٹھایا۔ نہ صرف نظریات بلکہ شعور علمیہ اور نقد و تبصرہ کے عنوانات سے بھی اپنی علمی بصیرت اور وسعت معلومات کے بے شمار نمونے پیش کیے۔ تاریخی تحقیقوں کو سلجھایا، سیاسی ادبی و لسانی مسائل پر خود بحث و تمحیص کی اور دوسروں کو دعوت دی، اکثر یہ ہوا کہ نظریات میں کچھ نکھا اور بعد میں حقائق اس سے مختلف نکلے تو بڑی فراخ دلی سے اپنے سابقہ خیالات کی تردید کی اور رجوع کیا یہ معمولی چیز نہیں بلکہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ انھوں نے تنہا ہی برہان کی تن من دھن سے خدمت نہ کی، بلکہ دوسروں خصوصاً نوآگوز اور مبتدیوں کو بھی دعوت دی۔ ان کی ہمت افزائی کی بلکہ بعض اوقات انھیں نگلی پکڑ کر چلایا اور ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔

مولانا نے اپنے سیکڑوں لٹنے والوں، جاننے والوں، ارباب حل و عقد، سیاست

مولانا مرحوم کے حالات زندگی اور علمی کارناموں سے متعلق راقم الحقر کا مقالہ۔

مولانا اکبر آبادی مرحوم۔ من مگر شمع چورقم، بزم برہم سا ختم

النشراشد کسی قریبی شمار میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

علماء مشاہیر کی وفات پر جس طرح اپنے رشتہات قلم سے اپنے قلبی واردات جذبات و احساسات کا اظہار کیا وہ بھی آپ اپنی نظیر ہے۔ بعض مقامات پر تو ان کے قلم کی جولانی ذہن رسا کی جدت طرازی، اسلوب کی ندرت بیانی قابلِ مہد تحسین ہے۔

برہان کا پہلا شمارہ بہتر صفحات پر مشتمل تھا صرف ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۲ء کے شماروں کی ضخامت گھٹ کر بائیس صفحات ہو گئی تھی، ورنہ نمونہ اچھوٹا اور بہتر صفحات ہی رہے۔ قارئین برہان بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے اخیر وقت تک برہان کے معیار کو حتیٰ الوسع گرنے نہ دیا۔

قلم احقر نے اس مقالہ میں اس بات کی ادنیٰ کوشش کی ہے کہ برہان میں شائع شدہ ان کی تحریروں، خواہ وہ اہم مسائل پر نظرات ہوں یا مقالات سبھی کی حتیٰ الوسع ایک فہرست مرتب ہو جائے یہ اذعان تو نہیں ہے کہ رطب و یابس سبھی جمع ہو گئے ہیں مگر سوا چند شماروں کے جو دستیاب نہ ہو سکے تقریباً تمام تحریروں کی فہرست پیش ہے۔ وفيات بھی سوا ایک دو کے سبھی ان ہی کے قلم کی ہیں۔ بعض نظرات اپنی دانست میں کچھ زیادہ اہم نہ ہونے کی بنا پر نظر انداز کر دیے ہیں۔ نقد و تبصرہ کے نمونہ معروف و ہی عنوانات سے ہیں جن پر مستقل مقالہ ہے۔

۱: مسلمانوں کے تعلقات غیر قوموں کے ساتھ — برہان کا پہلا مضمون ۱/۲، ۲، ۳ اگست ستمبر ۱۹۸۲ء قرون اولیٰ میں۔

۱/۳، ۲، ۱/۲، ۵، ۶

۲: فہم قرآن (ان نظرات

۲/۲

۳: عدم تشدد یا صبر (۱۵)

۲/۱

۴: طردھا اسکیم اور دہیا مندر سکیم

۶/۴

۵: عربی زبان کی ترویج و اشاعت

۶/۱/۸

۶: اسباب عروج و زوال اُمت

- ۷: حضرت عبداللہ بن مبارک ۴/۴
- ۸: ابو محفوظ معروف بن فیروز الکرخی ۴/۴
- ۹: قبة الصخرہ، پہلی صدی ہجری کی سب سے زیادہ خوبصورت عمارت ۵/۲
- ۱۰: لاہور میں اسلامی جماعت کی تشکیل، حکومت الہی کے قیام کے لئے۔ ۱/۸
- ۱۱: نظرات ۸/۸ کے جواب میں مولانا منٹو نے سمانی نے جو کچھ لکھا اس کا جواب — ۲/۸
- ۱۲: نیاز فقہوری کے دس سوالات کے جوابات (ن) ۴/۵
- ۱۳: وحی الہی ۵/۵، ۶/۶، ۱/۱-۵
- ۱۴: پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی رجحانات ۳/۹-۴
- ۱۵: ہندوستان میں تصنیفی مشکلیں اور ان کا حل۔ ۱/۱۲
- ۱۶: علمائے کرام سے خطاب ۴/۲-۶
- ۱۷: فرقہ فسادات ۱۸/۱۸-۱
- ۱۸: موجودہ فضائات اور اسلام ۶/۱۸
- ۱۹: مدارس عربیہ کے لئے ایک نیا فکر ۲/۲۲، ۲۳/۲۳
- ۲۰: عربی مدارس، نصاب تعلیم ۴/۱۸-۲۲
- ۲۱: علی گڑھ، دیوبند، ندوہ، جامعہ (ن) ۱/۵۲
- ۲۲: آچاریہ کرلیانی کا بیان اور ہندو مسلمان (ن) ۵/۲۰
- ۲۳: تقسیم مسلمانوں کی پچھلی سیاست اور جمعیۃ العلماء (ن) ۴/۲۰
- ۲۴: زبان، ہندو مسلم کلچر، ہندوستان۔ ۱/۲۳
- ۲۵: دھلی کی تباہی۔ ۲-۱/۲۰
- ۲۶: ہندوستان اور اسلام — ۶/۲۳

- ۲۷: خاک و تحریک پر ایک نظر (ن)
- ۲۸: علمائے ہند کا سیاسی موقف
- ۲۹: ایک کلچر، ایک زبان کا نغمہ (ن)
- ۳۰: ۱۹۷۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان (ن)
- ۳۱: فرقہ پرستی اور اقلیت
- ۳۲: علی گڑھ
- ۳۳: علمائے حق
- ۳۴: مٹن ٹرن جی کانگریس کے صدر
- ۳۵: ہمارا مسئلہ تعلیم
- ۳۶: مدرسہ عالیہ کلکتہ کی تاریخ
- ۳۷: ریجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ (ن)
- ۳۸: بچوں کی تعلیم و تربیت
- ۳۹: اردو کا مسئلہ (ن)
- ۴۰: ہندی اردو، انجن ترقی اردو
- ۴۱: اردو کہاں بولی جاتی ہے؟
- ۴۲: مذہب کی توہین کرنے والی کتابیں (ن)
- ۴۳: جامع امجد دین، عبد الباقی ندوی پرتیبرہ
- ۴۴: مکاتیب شیخ الاسلام، حسین احمد مدنی (اول)
- ۴۵: مختصر سیرت قرآنہ سیدنا محمدؐ پرتیبرہ
- ۴۶: ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل تمبرہ
- ۴۷: مجذوب سندھی کی چند الہامی باتیں۔
- ۴/۵
- ۵-۲/۲۱
- ۳/۲۱
- ۱/۲۱
- ۵/۲۱
- ۲۰/۲۷
- ۳/۲
- ۳/۲۵
- ۶-۵/۳۱
- ۲/۳۰
- ۳/۲۸
- ۴/۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱
- ۱/۲۸
- ۶/۲۷
- ۳/۳۶
- ۴/۲۸
- ۶-۱/۲۸
- ۵/۲۹
- ۶-۱/۳۱، ۶/۳۰
- ۵/۲۶
- ۴/۲۴

۴/۱۳ - ۴/۱۴ - ۴/۱۵

۴۸: مولانا عبید اللہ سندھی - ایک تبصرہ پر تبصرہ

۲/۵

۴۹: نگار فتنہ جو (ن)

۲۰۱/۱۴

۵۰: حالی اور سپروی مغربی

۲/۲۵

۵۱: ہندی ادب کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ (تلخیص)

۵۲: ابوالکلام آزاد اور صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن شرفانی ۲/۲۵

کے تعلقات -

۲/۳۰

۵۳: اقبال کی کہانی، مؤلف ظہیر الدین جامعی پر تبصرہ

۵۴: رسالہ طلوع اسلام اور پرویز صاحب پر اعتراضات (ن) ۱/۹

۳/۲۴

۵۵: مولانا مودودی کے فتویٰ کا جائزہ (ن)

۴/۲۵

۵۶: گائے کی قربانی (ن)

۶/۲۵

۵۷: مسئلہ قربانی اور مسلمان (ن)

۲-۲/۳۸

۵۸: جدید سائنس قدیم ظرف کے نسبت اسلام سے زیادہ

قریب ہے۔ (ن)

۲/۲۵

۵۹: ہندوستان اور پاکستان (ن)

۲/۲۴

۶۰: ہم کیا ہیں؟ (ن)

۵/۲۵

۶۱: مسلمان اور پاکستان -

۶/۲۴

۶۲: ٹنڈن جی ہندو کلچر مسلمان اور بھارت (ن)

۲/۲۳

۶۳: مسلمان پر عذاب، ہندو سکھ لوٹ -

۶۴: پاکستانی گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت اور اس میں غیر مسلم ۵/۲۴

کا درجہ و مقام -

۶۵: جمعۃ اعلیٰ کے سالانہ اجلاس حیدرآباد کے موقع پر جمعیت کو

مشورے (ن)

۶۶: جمعیت کے اجلاس کے بعد ۵/۲۶

۶۷: جمعیت کے طریق کار پر تنقید مسلمانوں کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ ۴/۲۷

۶۸: دہلی کی تباہی - ۲-۱/۲۰

۶۹: پیہم مجھ کو پاسے منہم ہر دم وداع مومن خدا کو بھول گئے افسر آئیں (ن) ۵/۲۴

۷۰: بیمار ہنگال کے مسلمانوں میں ہندو دشمنی کی رسوم (ن) ۱/۳۱

۷۱: مسلمانوں میں ملی شعور کا فقدان (ن) ۶/۲۶

۷۲: اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اعلان - مارچ ۱۹۷۹ء (ن) ۴/۳۶

۷۳: جمعیت العلماء ہند کے زیر قیادت کمیٹی میں دینی تعلیمی کنونشن (ن) ۲/۳۴

۷۴: اسلامی جماعت ہند میں تیزی سے پھیل رہی ہے اس کا سبب (ن) ۵/۳۸

۷۵: علی گڑھ (ن) ۶/۳۷

۷۶: ہندوستان کے فسادات (ن) ۵/۴۲

۷۷: مسلمان کیا کریں؟ (ن) ۳/۴۳

۷۸: مسلمانان ہند ۱/۴۴

۷۹: دیوبند (ن) ۱/۴۵

۸۰: ایک انگریزی روزنامے کی ملی فسطوح (ن) ۲/۴۳

۸۱: اقبال کا ایک شعر اور اس کا مفہوم ۵/۴۱

۸۲: اردو حیت رہی ہے (ن) ۳/۴۱

۸۳: اردو پر مولانا حفیظ الرحمن کی تقریر، پارلیمنٹ چرائی ۴/۴۳

۸۴: اردو ہندوستان میں ۳/۴۳

۸۵: پرنسپل مسیحہ عالیہ کلکتہ سے متعلق اپنی تقریر (ن) ۲/۴۲

۸۶: مالک بن نویرؒ اور فائد بن الولیدؒ ۱/۴۷

- ۸۷۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ۲/۳۶
- ۸۸۔ حیدر آباد کے اعیان تقسیم کے بعد ۳/۴۱
- ۸۹۔ منی بیگم، ایسٹ انڈیا کمپنی کی محض خاص ۴/۱۶
- ۹۰۔ ترکی کا اسلامی انقلاب ۳/۲۶
- ۹۱۔ خلافت معاویہ و یزید ایک جائزہ۔ ۵/۴۳
- ۹۲۔ مسئلہ تعدد ازواج ۴/۲۵
- ۹۳۔ مشرقی و مغربی بنگال کے فسادات، حضرت بل کے نتیجے میں (ن) ۲-۲/۵۲
- ۹۴۔ فسادات اور مسلمان (ن) ۵/۵۲
- ۹۵۔ نئی شاستری حکومت کے سامنے ہندوستان کے مسئلے (ن) ۱/۵۲
- ۹۶۔ مسلمانوں میں صحیح لیڈر شپ ایک سرسید کی ضرورت (ن) ۲/۵۲
- ۹۷۔ لکھنؤ کامٹا اور تہی اجتماع اور ہماری تجاویز اس کے لئے۔ ۳/۵۲
- ۹۸۔ ہندو پاک جنگ (ن) ۴/۵۵
- ۹۹۔ جنوبی ہند میں ہندی دشمن طوفان (ن) ۲/۵۲
- ۱۰۰۔ پاکستان کی اسلامی ریاست اور سیکولرزم کا تصور ۱/۴۹
- ۱۰۱۔ سپر باؤس کا مسلم کنونشن ۱/۴۸
- ۱۰۲۔ ہندوستان کے مسلمان ۲/۴۷
- ۱۰۳۔ مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ ۵/۵۲
- ۱۰۴۔ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ عوامی تحریک بنے گا۔ ۳، ۱/۵۵
- ۱۰۵۔ مسلم یونیورسٹی کے خلاف ہوجانے ۶/۴۵
- ۱۰۶۔ بستی تعلیمی کانفرنس۔ ۱/۴۵
- ۱۰۷۔ اقبال سے ایک ملاقات ۲/۵۵

وفیات

۱/۱ جولائی ۱۹۳۸ء

نظرات کے کالم میں

۶/۱
۶/۵
۲/۶
۶/۵
۲/۵
۲/۲
۶/۱
۵/۱۰
۲/۱۱
۵/۱۲
۳/۴
۳/۱۳
۵/۱۸
۵/۱۶
۶/۱۸
۳/۲۱
۵/۱۶

- ۱۔ اقبال
- ۲۔ اکبر شاہ خاں
- ۳۔ سید سراج احمد رشیدی
- ۴۔ شوکت علی مرحوم
- ۵۔ سعید انصاری
- ۶۔ سیر شاہ سلیمان
- ۷۔ ابوالحسن محمد سجاد بہاری
- ۸۔ احسن مارہروی
- ۹۔ معین الدین اجیری
- ۱۰۔ مصطفیٰ کمال
- ۱۱۔ کلشن
- ۱۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی
- ۱۳۔ طفیل احمد منگھوری
- ۱۴۔ علامہ طنطاوی محمد بہری
- ۱۵۔ مولانا عبید اللہ سندھی
- ۱۶۔ فرحت اللہ بیگ
- ۱۷۔ محمد میاں منصور
- ۱۸۔ امیر شریعت شاہ محمد الدین قادری
- ۱۹۔ گلاندھی جی، آہ لعل شب چراغ ہند
- ۲۰۔ محمود شیرانی

- ۲۱- مولانا ایاس کاندھلوی ۵/۱۸
- ۲۲- محمد علی جناح ۳/۲۱
- ۲۳- مولانا شبیر احمد عثمانی ۱/۲۴
- ۲۴- تاجور نجیب آبادی ۲/۲۶
- ۲۵- ڈاکٹر ابراہیم حسین والد مولانا اکبر آبادی
- لاشعہ مفتی عتیق الرحمن ۲/۲۹
- ۲۶- مولانا وحید الرحمن ۷/۲۶
- ۲۷- سیما اکبر آبادی ۲/۲۶
- ۲۸- مولانا سید سلیمان ندوی ۶/۳۱
- ۲۹- مولانا حبیب الرحمن شرفانی ۲/۲۵
- ۳۰- حبیب الرحمن لدھیانوی ۲/۳۷
- ۳۱- مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی ۱/۲۹
- ۳۲- آصف علی ۵/۳۰
- ۳۳- سید ابوالنظر رضوی ۵/۳۶
- ۳۴- ابن سعود ۶/۳۱
- ۳۵- مولانا اسلم جیراچوری ۱/۳۶
- ۳۶- بشیر الدین امادی ۱/۳۷
- ۳۷- شانتی سرور بھنگاگر ۲/۳۴
- ۳۸- شفیق الرحمن قدوائی ۷/۳۰
- ۳۹- رفیع احمد قدوائی ۵/۳۳
- ۴۰- خواجہ حسن نظامی ۲/۳۵
- ۴۱- مولانا حسین احمد مدنی ۶/۳۹
- ۴۲- اقبال سہیل ۱/۳۵
- ۴۳- مولانا اعجاز علی ۲/۳۳
- ۴۴- مولانا آزاد سمائی ۱/۳۹
- ۴۵- ابوالکلام آزاد ۳/۴۰
- ۴۶- اے کیمرنگ بنگال چیمبرس آف کامرس ۲/۲۳
- ۴۷- مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری ۱/۲۸
- ۴۸- یعقوب الرحمن عثمانی ۲/۲۸
- ۴۹- بہال سیوہاروی ۱/۲۸
- ۵۰- تحریک مولانا مناظر احسن گیلانی ۱/۳۷
- ۵۱- عبدالسلام ندوی ۱۱/۱
- ۵۲- عطار راشد شاہ بخاری ۳/۳۳
- ۵۳- عبید اللہ یوسف علی ۱/۳۲
- ۵۴- مفتی عبد اللطیف بہار پوری ۲/۳۳
- ۵۵- لیاقت علی خاں ۵/۲۷
- ۵۶- کشن پرشاد کول ۲/۳۴
- ۵۷- قاضی عبدالغفار ۲/۳۶
- ۵۸- شاہ علیم عطا، ۵/۳۵
- ۵۹- عبد الرحمن ۳/۳۳
- ۶۰- عبد الکریم مدنی ۱/۳۵
- ۶۱- منیار الدین احمد ۵/۲۸

۶/۲۳	۸۳۔ سید محمد احمد کاظمی	۶/۲۷	۶۲۔ ظفر علی خان
۲/۲۵	۸۴۔ مطلوب الرحمن عثمانی	۶/۲۳	۶۳۔ اسد ملتانی
۲/۲۲	۸۵۔ غلام حسن ناظم سیوہاری	۵/۲۵	۶۴۔ امجد حیدر آبادی
۶/۵۰	۸۶۔ ہادی حسن	۴/۲۵	۶۵۔ جگر مراد آبادی
۲/۵۲	۸۷۔ مولانا محمد یوسف امیر جماعت	۶/۲۳	۶۶۔ احمد سعید دہلوی
۱/۵۰	۸۸۔ عبد المجید خواجہ	۴/۲۶	۶۷۔ ڈپٹی حبیب اللہ
۲/۵۲	۸۹۔ خواجہ عبدالحی فاروقی	۳/۲۴	۶۸۔ نواب حمید اللہ خاں
۶/۵۵	۹۰۔ طاہر سیف الدین	۳/۲۴	۶۹۔ دل شاہ جہانپوری
۴/۵۱	۹۱۔ سید صدیق آئی، بی، ایس	۶/۲۰	۷۰۔ رام بابو سکسینہ
۱/۵۲	۹۲۔ مولانا صبغت اللہ شہید فرنگی علی	۴/۲۳	۷۱۔ عبد المجید سالک
۵/۵۵	۹۳۔ مولانا بدر عالم میرٹھی	۴/۲۸	۷۲۔ شعیب قریشی
۵/۵۵	۹۴۔ ترمجون ناتھ زار زشتی	۲/۲۲	۷۳۔ خلیفہ عبدالحکیم
۶/۵۰	۹۵۔ محی الدین زور	۴/۲۰	۷۴۔ افضل العلماء عبدالحق
۶/۵۰	۹۶۔ محمد شفیع	۲/۲۷	۷۵۔ مولوی عبدالحق
۶/۵۰	۹۷۔ فخر مشرق شفیق جونپوری	۴/۲۹	۷۶۔ عبد الرحمن خاں
۲/۵۶	۹۸۔ لال بہادر شاستری	۶/۲۶	۷۷۔ ڈاکٹر عبد العالی
	۹۹۔ تلوک چند محرم	۳/۲۶	۷۸۔ شاہ عبد القادر رائے پوری
۲/۵۹	۱۰۰۔ مسعود علی ندوی	۱/۲۲	۷۹۔ مفتی عبد اللطیف علی گڑھی
۱/۴۰	۱۰۱۔ محمد ایمان بیگم بلیاوی	۱/۲۰	۸۰۔ مفتی کفایت اللہ
۲/۶۰	۱۰۲۔ حافظ محمد ابراہیم	۵/۲۵	۸۱۔ پنڈت کیفی
۲/۶۰	۱۰۳۔ عبدالباقی مدیر کاروان دکن	۴/۲۳	۸۲۔ محمد علی رودلوی

۱۰۴ - پروفیسر نجیب انور ندوی	۱/۹۱	۱۰۳ - پرویز شاہدی	۱/۹۱
۱۰۷ - مفتی (انتظام) احمد سہالی	۲/۹۱	۱۰۵ - غفر خان یوسفی	۲/۹۱
	۲/۹۲	۱۰۸ - تقا اللہ عثمانی	۲/۹۲
۱۱۰ - اسرار احمد	۲/۹۲	۱۰۹ - مفتی محمود احمد نانوتوی	۲/۹۲
۱۱۱ - قاری محمد یوسف		۱۱۰ - قاری حفظ الرحمن	
۱۱۲ - رشید صدیقی	۵/۹۲	۱۱۱ - ڈاکٹر ذاکر حسین	۵/۹۲
۱۱۶ - ڈاکٹر سید محمود	۵/۹۲	۱۱۵ - مولانا رسول خان (استاد)	۵/۹۲
۱۱۸ - اسد اللہ کاظمی	۶/۹۲	۱۱۸ - ڈاکٹر سید عبداللطیف	۶/۹۲
۱۲۰ - شاد فیصل		۱۱۹ - غلام رسول مہر	
۱۲۲ - ڈاکٹر عبدالمجید دانشور	۲/۹۲	۱۲۱ - خواجہ غلام اسدین	
۱۲۳ - ڈاکٹر زبیر صدیقی	۲/۹۲	۱۲۳ - احتشام الحسن کاندھلوی	۱/۹۸
۱۲۶ - سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری	۵/۹۲	۱۲۵ - مولانا عبدالباری شاہی	
۱۲۸ - شیخ علال القاسمی المراکشی	۶/۹۲	۱۲۸ - الحاج مولانا محمد اسماعیل	
۱۳۰ - سید امین اکسینی مفتی (عظم فلسطین)	۲/۹۳	۱۲۹ - مولانا سید فخر الدین احمد	۵/۹۸
۱۳۲ - مولانا شاہد قاضی	۲/۹۳	۱۳۱ - عبدالستار صدیقی	۲/۹۹
۱۳۳ - مولانا سید محمد میاں	۲/۹۹	۱۳۲ - پروفیسر سید احتشام حسین	۲/۹۹
۱۳۶ - آغا شورش کشتری		۱۳۵ - سید عبدالرحمن صاحب	
۱۳۸ - ڈاکٹر میر ولی الدین		۱۳۷ - عبداللطیف نعمانی	
۱۴۰ - مولانا اسماعیل سنبھلی	۲/۹۰	۱۳۹ - عبد القیوم انصاری	۲/۹۰
۱۴۲ - شاہ معین الدین ندوی		۱۴۱ - غلام احمد فرقت کاکوری	
۱۴۳ - نواز الدین برسر	۶/۹۰	۱۴۳ - مولانا عبداللہ رحمانی	

- ۱۴۵۔ مولانا عبدالسلام فاروقی ۳/۷۱
 ۱۴۶۔ پروفیسر عبدالحمید خاں ۴/۷۱
 ۱۴۷۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی ۶/۷۲
 ۱۵۱۔ مولانا شریف الحسن شیخ اکھٹار یوبند
 ۱۵۳۔ مولانا یوسف بنوری ۶/۷۸
 ۱۵۵۔ سید اختر حسین استاد دیوبند ۶/۷۹
 ۱۵۷۔ قاری محمد یعقوب ۶/۷۹
 ۱۵۹۔ مولانا فخر الحسن سنی عری ۴/۷۵
 ۱۶۱۔ جمیل منطری
 ۱۶۳۔ محمد ثانی الحسنی
 ۱۶۵۔ جوش ملیح آبادی
 ۱۶۷۔ فراق گورکھپوری ۴/۸۸
 ۱۶۹۔ ارساق دانش
 ۱۷۱۔ قاری محمد طیب ۲/۷۱
 ۱۷۳۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی ۵/۷۲
 ۱۷۵۔ جسٹس بشیر احمد سعید ۱/۷۳
 ۱۴۷۔ مولانا عثمان فاروقی ۱/۷۷
 ۱۴۸۔ رشید احمد صدیقی ۲/۷۸
 ۱۵۰۔ عبدالاحد دریا آبادی ۱/۷۸
 ۱۵۲۔ شیخ محمد جان
 ۱۵۴۔ مسطفی احسن علوی کوہنہ ۱/۸۶
 ۱۵۶۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی ۲/۸۶
 ۱۵۸۔ امتیاز علی خاں ششی ۶/۸۶
 ۱۶۰۔ نواب احمد سعید خاں چغتائی ۲/۸۸
 ۱۶۲۔ پیر حسام الدین راشدی ۶/۸۸
 ۱۶۴۔ شیخ عبدالعزیز ۴/۸۹
 ۱۶۶۔ عبدالحکیم نعمانی ۲/۹۰
 ۱۶۸۔ خواجہ عبدالرشید ۴/۹۰
 ۱۷۰۔ ایل کے گلانا
 ۱۷۲۔ پروفیسر امیر علی فیضی ۵/۸۷
 ۱۷۴۔ ڈاکٹر بی کے، عبد الغفور ۱/۹۳
 ۱۷۶۔ محمد عثمان (مالیگاؤں) ۱/۹۳

مولانا اکبر آبادی مرحوم نہ صرف ایک بلند پایہ عالم اور نکتہ سیخ ادیب تھے بلکہ شاعر بھی تھے مگر بقول خود کے کہ ایک مرتبہ اپنے ابتدائی دور میں جب کہ میرے ارزاں قسم کے مضامین و مقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے، ایک نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف جیسے معیاری رسالہ کے معیار کے لائق ہے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی خدمت میں اس سال کوڑا، مولانا نے یہ نظم و پس کرتے ہوئے بڑی

محبت اور شفقت کے ساتھ تحریر فرمایا۔ آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ یہ آپ کے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہے کچھ محنت کیجئے، اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجئے۔ قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہو سکتی ہے، اور یہی ہونی چاہئے۔

مولانا موصوف پر اس خط کا یہ رد عمل ہوا کہ بقول ان کے میں نے مولانا کے گرامی نام کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا۔

کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں، سب حقیقت کھل گئی

تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم علت کھل گئی

ماقم احقر کی نظر سے مذکورہ بالا شماروں میں مولانا مرحوم کی چار غزلیں مولائی ۱۹۳۱ء

نومبر ۱۹۵۲ء، دسمبر ۱۹۵۲ء، اگست ۱۹۵۳ء گذریں۔

مندرجہ بالا فہرست چونکہ مختلف اوقات میں نقل کی گئی اسلئے تسلسل قائم نہ رہ سکا۔

یہی صورت وفيات کی نگارہی۔

ڈاکٹر نور البنی مرحوم

(حمید نسیم رفیع آبادی، ایم، اے، علی گڑھ)

ڈاکٹر نور البنی صاحب، ۱۹ جنوری ۱۹۸۳ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے، مرحوم اسرار
 دسمبر ۱۹۲۹ء کو بہار میں پیدا ہوئے، انھوں نے ۱۹۵۲ء میں بیٹھ یونیورسٹی سے بی، اے
 آنرز (فلسفہ) میں کیا، اور ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم، اے کا امتحان
 امتیاز کے ساتھ پاس کیا، ۱۹۵۸ء میں موصوف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پر سے ڈاکٹر
 محمد الدین مرحوم کی نگرانی میں P.H.D کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۵۶ء میں لیکچرر مقرر
 ڈاکٹر صاحب نے *Violence process* کی حیثیت سے اولڈ ڈوسیشن
old Dominion، نارفاک (Norfolk) تنگا گوڈیاب (Deale)
 اور مسلم کمیونٹی سینٹر سکاگو (امریکہ) میں لیکچر دیئے مرحوم نے فلسفہ اور مذہب کے
 متعلق کم و بیش ۲۲ کافر سوں میں شمولیت فرمائی جو ہندوستان اور بیرون ملک
 مختلف جگہوں پر منعقد ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے چالیس سے زیادہ مقالات مختلف
 فلسفیانہ مذہبی اور دنیاوی موضوعات پر ہندوستان اور دنیا کے مشہور
 علمی رسالوں میں چھپے آپ کی قلمی باقاعدہ کتابیں ہیں ان کی کتاب —
 علمی حقائق میں خاصی مقبول ہوئی۔ مرحوم حال ہی میں امریکہ میں کئی کافر نسوں میں شمولیت
 کی غرض سے تشریف لے گئے تھے وہاں ہی ان کے بائیں پاؤں میں زخم ہو گیا اور زیا بیٹھس

خارج ہوئے۔ اور ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر صاحب پہلے ہی ریڑھ ہو گئے۔

کے مرض میں پہلے ہی سے مبتلا ہونے کی وجہ سے اس زخم نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور آخر کار وہ ہی ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا آخری زخم ثابت ہوا۔

نور النبی صاحب کا منصوبہ تھا کہ وہ مسلم فلسفہ اور اسلامی تصوف کے اصلی ماخذ تک رسائی کے ذریعے مسلمانوں کے عظیم علمی کاموں اور کارناموں کی از سر نو تفتیش کا گرانبار کام انجام دیں اس سلسلے میں آپ نے مختلف موضوعات جیسے ارسطو اور ابن رشد، شاہ ولی اللہ دہلوی، مجدد الف ثانی، شاہ ہمدان، میر سید علی ہمدانی، سید دراز، بابا فرید صاحب، محمد جاسسی وغیرہ جیسی اہم اور عہد ساز شخصیتوں اور ان کے فلسفوں اور تعلیمات کو اپنی تصحیح اور اصل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے کام کا آغاز بھی کرایا تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم کے پیش نظر غزالی کی "تہافت الفلاسفہ" کے تنقیدی جائزے اور ابن عربی کے فلسفہ وحدۃ الوجود، پر کام کے بھی منصوبے تھے کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ لوگوں نے ابن عربی کو غلط انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ کہتے تھے کہ اگر ان کے فلسفہ کے اصل ماخذ سے مدد لے کر جائزہ لیا جائے تو ان کے متعلق مشکوک و شبہات دور ہو سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے ابن رشد کی کتاب "فصل المقال" کا اردو میں ترجمہ کرایا، اس پروجیکٹ کے لئے جی۔ سی۔ نے گرانٹ بھی منظور کر لی تھی۔ مگر نہ معلوم قدرت کو کیا منظور تھا کہ ڈاکٹر نور النبی صاحب صرف ۵۲ سال کی عمر میں ان تمام اہم منصوبوں کو ادھور چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت سارے محاسن حسنہ کا مجسمہ تھے، سب سے بڑی خوبی جو ان میں تھی وہ یہ تھی کہ ان کو اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنے شاندار علمی ورثے کی عظمت کا احساس اور اس کے احیاء کا جذبہ تھا۔ مغرب کے فلسفہ اور علوم جدید میں اسکی ترقی سے مرعوب نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ فلسفہ پڑھنے اور پڑھانے کے باوجود انھوں نے کبھی بھی مذہب اور تصوف کے موضوع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ ہر موقع پر فلسفہ کی مدد سے مذہب کو جاندارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

وہ مغرب کے اندھے مقلد نہ تھے، بلکہ اسکے برعکس ان کو اپنے مذہب اپنی تہذیب اور اپنے اسلاف کے کارناموں کے ساتھ ایک والہانہ لگاؤ تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حکمت اور فلسفہ کے ان سرچشموں کا کھوج لگانا شروع کیا تھا، جو ہمارے مسلمان حکماء اور فلاسفہ نے بڑی کاوش اور محنت سے فراہم کیے ہیں۔ نور النبی صاحب مرحوم ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے ماضی اور مذہب سے کنارہ کش ہو کر مغرب سے بلند ہونے والی ہر آواز پر فریفتہ ہوتے اور بقول سارتر (Sartre) ان مرعوب دانشوروں کی طرح نہ تھے جو اپنے لوگوں کو پیرس، لندن اور امسٹرڈم (Amsterdam) سے بلند ہونے والی آواز (PARA) JHERHWD اور THE NIN PARATHE & M40d JHERHWD کی صدائے بازگشتہ دیتے اسکے برعکس ان کو یقین تھا کہ مسلمان فلسفیوں حکماء و علماء اور صوفیاء کے کارنامے بذات خود اتنے رفیع اور قابل قدر ہیں کہ یہ ہم کو مغرب کے تمام ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فلسفوں سے نہ صرف بے نیاز کر سکتے ہیں بلکہ ہماری ہم جہت ترقی اور کامیابی کے محرک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مرحوم کا یہ بھی اذعان تھا کہ موجودہ علوم و فنون اور فلسفہ میں مغرب نے جو ترقی کی ہے اسکی بنیاد سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی رکھی تھی اور مغرب نے اسی بنیاد پر اپنے علمی کارناموں کو مرتب کیا۔ مگر اپنے اولین مسلمانوں کے جیسے ساری علمی ترقی کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہا یہی وجہ تھی کہ نور النبی صاحب چاہتے تھے کہ مسلم فلسفہ اور دوسرے علوم کو اپنے بنیادی مآخذ (ORIGINS SOURCES) سے حاصل کر کے تحقیق و تفتیش کے بعد دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ مسلمان مرغوبیت اور احساس کمتری سے نکال کر اپنے تہذیبی اور مذہبی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں بلکہ اس کو اور ترقی بھی دے سکیں۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب دنیائے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر ٹوٹنے والی مصیبتوں اور مظالم کی خبریں سن کر بے چین ہو جاتے تھے، اور وہ باقاعدہ دنیائے حالات اور خصوصاً مسلمانوں کے حالات سے مکمل آگہی رکھتے تھے، اور جب کبھی ان کو موقع ملتا کہ وہ ان حالات پر تبصرہ کریں تو ان کے دلسوزی اور ہمدردی میں دوبے ہوئے الفاظ سامعین کے دلوں کو چھو جاتے تھے، اور ان میں خود بخود کچھ کرتے کا جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم عزیزوں، مسکینوں اور فورتھ گرڈ ملازمین طبقہ کے ساتھ بہت ہمدردی رکھتے تھے، اور ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک حال رہا کرتے تھے نہ صرف خود انکی مدد کرتے بلکہ اپنے سے وابستہ گونا گوں قسم کے لوگوں اور شاگردوں کو بھی ان کی مدد کرنے پر ابھارتے تھے۔ اپنے شاگردوں کی مدد کرنا ان کی پڑھائی اور دوسرے کاموں کے متعلق ان کو مشورے دینا اور رہنمائی کرنا، اور ان کے ساتھ انکی اخلاقی و دینی لحاظ سے تربیت کرنا اور انکی صلاحیتوں کو نشوونما دینا ڈاکٹر صاحب کی بہت ساری خوبیوں میں سے چند نمایاں خوبیاں تھیں مرحوم اس شعر کے حرف بہ حرف مصداق تھے،

سہ در غم دیگر بسوز و دیگر ال راہم بسوز،

محنت اور عمل مرحوم کی زندگی کے دو مستقل اصول تھے۔ وہ نہ صرف اس پر خود کاربند رہتے تھے بلکہ اپنے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگوں کو بھی اچھی زیورات سے آراستہ کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

اسلام کے ساتھ نور النبی، صاحب کو والہانہ عقیدت تھی، پناہیہ اسلام پر مختلف حلقوں اور مغرب زدہ اور مکیسٹ مسلمانوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کا مرحوم مسکت جواب دیتے تھے، اپنے شاگردوں کو ہر وقت ڈاکٹر صاحب اسلام کے ساتھ چپٹے رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے، اور اسلامی احکام پر عمل آمدی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ مرحوم کو بے پناہ

محبت اور عشق تھا۔ عشق رسول نے آپ کو اتنا گرویدہ بنا دیا تھا کہ جیسا بھی کسی کی طرف سے رسول امیرؐ یا صحابہؓ رسولؐ کے بارے میں کسی معمولی قسم کا اعتراض یا انہی شان میں سوئے ادبی کا اذیاسا مظاہرہ دیکھتے تو بے چین ہو جاتے تھے اور گرجتی ہوئی آواز میں معترض پرہتے تھے چنانچہ اپنے مرض الموت میں ڈاکٹر صاحب مرحوم راقم امد حیات عام کو بار بار زیارتہ قبر النبیؐ کے متعلق احادیث تلاش کرنے کے لئے کہتے اور جب ہم نے ان کو وہ من زار قبری وجبت رہ شفاعتی،، والی حدیث سنائی تب جا کے ان کو اطمینان ہوا۔

آخر میں ڈاکٹر نور النبی مرحوم کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی ایک یادگار تھے، ان کے علمی اور عملی منصوبے اتنے عظیم اور اہم تھے کہ جیسے وہ اسلامی فلسفہ اور تصوف کی از سر نو تدوین و تجدید کرنا چاہتے ہوں۔ اگرچہ مرحوم اب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ۵۲ سال کی مصروف ترین زندگی گزار کر انھوں نے کما کرے والوں کے لئے نمونہ اور مثال بچھڑی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنی محبتوں سے نواز دے اور ان کے ادھورے چھوڑے ہوئے مفید علمی کاموں کو آگے بڑھانے کا جذبہ ہمارے دلوں میں پیدا کرے۔

آسماں تیری بحد پشیم افشانی کرے
سبزۂ لارستہ تیری نگہبانی کرے

ایڈز «AIDS»

(عارفہ، نقصان مناعت (شبق و غلمہ) کا

قدیم یونانی تصور

قرآن حکیم اور میڈیکل سائنس کی روشنی میں

لے اقبال احمد قاسمی، ایم، ڈی (علم الادویہ)

تعارف مرض ایڈز «AIDS» ایک نہایت ہی بھیانک صورت حال کا نام ہے جو لوگ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب فرد تصور کرتے ہیں آج وہی لوگ اس مہلک بیماری کا شکار اور کتاب خداوندی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ انہیں امریکہ اور یورپ کے علاوہ وہ اقوام بھی شامل ہیں جو ان کے شانہ بشا چلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

قدیم یونانی حکماء اور عرب اطباء نے اس طرح کی بیماریوں کے خطرات سے انسانیت کو بہت پہلے ہی خبردار کر دیا تھا ان کی کتابوں اور طبی تصانیف میں جگہ جگہ اس کا

لے اقبال احمد قاسمی، سی ۲۸، میڈیکل کالونی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(یوپی) PIN 202001

ذکر ہے اس کو اطباء نے دہشتیق و غمہ، کاناکہ دیا تھا، قرآن پاک میں بھی اس طرح کی متعدد آیات ملتی ہیں جن میں انسانیت کو اس مہلک مرض سے بچنے اور بچانے کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔

قرآن حکیم میں اس کا ذکر | ولما جاءت راسلنا لوطا يسئ برهم وضاق بهم ذرعاً وقال هذا يوم عصب وجلد

قومہ پھر عیون الیہ . ومن قبل کانوا یعملون السیات قال یا قوم هو کلاء بناتی هن اطهرکم فاتقوا الله ولا تخزن فی ضیعی اللیس منکم رجل رشید . (سورۃ ہود - آیات ۷۷ - ۷۸ -

۔ ونخبینا لوطاً ائی الارض الی بارکنا فیہا للعلمین .

(سورۃ انبیاء آیت ۷۱۰)

۔ ولوطاً اتینا احکماً وعلماً ونخبینا من القریۃ الی کاننا قتل الخبیثات انھم کانوا قوم سوء فاسقین لا داخلنا فی جہنما انہم من الصالحین . (سورۃ انبیاء آیت ۷۴ - ۷۵ -

اذ نخبینا واهلہ اجمعین . الا عجوزاً فی الغابون .

(سورۃ صفت آیت ۱۳۴ - ۱۳۵)

قال ان هو کلاء ضیفی فلا تفضحون . واتقوا الله ولا تخزن قال هو کلاء بناتی ان کنتم فاعلمین .

(سورۃ الحج آیت ۶۸، ۶۹، ۷۱ -

۔ اذ قال لہما خوہم لوط الا اتقون . انی لکم رسول امین . اتاد الذکر ان من الدالین . وتذرون ما خلق لکم ربکم من انہما حکم بل انتم قوم عدون .

(سورۃ الشوریہ آیت ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۶۶)

— رَبِّ تَجَنَّبْنِي وَاهْلِي مَتَّاعِي عَمَلُونِ، فَتَجِيئُهُ وَاهْلُهُ أَجْمَعِينَ الْآعْجُونَ
فِي الْغَابِرِينَ، ثُمَّ دَمَرْنَا الْآخِرِينَ -

(سورۃ الشعراء، آیات ۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲)

— وَلَوْ طَأَّ اِذْ قَالَ لَهْوَمُهٗ اَنْكُم مِّنْ تَابُوتِ الْفَاحِشَةِ الْاَلَايَةُ اِنَّكُمْ تَأْتُونَ
الرَّحِيَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ الْاَلَايَةُ اِنَّكُمْ مَهْلُكُوا اَهْلَ هَذِهِ الْقَرْيَةِ
اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ -

(سورۃ الصنکبوت، آیات ۲۸، ۲۹، ۳۰-۳۱)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ملتی ہیں جن میں اس طرح کی جنسی بے راہ روی اور فحش
کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ممانعت کی گئی ہے اور بنی نوع انسان کو ہلاکت سے بچنے
کے لئے ہدایت کے راستے دکھائے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن پاک بزرگ
کے تمام شعبوں کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل اور نظام حیات ہے۔ ہم جنسی جیسے شیعہ کام سے
اگر اس انوں کو روکا گیا ہے تو اس کے پچھے یقیناً کوئی بہت بڑا سبب ہے۔ راز تھا جس میں انسان
کی فلاح اور بنی نوع انسان کی بھلائی پوشیدہ تھی، لازم و لفظ، اکام و شرب اور طہارت
و نجاست کے جہاں تمام اصول اس طرۃ المعارف میں بیان کیے گئے ہیں وہیں پر
جملہ طرح کی بیماریوں اور ہر نوعی مضر قوتوں سے انسان کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک مکمل ضابطہ
بھی پیش کیا گیا ہے۔

جدید تحقیقات اور سائنسی ترقیات نے رفتہ رفتہ ان تمام قرآنی تعلیمات کو محقق ثابت
کر دیا ہے جنہیں اب سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال پہلے خدا نے اپنے برگزیدہ نبی کے توسط
سے انسانوں کے سامنے عرض فرمایا تھا بلکہ "لعلکم تتفکرون" اور
فاعتبروا یا اولی الابصار۔ جیسے واضح الفاظ میں دعوت فکر بھی دی تھی،
عورتوں کو چھوڑ کر کسی سے جنسی ملاپ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

خرابی کے باعث انسان کسی بھی مرض کا شکار ہو سکتا ہے کیونکہ ایڈز میں انسانوں کی قوت مدافعت و مناعت ختم ہو جاتی ہے تبھی وجہ سے کینسر اور دیگر جلدی امراض بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ بیماری آج کا کوئی نیا دریافت نہیں بلکہ ابوجرحہ

اطباء قدیم کے نظریات

بن زکریا رازی کے مستاذ و طبیب دنیا ہے

دور کے ایک اہم ستون، ابوالحسن علی بن زین الطبری نے اپنی ساریہ ناز کتاب مردوں کی حکمت میں پانچویں مقالہ کے چھٹے اور ساتویں باب میں صفحہ ۱۱۱ و ۱۱۲ ایڈز کے سلسلے میں

بڑے واضح الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے ایڈز کے مریض کا علاج، احتیاطی تدابیر پر پورا و دوسرے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ طبری لکھتے ہیں:

من تازی با شبق والغسل

فلیشاغل عتہ بالنظر فی الارباب

و غیرھا ویغتذی بکل شئ بارد

ویتباعہ من النساء ویشد

علی ظہرہ صحیفۃ من صاف

بمس کوشق و غمرہ (ایڈز) کی شکایت ہو اس کو

بدفعی سے باز رہنا چاہئے۔ اور کم از کم اعلانی

اصولوں کے پیش نظر اس سے احتراز کرنا چاہئے

ایسے مریض کو بار بار دیا بس غذاؤں کا استعمال

کرنا چاہئے، اور عورتوں سے جماعت نہ کرے

چنانچہ جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جنسی ملاپ کرنے والوں میں

شش فیصدی پر ۸۰ کو ایڈز کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح کے مردوں کے رابطہ میں

آنے والی عورتوں میں بھی تھپہ کے نتیجے میں یہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔

داود الاظہار کی ایہ نازت لیفہ النور ہما المبتہجۃ فی تشحید

الافہان و تدبیر الامزجۃ، میں بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اس مہلک مرض

کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس سے حاصل شدہ معلومات ہمارے لئے ادبھی

درجہ سبب اس سے ہیں کہ مصنف نے شیخ الریش اس سینا کا قول نقل کرتے ہوئے

”جاء غلمان“ کا نقص اور اس کی مفرغ بیان کی ہیں۔ کتاب الباب الثالث فی

یہاں تک کہ یہ ایک طبی کتاب ہے۔

کیفیت الغایۃ وهو الجماع“ میں تحریر ہے۔

قال الشیخ: ۱۔ یستغبط مما ذکرہم
الجماع بالحنان والاشۃ
والطفلة وغیر ذلک) فساد
الجماع فی الادبایا فانہا تم تخلق
بشهوة بل تحتاج الی عنف
الحركة ولم تستفرغ الماء
فتسقط بالوجه الا ولا لقوة
وتوجب بالتانی فساد
البدن بما بقی من الماء
ولهذا یسقط قبل من
انہا موفرة للقوی مقوۃ
استفرغها المني۔

شیخ کا قول ہے کہ مذکورہ بالا باتوں (حائضہ
آئندہ اور بچی سے جماع نہ کرنا) کی روشنی میں
جماع غلمان کی خرابی مستنبط ہو جاتی ہے
کیونکہ انسان کی دُشہوت کی تکمیل کے لئے
نہیں بنائی گئی ہے بلکہ اس میں توجہ بردستی
کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جسکی وجہ سے
منی کا مکمل طور پر اخراج بھی نہیں ہو پاتا لہذا
زبردستی کرنے کے نتیجے میں (انسان کی) قوت
زائل — وساقط ہو جاتی ہے اور استفرغ
کلی نہ ہونے کی وجہ سے فساد بدن لاحق ہوگا
کیونکہ مادہ منویہ خارج نہیں ہو سکا لہذا
اس سے وہ تصور باطل ہو جائیگا جس میں
اس کو صرف منی خارج ہونے کی وجہ سے
مزید قوی خیال کیا گیا ہے۔

بچونکہ یہ ایک غیر طبعی فعل ہے اور اکمال شہوت کے باوجود منی کا اخراج نہیں ہوتا اسی
لئے قوت (مناعت) ساقط و باطل ہو جاتی ہے اور بدن میں فساد و امراض لاحق ہوتے
ہیں۔ ایک انوکھی بات یہ بھی ہے کہ قدیم اطباء میں کچھ لوگ ہم جنسی کو انسان کی قوت طاقت
میں اضافہ کا باعث تصور کرتے تھے، کیونکہ اس میں ان کے نزدیک استفرغ منی ہوتا
تھا۔ لیکن شیخ الرئیس ابن سینلنے اسکی پُر زور مخالفت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ مذکورہ
وجوہات کی روشنی میں وہ تصور اور نظریہ باطل ہو جاتا ہے جس میں تصور کیا گیا ہے کہ ہم جنسی

مزید و موثر قوت ہے۔

حکیم حیدر علی خان اپنی فارسی تصنیف ”تہذیب العلاج“ میں شعبہ دوم در جماع کے ذیل میں قسط از ہیں :

وجامع غلمان از بسکہ استفراغ غیر طبعی
است اگر چه اخراج منی قلیل بود و لیکن
ضعف آرد ، مضر باشد ۔
لڑکوں سے جماع کرنا چونکہ ایک غیر طبعی استفراغ
ہے باوجود کہ اس میں اخراج منی کم ہوتا ہے
لیکن یہ ضعف پیدا کرتا ہے اور اس طرح کا
فعل مفر صحت ہے ۔

لڑکوں کے ساتھ جماع کرنے سے ضعف لاحق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک غیر فطری عمل
ہے اور قدرت نے غیر طبعی افعال کے ارتکاب سے منع کیا ہے ورنہ اس کے برے نتائج سامنے
آئیں گے ، جس سے انسان کو اپنی صحت اور اپنی جان بچانی مشکل ہو جائیگی ۔
علی بن زین الطبری نے اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے ۔ اور اپنی
کتاب ”الایضاح عن السمن والھزال“ میں ”جماع فی الادب“ سے
ایک باب بھی قائم کیا ہے ۔

جدید تحقیقات اور قدیم نظریات سے ان کا تعلق | اب تک کی تحقیقات کے
تقریباً ۱۰۵۱ افراد اس مرض کا شکار ہو چکے ہیں ، ابھی یہ چیز تحقیق طلب ہے کہ اس میں

۱۵ ہمارے محدود وسائل اور ذرائع کے مطابق ہندوستان کے مشہور کتابخانوں میں
رہی) اس کے نسخے نہیں ملتے ، (اقبال احمد قاسمی)

۱۶۔ دنیا بھر میں ایڈس کے مریضوں کی تعداد ۲۰ ہزار ۸۸ ہو گئی ہے عالمی صحت تنظیم کے مطابق
۱۷۔ ۵۰ سے ۲۴ ممالک نے رپورٹ دی ہے کہ انکے یہاں ایڈس کا کوئی مریض نہیں ہے
(اقبال احمد قاسمی)

کون سے ہر شیم اثر انداز ہوتے ہیں ان ملکوں میں جہاں ہم جنسی عام ہو یا صفائی کا خیال نہ رکھا جاتا ہو وہاں اس مرض کے بہت تیزی سے پھیلنے کے امکانات ہوتے ہیں اس کا پہلا شکار مفعول ہوتا ہے اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم جنسی کی وبا کو ختم کیا جائے جسکی تائید علی بن زین الطبری کے قول "فلیتشاغل عنه بالنظر فی الاداب وغیرہا" سے ہوتی ہے۔

ایڈز کی دریافت سب سے پہلے امریکہ میں اس وقت ہوئی جب ایک امریکی سائنس دان نے — HUMAN T-CELL LEUKAEMIA VIRUS — دریافت کیا، اس فیروس VIRUS کو LAV بھی کہتے ہیں جو قریق مادوں کے ذریعہ جسم انسانی میں داخل ہو جاتا ہے، مادہ منویہ اس طرح کے فیروس کے جسم میں پھیلنے کا سب سے اہم سبب بنتا ہے۔ یہ فیروس، آنسو، خون، مادہ منویہ، اور لعاب دہن میں پایا جاتا ہے۔

بہرحال اس میں انسان کی قوت مناعت جو ایک قدرتی عطیہ ہے کمزور یا ختم ہو جاتی ہے اور طبیعت کا مدافعتی عمل ضعیف پڑ جاتا ہے اسلئے جسم انسانی میں تعدیہ کو قبول کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور انسان میں ضعف، بطلان عمل اور قتل آ جاتا ہے نیز اس میں تھکاوٹ اور فعلی نقص بھی ہو سکتا ہے چنانچہ جس نظریہ کو حکیم حیدر علی خاں نے پیش کیا ہے اور جس ضعف کی طرف ان کا اشارہ ہے یا جس کو ابن سینا نے سقوط قوت کا نام دیا ہے اس کو ہم دوسرے الفاظ میں نقصان اور ضعف مناعت سے تعبیر کریں تو بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔

اس مرض کے فیروس کٹی ہوئی جلد اور غشاء منی مٹی وغیرہ کے راستے بہت جلد اپنا تعدیہ پھیلاتا ہے۔ اگر مائیں اس مرض میں مبتلا ہوں تو ان کے نوزائیدہ (بچوں) میں بھی اس کا تعدیہ پایا جائے گا، جو خون کے ذریعہ ان بچوں میں آ جاتا ہے، مادہ منویہ اور خون کے

ذریعہ اس فیروس کا نقل و حمل زیادہ عاک ہے غیر انس میں بعض ماسند داں جسم انسانی میں لازمی قوت مناعت کو قائم رکھنے اور اس کو مستحکم بنانے کے لئے تحقیقات کر رہے ہیں نیز مغربی دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح کی احتیاطی تدابیر اور تدارک کے طے سے تلاش کیے جا رہے ہیں۔

ایک ضروری تشریح | اس موقع پر دو قرآنی الفاظ کی تشریح کرنا چاہوں گا، ایک لفظ خبیث، اور دوسرا لفظ طاهر۔ "جماع غلبان"

کو قرآنی حکیم میں لفظ بد خبیث، کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات سے یہ بات واضح ہے کہ اس فعل کے نتیجہ میں کینسر (سرطان) ہو جاتا ہے۔ اور کینسر کی انتہائی ردی قسم "سرطان خبیث" سے تعبیر کی جاتی ہے جبکہ دوسری طرف جماع بالنسار، کیلئے "عن اظہرکم" کا لفظ قرآن میں آیا ہے، اور ظہر طہارت یا تطہیر کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ مباشرت بے خطر اور بے ضرر ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے تعدیہ (INFESTIONS) سے محفوظ رہنے کی ضمانت بھی ہے۔

علاج | شبق و غلہ میں سرد و خشک تدابیر کو اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے نیز دافع تقفن کی بھی ہدایت ملتی ہے چنانچہ ان حالات میں اطباء نے جن دواؤں کے استعمال کی طرف انتہائی کیا ہے ان میں اکثر ادویہ ملل اور ام ہنقوی و محرک اعصاب دافع تقفن ہیں۔ ابن الطبری نے تخم سنہالو (فنجنگشت) اور تخم سداب کا سفوف چھانکے کی ہدایت کی ہے۔ نیز تخم کاہوا اور تخم شہدائہ ۴، ۴، ۴ گرام کا استعمال مفید بتایا گیا ہے۔ اس فعل کریمہ سے باز رہا جائے، اس بیماری کی دریافت کو ابھی احتیاطی تدابیر :-

چند ہی سال گزرے ہیں چنانچہ اس سے تحفظ کے لئے امر کی ملک میں اب مریضوں کو خون چڑھانے سے پہلے وائرس H.T.L.V. 3 کی جانچ کرائی جاتی ہے اس کا خیال رکھا جائے کہ بعض کے استعمال میں آنے والی خام اشیاء علیحدہ رکھی

ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ۔ ایک ضابطہ تراشہ پرداز

محمد علاء الدین، استاذ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

جاحظ کی خلقت، ہیئت اور حالات زندگی | جاحظ کا پورا نام ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب ہے جس کا شمار ۱۵۰ ع میں

بصرہ میں علم سے عالم فانی میں چشم کشا ہوا اور وہیں نشوونما پائی۔ ان دنوں بصرہ گہوارۃ علم اور گہوارۃ ادب بنا ہوا تھا۔ اس عالمانہ فضا میں جاحظ نے اصفیٰ اور ابو علیہ جیسے علامہ وقت کے سامنے زانوئے ادب دیکھا جو آسمان لغت و روایت اور تنقید و تبصرہ کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ابواسحاق معزلی سے علم کلام حاصل کیا۔ ان کے علاوہ عرب کے بہت سے انشا پردازوں اور مترجموں سے استفادہ علمی کیا۔ مطالعہ کتب کا شوق اس کو جنون کی حد تک تھا۔ اپنی اس علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے وہ محرردوں اور کاغذ فروشوں کی دکانیں کرایہ پر لے لیتا اور غرق مطالعہ رہتا۔ جو کتاب اس کے ہاتھ لگ جاتی اس کا رس چوس لیتا۔ اسی وجہ سے وہ مختلف علوم و فنون کا راز داں اور انشاء میں طرز جدید کا موجد اور قابل تقلید بن گیا۔

جاحظ کی صورت ایسی تھی کہ شریذ بچوں کو خاموش کرنے کے لئے اس کی تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔ بد شکل چہرہ، بے ڈول جسم اور ابھری ہوئی بدنما آنکھیں اس کی

صورت و حیثیت کا نمونہ ہیں۔ بدو ضحیٰ بھری ہوئی آنکھوں نے ہی اس کو ابو عثمان
 مردے جاحظ را بھری ہوئی آنکھوں والا بتایا تھا۔ اور یہ جاحظیت اس کی ثنائیت
 پر اس طرح چھا گئی کہ خواص کو بھی اس کے اسم اصل کی واقفیت کے لئے بڑی
 دبا دھری کر لی پڑتی ہے۔۔۔ عبدالرحمن جابر سورتنی نے استفادہ حسن زیادت لی
 کتاب تاریخ ادب عرب کے ترجمہ میں صفحہ ۳۶۱ پر ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ جس سے
 جاحظ کی حیثیت کی پرکھ روشنی پڑتی ہے۔ اور اس کی بدشکلی کے مکروہ خود حال واضح
 ہو جاتے ہیں۔

”کہتے ہیں خیمہ متوکل نے جب اس کے علم و فہم کی تعریفیں سنیں تو اسے اپنے بڑے
 کا تائین ماننے کے لئے سرسراہی (بغداد کے قریب ایک شہر ہے) میں اپنے پاس
 بلوایا۔ مگر جب اس کی مکروہ و تشکل دیکھی تو اسے دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔
 راجا کی زندگی کا اکتہ حصہ فارغ البالی اور عیش و عشرت میں گذرا۔ چونکہ وہ اپنے
 فاضلانہ مضامین اور رسائل و خطبات کی وجہ سے قبول خواص تھا۔ مگر ماموں، مقتضی
 واثق اور متوکل کے ہم درمیان معاشی مجبوری اسے بار بار بغداد سے گئی۔ زندگی کے آخری
 حصہ میں وہ فالج کا شکار ہو گیا۔ خود ان پیرن بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ ۳۵۵ھ میں
 وہ اس مہنتی وجہ سے بنی حیات کے سوکے سنا میں دائی اجل کو لبیک کہنے پر
 مجبور ہو گیا۔“

ابو اسحاق نظام معترلی سے تدریس کی وجہ سے وہ اعتزال
 کے سانچے میں داخل کیا تھا۔ وہ مسکد، معتزلہ کی مہم
 پر تھا۔ یہ گمراہ اور مضامین کہتا۔ اور رفتہ رفتہ وہ اس معاملہ میں شدت پسند بننا
 پائیے۔ وہ اسناد و تصدیقات انبیاء کا قال تھا۔ سردر کائنات صلی اللہ
 علیہ وسلم کے عار و صفا و تابعدار و غیرہم کو عام سناؤں کی طرح سمجھتا تھا، اور ان

کے فضل و کمال کے ساتھ ان میں نقائص و شہوات و نفسانیت کا وجود بھی اس کے مسلک میں شامل تھا۔

جاء حظ کا ادبی نظریہ | کتاب علم الادب، مقالات لشاہ میر العرب علی الجوزی الاولیٰ من علم الادب، مجمع الادب لولیع شیخ الیسوی، بیروت ۸۸۶ء کے صفحہ ۲۱۵ پر البحث الرابع فی خواص الکلام الخ عن ابن المعتز والزمانی کے عنوان کے تحت منقول جاحظ کا درج ذیل قول اس کے ادبی نظریہ کی مکمل وضاحت کرتا ہے۔

”قال الجاحظ ان المعنی اذا کان شریفاً وکانت اللفظ بلیغاً وکان صحیح الطبع بعیداً من الاستکراه منزهاً عن الاختلاا، مصوناً عن التكلف صنع فی القلب صنع الغیت فی التریة الکرمیة وصتی فصلت الکلمة عن هذه الشرطیة ولفدت من قائلها علی هذه الصفة کماها الله من التوفیق ومنعها من التایید ما لا یتنع من تعظیمها بصدور الجبابرة ولا ینهل عن فمها مع عقول الجملہ“

جاحظ کے مندرجہ بالا قول سے اس نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ ناقص ادب کو کوڑا دان کی غوراک سمجھتا تھا۔ اور وہ صرف ادب برائے ادب کا قائل نہیں تھا بلکہ ادب برائے زندگی کا حامی تھا۔ چونکہ ادب برائے ادب اپنے تمام اوصاف کے ساتھ صرف ذہنی اور دماغی فرحت و لبثاشت اور سکون و اطمینان کا باعث بن سکتا ہے، دل کو متاثر نہیں کر سکتا۔ یہ خصوصیت صرف ادب برائے زندگی میں پائی جاتی ہے جاحظ ادیب کو ادیب بننے کے لئے نہ صرف قارئین کے قلوب میں اترنے کا قائل ہے بلکہ اپنے ادبی اثرات سے وہ ادیب کو ایسی شمع افروزی کی دعوت دیتا ہے جو قارئین میں انقلاب صالح برپا کر دے۔ صنع فی القلب

صنیع الغیث فی التریبۃ الکریمتہ

اس کے حاسدین | جاحظ اپنی ادبی بلاغت و فصاحت، زور قلم سلاست و روانی اور مضامین مختلف النوع کے اختراع کے باعث معززین و سلاطین وقت کی نگاہوں میں محبوب و مقبول بن گیا تھا۔ اس کی یہ قدر و وقعت اور عزت و عظمت معاصرین کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔ اور وہ جاحظ کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے طرح طرح کے مکر و فریب کرنے لگے۔ جاحظ کو اس کا احساس تھا۔ چنانچہ »الحاسن والاضداد« کے صفحہ اولیٰ پر اپنے حاسدین کے حرکات قبیحہ اور حسد و ڈاہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

»انی رأیت الملک کتاب المحکم الملقن فی الدین والفقه والسائل
والسیرۃ والخطب والخراج والاحکام وسائر فنون الحکمة والنسبۃ الی
نفسی، فیتواطأ علی الطعن فیہ، جماعة من اهل العلم بالحسد المکرب
فیہم وہم یعرفون براعتہ وفصاحتہ«

اس نے آگے چل کر بڑے مزے کی بات یہ کہی ہے کہ امر اوقات کی نظروں میں میری کتابوں کے سقوط کی صرف کوشش ہی نہیں کی جاتی ہے بلکہ حاسدین میری تالیف و تصنیف کو میرے متقدمین جیسے ابن مقفع اور خلیل وغیرہ کے نام موسوم کر کے میری مساعی کو رائیگاں اور مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش سے بھی باز نہیں آتے ہیں۔

»البيان والتبيين« کے محقق و شارح حسن سندوی نے اسی کتاب کے صفحہ ۷ پر اس قسم کی باتیں تحریر کی ہیں جس سے معاصرین کے بغض و عداوت کا پتہ چلتا ہے۔

»وقد یلمز بعضہم بانه کان کثیر الاستطراذات کبیر

التي هانت على الاستشهادات، يحد بها كتب، ويخبر بها أسفاره
ولولا هذا لكانت أقل مباحي عليه.

لیکن انہوں نے لازمین کے الزامات کو بے جا اور لغو قرار دیا ہے اور
سے ان کی کج فہمی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

”وليس الحال كذلك، ولا الأمر على ما ذهب إليه ذلك الأمر،
ولكن هذا الحال أن دلّ على شيء قائم يدل على سعة اطلاع المحاضر
على تجرّده في معارفه وعلى حصول صدره بشتى المسائل والمعلومات،
مگر استاذ احمد حسن زيات نے جاحظ کے کلام کے متعلق بدیع کا قول ”لاحظ
الکلام في إشارة ما بعد، عبارت کا قرب اور استعارہ کی قلت ہے“ نقل کیا ہے
اور فرمایا ہے یہ فیصلہ اگرچہ سخت ہے، تاہم بہت جگہوں پر درست ثابت ہوتا
ہے۔“ (تاریخ ادب عربی از استاذ احمد حسن زيات ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی
صفحہ ۳۶۲)

جاہظ کا مرتبہ علمی و ادبی اعتبار سے اتنا بلند ہے،
جاہظ کا علمی و ادبی مرتبہ | جہاں تک تخیل کی رسائی ناممکن ہے۔ الفاظ اپنی
وسعت کھودیتے ہیں۔ ادباء کا زور قلم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس موڑ پر آکر سب لوگ
پنا قلم شکستہ، اپنے الفاظ تنگ اپنا تصور و تخیل نارسا اور ذہن مفلوج پاتے ہیں
پنا نچہ استاذ احمد حسن زيات نے عہد عباسی کے مختلف انشا پردازوں کے علمی و
ادبی مرتبہ اور قابلیت کا تذکرہ اپنے مختلف الفاظ میں کیا ہے۔ مگر جاحظ کے علمی
ادبی مرتبہ کے تعین میں ان کا قلم تھرا گیا ہے۔ دماغ مفلوج اور ہاتھ مثل ہو کر
رہ گئے ہیں۔ اور انہیں یہ پس ہو کر کہنا پڑا ہے۔

”اس مختصر سے بیان اور کوتاہ قلم میں یہ قوت نہیں کہ وہ نابغہ عرب اور مشرق

کے والٹر کے ادبی تاثرات کو قارئین کے سامنے بیان کر سکے۔ ہمارے لئے صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ”دو نور علم، قوت استدلال، بحث کے تمام پہلوؤں پر احاطہ، مقابلہ میں شدت اور کلام کے دل نشین اور بلیغ ہونے کے باعث وہ اپنے تمام ساتھیوں سے سبقت لے گیا تھا۔“ وہ تمام علوم میں زبردست محقق عالم کی طرح سنجیدہ مضامین لکھتا رہا۔ اور یہی سب سے پہلا عربی عالم ہے، جس نے سنجیدہ و مزاحیہ مضامین کی باہم آمیزش اور گفتگو کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ بہت سی تصانیف چھوڑیں اور حیوانات و نباتات، اخلاقیات و اجتماعیات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ (تاریخ ادب عربی از احمد حمزہ بیات ترجمہ عبدالرحمن سورتی صفحہ ۶۱، ۶۲)

ابن العمید جس کے متعلق لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہو گیا تھا کہ ”انشا پردازی عبد الحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہو گئی۔“ اس نے جاحظ کے علوم و تربیت کو اپنے طرز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

”کتاب الجاحظ تعلم العقل اولاً والادب ثانياً“
حسن سند و بیانیہ کہا ہے۔

”وہل وقفت عبقریۃ الجاحظ عند حد اتفاق المعارف العامة
والثقافات الشائعة، علی تنوعها حتی عهدہ؟ کلا فما کانت ہمتہ تعرف
شیئاً من الحد و دفعی لعرفان؟ من اجل هذا عرض لکثیر من السائل
التي لم یفکر فیہا احد غیرہ وفتح للناس ابواباً کثیرة فی امور شتی لم یمکن
من تقدمہ من العلماء و الکتاب و اهل الادب بحسبونها ما یدخل
فی صنوف الادب۔ (البیان والتبیین صفحہ ۷۸)

اس کے آگے حسن سند و بیانیہ اس کی علویت پر طویل عبارت آرائی کی
ہے۔ سند و بیانیہ کی ایک عبارت سے جاحظ کی عبقریت اور وسیع النظری کی

وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنی جس فکر یا رائے کو ناقص سمجھتا تھا، اس کی تردید میں جھجک یا کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتا تھا۔

» هو اول من وضع كتاباً في فكرة من افكاره وفي رأي من الاسراء ثم نقضه بكتاب آخر، توسعاً منه في البلاغة وتفنناً في البراعة او رجوعاً الى مظنة الحقيقة، التي قد يكون استبحر عليه سبيلها في اول الامر وايشاراً للصواب ولم يكن هذا النوع من المؤلفات التي يراجع نفسه فيها - بعد وصفت الاسراء والتخل والاهواء -

(البيان والتبيين صفحہ ۹)

جاخط کی تالیف : المحاسن والاضداد، ومطبعة المعاهد بجوار قسم الجمالية بالقاهرة (۱۳۵۵ھ) کے **TITLE PAGE** پر اسے »امام اہل الارب« لکھا گیا ہے۔ حسن سند دہلی نے »البيان والتبيين« میں »الجاخط تحليل ادبہ وعلمہ ونفسیتہ« کے تحت جاخط پر جو فاضلانہ اور تفصیلی مضمون لکھا ہے اس سے جاخط کی حیات کے ہر گوشہ پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر اخیر میں چل کر انہوں نے بھی جاخط کی رفعت مقام کی تعیین میں اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے »هذا ما استأيننا من خصائص الجاخط وهي بلا شك شذوذاً من مزاياء - امام الامام بماله من صفات واستيعاب ماله من مناقب وسمات، فامرفوق متناول الايدي والاقلام -

(البيان والتبيين صفحہ ۱۵)

ENVIRONMENT & HERIDITY
ILY, PSYCHOLOGISTS =

جاخط کی اخلاقی پستی

میں سے کون رجال سازی میں زیادہ موثر ہے، اس باب میں عہد قدیم سے اب

تک ایچھے ہوئے ہیں گریہ (WOODWORTH) نے دونوں کے درمیان
جاذبہ اعتدال پیدا کرنے کی کوشش ہے، مگر PACHOLOGISTS کا اس
سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے انسان کے جسمانی روحانی
ارتقاء و انحطاط کا انحصار ماحول اور خاندان دونوں پر ہے۔ مگر جاحظ علمی
اور اخلاقی اعتبار سے ماحول کا پروردہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر بصرہ کی عالمانہ فضا
نے اسے بے نظیرانشا پرداز بنادیا تھا تو وہ بغداد کے عیش پرستانہ ماحول کی وجہ
سے اخلاقی اعتبار سے نہایت پست بھی بن چکا تھا۔

حسن سندوی نے جاحظ کی کتاب «البيان والتبيين»، حقیقۃ و شرحہ حسن
السندوی، میں اپنے مقالہ (لجاء حظ تحلیل ادبہ و علمہ و نفسیتہ)
کے تحت جہاں معترفین کے الزامات کی تردید میں جاحظ کے تبحر معرفت و وسعت
معلومات اور حقول صدر کا سہارا لیا ہے اور اسے راس مذہب فی العقائد کے
ساتھ ساتھ راس مذہب فی الادب بھی قرار دیا ہے وہیں انہوں نے اس
میں اس کی اخلاقی حاکمت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

«اما خصائصه النفسية ووجهات نظره في الحياة فقد كان
على ما ظهر منه ميالا لطبعه الى التحليل من القبول التي تقف بامثاله
ونظراته من معاصريه عند مقتضيات التقاليد وموجبات العادات
فهو لم يشأ اتخاذ زوجة تشاركه بأسأ الحياة وضرائها بل انصرف
الى اتخاذ الجوارى والفتيات يتسرى منهن بما تطيب بهما نفسه و
يصبو اليها حسه بمسكها ما أستمقام أمرها معه» (البيان والتبيين على
حسن سندوی کے آئینہ میں جاحظ حتی الوسع لذات حیات فانیہ سے متعلق
و مشتمع ہونے میں کوشاں نظر آتا ہے۔

» وكان الحافظ يروى الاستمتاع بملاذ الحیاة واطايبها ويطمع في
ان ينال منها ما يمكن ان تصبو اليه، اوسع النفوس البشرية املاً و
غاية»۔ (البيان والتبيين صفحہ ۱۲۷)

مگر تاریخ ادب عربی از استاد احمد حسن زیات ترجمہ عبد الرحمن طاہر سورتی،
مؤسس انجمن ترقی عربی، پاکستان، ناشر غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۱ء کے صفحہ
۳۶۱ میں جاحظ کے اخلاق کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

» جاحظ طرز و مزاج کا خوگر، نیز مردہ رسومات و آداب کی سنسی اڑانے کا عادی
تھاتا ہم وہ نہایت سلیم الطبع، زندہ دل، شگفتہ مزاج، ظریف اور اپنے دوستوں کا
سچا، سہارہ د تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ استاد احمد حسن زیات جاحظ کی ادبی تائینا کی میں اس
کی اخلاقی تاریکی کو نہیں دیکھ سکے یا انہوں نے چشم پوشی کر کے طلبہ ادب عربی سے
جاحظ کے اس تاریک پہلو کو صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ حسن
سند و بی جوا اپنے مقالے میں جاحظ کے بڑے معتقد اور بکے وکیل نظر آتے ہیں اور
انہوں نے مختلف مقامات پر اپنے دلائل کے ذریعہ جاحظ کے دامن کو داغ دار
ہونے سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے قلم کو درج بالا حقیقت کے انکشاف
سے نہیں روک سکے۔ مگر یہ انہوں نے اس کی اخلاقی پستی کا سہرا ماحول کے
سرباندھا ہے۔

» والحق ان عصر الجاحظ كان عصر الاستمتاع بكل ما تعتلج به
النفس الانسانية من امانى و امال، ومن خير و شر، ومن نقص و فضل
ومن علم و جهل و من استقامة و استهتار و من نسل و قتل و من
تقية و استرسال و من ايمان و الحاد و من خطل و سداد، فكانت

بغداد فی ذالک الدھر اشبه بلسان وباریس وپولورک وبرلین
و، وما، مجتمعۃ فی هذا العصر فیہا نزعات العقل وصریح الاسرار و
وصراد العیون، وشہوات النفوس۔ وخلقات القلوب غیر ان الجاہل کان
یتناول شہوات نفسه و نزعات عقله ولدان الذل قلبہ فی تعقل و تطف و
اتفاق۔

جاخط کے صرف ذہنی استمتاع کا سبب اس کی خداترسی نہیں بلکہ تولیدی
صلاحیت کا فقدان تھا جیسا کہ حسن سندوی نے کہا ہے :-
«وقد کان عقبا فلم یعرف الله ولد له ولد»

جاخط کی سوانح عمری میں وقت بینی و دیدہ ریزی کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے
کہ جب تک وہ فارغ البال اور بغداد سے دور تھا۔ اس کے اندر اخلاقی دنیّت
بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ مگر معاشی مجبوری کی وجہ سے بار بار بغداد جانے کی وجہ
سے ایک تو وہ بغداد کی آب و ہوا سے متاثر ہوا نیز اپنے آلام و مصائب اور معاشی
پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ لذات فانی میں غرق ہوتا چلا گیا۔
اور مضطرب شہوات میں المینان و کون کی جستجو میں وہ اخلاقی اعتبار سے پستی
کا شکار ہو گیا۔

انتشار پر دازی مظہر عقل و آئینہ فکر ہے۔ اس کے جام
جاخط کی بحیثیت موجد | جم میں احوال و کوائف وقت کا عکس جھلکتا ہے۔ یہ
سیاست و حضارت سے متاثر ہوتی ہے۔ اور زمانہ کے حالات کے مطابق اس کا
طرز بدلتا رہتا ہے۔ انتشار پر دازی کی اس نیرنگی میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ابھرتی
ہیں۔ جن کے رنگ میں خود کو رنگنا ابا را اپنے لئے باعث فخر و کمال سمجھتے ہیں، جن
کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ متقدمین سے الگ اپنا طرز بیان ہوتا ہے۔ اور جو اس

راہ میں ایسی شمع افروزی کر جاتے ہیں، جس کی روشنی میں متاخرین کی منیاء قلم صفو قرطاس پر کواکب و انجم کی شکل میں منتشر نظر آتی ہے۔

عربی آسمان صحافت و ادبیت پر جاحظ خورشیدی کی طرح طلوع ہوا اور اب تک غروب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی کی درخشائیت کے سہارے اب تک کے عربی انشا پرداز راہ ادبیت میں ردائیں دو ال ہیں۔

عربی انشا پرداز کی میں جاحظ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے متقدمین انشا پردازوں سے الگ طرز جدید کی بنا ڈالی۔ اس میں ایسی راہ ہموار کی جس پر چلتا متاخرین نے باعث سعادت سمجھا۔ اور جاحظ سے لے کر اب تک انشا پردازی میں کوئی ایسی کتاب عالم وجود میں نہیں آئی جو جاحظ کی مرہون منت نہ ہو۔ جاحظ کے بعد کی انشا پردازی کا مطالعہ کنندہ قاضی قاضل کے اس قول کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے :-

«ما صامعاً شراً للكتاب الا من دخل من كتب الجاحظ الحارثية، وشن عليها القارئة، وخرج وعلى كتفه منيها كادرة»
عبد الرحمن بن خلدون نے «مقلد من ابن خلدون» (الطبعة الانزهرية)
جو اس الانزهرية بمصر ۱۹۱۳ء کے صفحہ ۸۹ پر «علم الادب» کے عنوان کے ضمن میں تحریر کیا ہے :-

«وسمعنا من شيوخنا في مجالس التعليم ان اصول هذا الفن واسرارها
اربعة دواوين وهي ادب الكاتب لابن قتيبة وكتاب الكامل للمبرد و
كتاب البيان والبيان للجاحظ وكتاب النوادر لابن علي القالي البغدادي
وما سوى هذه الاربعة فليجوز عنها»

احمد حسن نیا نے عبد عباسی کے انشا پردازوں کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے

اور دوسرے طبقے کا رئیس جاحظ کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

دوسرے طبقے کا رئیس جاحظ ہے۔ عبارت کے آسان اور پر شوکت ہونے میں اس کا اسلوب پہلے طبقہ سے زیادہ مشابہ ہے۔ لیکن اس طبقہ کے اسلوب کی خصوصیات میں ایک جملہ کو بہت سے مقفی یا غیر مقفی فقروں میں توڑنا الفاظ اور جملوں میں اطناب، بات میں بات نکالتے چلا جانا، پڑھنے والوں کی اکتاہٹ دور کرنے کے لئے سنجیدہ اور کٹھوس مضامین میں جنسی مذاق کی آمیزش، مضمون کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنا اور مطلب کو کھٹول کر بیان کرنا عقل و منطق سے ہستلال اور اتنا عبارت میں دعائیہ جملے لانا ہیں۔ اس طبقہ میں قتیبہ، ہمدرد اور صولی ہیں،

ترجمہ عبدالرحمن سورتی صفحہ ۳۷۶

انہوں نے جو تھے طبقے کا سردار قاضی فاضل کو کہا ہے اور جاحظ کی انشا پردازی سے متاخرین کی اثر پذیری قاضی فاضل کے مذکورہ قول سے واضح ہو چکی ہے۔

جاحظ نے مادۃ انشا پردازی میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ ادبی علویت کی ایسی شمع فروزاں کی جس کی صنیا پاشی سے ذرے آفتاب بنتے گئے اور خواص نے انشا پردازی کی کسوٹی جاحظ کی انشا پردازی کو قرار دیا۔

فیقال فی الاسالیب العربیۃ اذا كانت قد بلغت اعلیٰ طبقات البلاغۃ
وآسی منازل البیان وكانت واضحة المعانی مملوءة بالفاظ نقیة الکلمات

» هذه عبارة جاحظية « ويقال فی الوصالۃ جمعت حوالکلام الی التبسط
فی المعانی وكانت کثیرة الافئدة فیما الموضوعات بعضها بدو وانب
بعض ینتقل فیما القاری من فن الی فن ومن لون الی لون، ومن معنی موجد

الی معنی مبتکر هذا ادب جاحظی، (حسن سند ولی البیان والتبیین صفحہ ۷۷)

آگے چل کر حسن سند ولی نے لکھا ہے =

”وما من كاتب منذ عهدنا لم يحفظ الى الآن الا وللمحافظ في عنقه
منة معقودة او يد ميسوطة او نعمة سابقة“
استاذ حسن ریات نے جاحظ کے اختراع و ایجاد کو درج ذیل الفاظ میں
بیان کیا ہے۔

”جاحظ انشا پردازی کو پرانے طریقے سے نکال کر اسے ایک نئے طرز اور جدید موضوع
کی طرف لایا۔ اس نے خط نویسوں، مضمون نگاروں اور مصنفوں کے لئے انشا پردازی
میں ایک نیا راستہ کھولا ہے۔ (ترجمہ عبدالرحمن سورتی صفحہ ۳۶۲)
اس طرح درج بالا مؤرخین و ناقدین کے اقوال سے یہ بات اظہر من الشمس
منجاتی ہے کہ جاحظ انشا پردازی میں ایک موجد کی حیثیت رکھتا ہے اور اب تک عرب
انشا پرداز کسی نہ کسی طرح اس کی اتباع پر مجبور ہیں۔

جاحظ کی تصانیف دو سو سے زائد ہیں۔ اور مستاذ ابن
جاحظ کی تصانیف | العمید کا کہنا ہے ”کتب الجاحظ تعلم العقل
اولاد الادب ثانیاً“

مگر اس کی تصانیف میں سے صرف درج ذیل چار کتابیں مطبوعہ شکل میں موجود
ہیں۔

کتاب البیان والتبيين، کتاب الحيوان، کتاب المحاسن والافساد اور
کتاب البخلاء۔

اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام

کمال جعفری

شاعر مشرق علامہ اقبال نے ہر شعبہ زندگی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری انسانی معاشرہ کے لئے چراغِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں تو انہوں نے کائنات کے مختلف مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کا موضوع انسان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا پیغام مرد اور عورت کے لئے یکساں ہے۔ اردو کے دیگر شعراء کرام نے عورتوں سے متعلق جو انداز فکر اختیار کیا ہے اس کے برعکس اقبال کی فکر و درس بالکل مختلف ہے۔ دراصل اقبال نے قرآن پاک میں مذکور تعلیم نسواں کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ عورت ایک پاکیزہ صنف ہے۔ اگر بے پردگی اور بیجا آزادی عورتوں میں راہ پاجلتے تو انسانی معاشرہ تباہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فرنگی معاشرت پر کھل کر تنقید کی ہے۔ اور عورتوں کی بے بسی کا ذمہ دار مردوں کو ٹھہرایا ہے؟

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں

گواہ اس کی شرافت پہ میں مہ و پروین

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور

کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

اقبال نے جب یورپ کا سفر کیا تو فرنگی معاشرے کا چشم دید شاہدہ کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اہل مغرب نے عورتوں کے معاملے میں جو آزادانہ رکش اختیار کی ہے اس کے اثرات انسانی معاشرہ کے لئے کتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے ہندوستان اور یورپ کی خواتین کا براہ راست موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی خواتین کو یورپ کی خواتین پر فوقیت حاصل ہے۔

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبت
بات جو ہندوستان کے ماہ و سیاروں میں تھی

مذکورہ شعر میں بات کے اندر بے پناہ معنی اور وسعت پنہاں ہے، راقم الحروف کے خیال میں اقبال نے اس ایک لفظ بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستانی خواتین شرم و حیا اور پاکیزگی نفس کے اعتبار سے یورپ کی خواتین کے برعکس کچھ اور ہی خصوصیت رکھتی ہیں۔

در اصل اقبال ہندوستانی معاشرہ میں عورتوں کی ترقی اور نلاح کے خواہاں تھے۔ اقبال سے قبل ہماری قومی شاعری پیغام نسواں سے یکسر خالی تھی۔ ان کو اس بات کا یحدا فسوس ہے کہ ہندوستانی خواتین خواہ نئی ہو یا پرانی دونوں ہی قسم کی تعلیم سے نا آشنا ہیں اور پردہ سے بھی بے گانہ۔ اس سلسلے میں وہ قوم کی غفلت پر نہایت رنج کے ساتھ فرماتے ہیں۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی

نسوانیت زن کا نگہاں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زنہ حقیقت کو نہ پایا

اس قوم کا خورشید بہت جلد بہا زرد

واقعہ یہ ہے کہ اگر فکر اقبال کے مطابق عورتوں کو ہمارے سماج میں جائز

مقام عطا کیا جائے تو مغرب کی کورانہ تقلید سے ہماری عورتیں نجات حاصل کر کے مردوں کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر سکتی ہیں، جس کے فیضان سے ہمارا معاشرہ تہذیب و تمدن کا اعلیٰ نمونہ بن سکتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے کا حال کیا ہے؟ ہمارے شاعر، فلسفی، افسانہ نویس اور صورت گر کے اعصاب پر غورت سوار ہے، اقبال معاشرے کی اس بے حس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
اے بے چاروں کے اعصاب پر غورت ہے سوار

تاریخ ادب اردو کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیوں سے ہمارے ہمارے شعراء محض گل و بلبل کی شاعری پر اپنا قیمتی سرمایہ فکر ضائع کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایسے شعراء کی اکثریت رہی ہے جنہوں نے محض لب و رخسار، کاکل و مڑگاں اور حسن کی بے جا تعریف میں اپنی عمر گنوا دی، حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس برائی سے اردو کا دامن پاک نہ ہو سکا۔ اقبال ہمارے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے سلاج میں موت کے رتبے کو پہچانا اور اس کی حیثیت متعین کر کے آنے والی نسلیں کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کر دیا۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز و درد
خرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شراب فلاطوں

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے تعلیم نسواں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور ایسی تعلیم

جس کے ذریعہ نسوانیت کا خاتمہ ہو جائے، کبھی حمایت نہیں کی۔ اس سلسلے میں ان کا نقطہ نظر بہت واضح ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازان
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و مہر موت

اقبال کے مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمارے بگڑے ہوئے معاشرے کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ آج ہماری درس گاہوں کا حال کیا ہے؟ کو ایجوکیشن کے نام پر تعلیم کا جو حال ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے جہاں تک فکرِ اقبال کا سوال ہے انہوں نے عورتوں کے مقام کا تعین اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ ان سے پہلے غالباً کسی شاعر نے ایسا انداز فکر اختیار نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے برابر آزادی مل جائے تو انسانی معاشرہ تباہ ہو جائے، اگر قدرت کو ایسا کرنا منظور ہوتا تو عورت کو ایک الگ صنف کی حیثیت نہ دی جاتی۔ ہاں عورتوں کے جو جائز حقوق ہیں انہیں بلاشبہ ملنا چاہئے۔ عورت بچوں کی پرورش کے علاوہ امور خانہ دار کی قبول کرتی ہے وہ ہمارے گھروں کو بھرپور روشنی دیتی ہے اور زندگی کے عملی میدان میں مردوں کا شانہ بشانہ ساتھ دیتی ہے۔ تاریخ شاید ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی عورتوں نے مردوں کا ساتھ دیا ہے اس سلسلے میں بطور مثال اقبال کی ایک نظم ”فاطمہ بنتِ عبداللہ“ کا ایک بند پیش کر رہا ہوں جس میں اقبال نے عرب کی ایک غیور خاتون فاطمہ کو دل کی گہرائیوں سے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جانا باز اور جوان سال فاطمہ نے طرابلس کی جنگ ۱۹۱۲ء میں غازیوں کو پانی پلائی ہوئی میدانِ جنگ میں شہادت کا جام نوش

کیا تھا

فاطمہ تو آبروئے ملت مرحوم ہے
ذره ذرہ تیری مشیتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
نا زباں دیں کی ستانی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارتِ آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس ملکِ ان خزاں منظر میں تھی
ایسی چٹکاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے محراب میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبال نے مغربِ ذرا جدید تعلیم اور بے پردگی کی ہمیشہ مخالفت کی اقبال
مشرقِ علوم و فنون کے قائل ہیں۔ وہ مشرقی علوم کو مغربی علوم پر ترجیح دیتے ہیں۔
لہذا تعلیم نسواں سے متعلق اکبر الہ آبادی کے رنگ میں اپنے موقف کا اظہار اس طرح
کرتے ہیں۔

عزیزاں پڑھ رہی ہیں انگریزی

دھونڈاں قوم نے فلاح کی راہ

روشن مغربی ہے مدّ تلخ

و منبعِ مشرق کو جانتے ہیں گمناہ

برہان

مدیر مسئول: عبید الرحمن عثمانی

جلد نمبر ۹۸ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۶ء شمارہ نمبر ۳

- | | | |
|----|--|--|
| ۲ | جیل مہدی | ۱۔ نظرات |
| ۹ | قاضی اطہر مبارکپوری | ۲۔ غیر مسلم اور قرآن سے استفادہ |
| ۲۲ | امیر ادروکی | ۳۔ امام ابو زرہ رازی |
| ۴۶ | سعیدہ خان ایم، ایسے، لکچر شعبہ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۴۔ ایران کی ایک عظیم شاعرہ پروین اعتصامی تبریزی |
| ۵۷ | کمال جعفری | ۵۔ اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام |
| ۵۸ | پروفیسر مولانا محمد تقی الہی | ۶۔ تاریخ دعوت و جہاد برصغیر کے تناظر میں |
| ۶۲ | ایڈیٹر | ۷۔ برہان کا مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن نمبر |
| ۶۳ | منیجر | ۸۔ اپنے محسنوں و کرم فرماؤں سے ایک معذرت و گزارش |

عبید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

سالبت کا شعور کوئی پرانا تصور نہیں ہے، ہندوستان کو متحد کرنے کا خیال سب سے پہلے اورنگ زیب کو آیا، اور اس نے اس مقصد کے لیے آخری ۲۵ سال دکن میں گزارے، اور اس ۲۵ برسوں میں اس کا مقابلہ دکن کی مسلم ریاستوں سے ہوتا رہا جو تقریباً سو برس سے خود مختار چلی آرہی تھیں، اورنگ زیب کی وفات تک اس کا قائم کردہ نظام پختہ چھ برس تک جو کاتوں قائم رہا، اس لیے اس کے جانشین بہادر شاہ اول کے دور پر سولہ اگست سے ۱۷۰۷ء تک کسی جگہ پتہ تک نہیں مل سکا، اس نظام میں، اس وقت آئی جب مغل شاہی خاندان میں اقتدار کے لئے کشمکش شروع ہوئی، اور اس کے بعد طاقت اور صوبیداروں اور سرداروں کی حمایت کا طلب گار ہوا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مغلوں کے حکمران خاندان بلکہ صوبیداروں اور وزیروں میں بھی گروہ بندی اور کشمکش کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا، جس نے طاقت ور صوبیداروں کی خود مختاری، اور حکمرانوں کے اتحاد میں مداخلت کا راستہ صاف کر دیا۔ اسی کشمکش کے دور میں سید برادران، حسین علی اور عبداللہ دربار میں اتنے طاقتور ہو گئے کہ جس شہزادے کو چاہتے بادشاہ بنا دیتے، جس بادشاہ کو چاہتے معزول کر دیتے، لیکن سید برادران کا یہ اقتدار زیادہ دن نہیں چل سکا، اور ۱۷۱۹ء سے

لے کر سنہ ۱۷۷۱ء تک کے گیارہ بارہ برسوں تک طوائف الملوکی کی حالت پیدا کرنے کے بعد دونوں بھائی بالآخر محمد شاہ کے زمانے میں قتل کر دیے گئے۔

اگر نادر شاہ کا حملہ ہندوستان پر نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغل سلطنت محمد شاہ کے زمانے میں سنبھال لے لیتی لیکن سنہ ۱۷۳۹ء میں دہلی کے قتل عام نے عظیم مغل حکمرانوں کے روایتی رعب و داب کو حیثیت کے لیے ختم کر دیا اور صوبوں کی خود مختاری کے اس دور کو شروع کر دیا، جس کی بدولت عظیم مغل حکومت، بغیر ہاتھ پاؤں کے ایک جسد کی طرح ہو کر رہ گئی۔

بنگال میں، جس میں آج کل کے بہار، اڑیسہ اور آسام کا علاقہ بھی شامل تھا، علی وردی خاں نے خود مختاری کا اعلان کیا تو دکن میں نظام نے، جن کی قلمرو میں آج کے کراٹا، مدراس، اور بہار اسٹریٹس کا بیشتر حصہ شامل تھا، دہلی کی مرکزی حکومت سے رشتہ توڑ لیا۔ اودھ میں شجاع الدولہ کی حکومت، کانپور اور فتح پور سے لے کر بنارس تک پھیلی ہوئی تھی، خود مختار ہو گئی تو مغل حکمرانوں کے پاس فی الحقیقت دہلی کے سوا کوئی علاقہ ہی باقی نہ رہ گیا جس میں پنجاب شامل تھا۔ ان علاقوں میں سکھوں کی شورش، اور باقی ماندہ علاقوں میں مرہٹوں کی تنگ و تازنے، ہندوستان کو ٹھیک ٹھیک اسی دور میں چھوٹا چھوٹا جو قطب الدین ایبک کی آمد سے پہلے موجود تھا، اور جس میں اتنی بے شمار حکومتوں میں یہ ملک تقسیم تھا کہ آج باوجود کوشش کے بھی راجاؤں کا نام بھی مؤرخوں کے لیے معلوم کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔

مغل حکومت کے زوال اور مرکزی کے دور میں جو خود مختار صوبے یا ریاستیں بننے

ان کے سامنے ملک کے اتحاد اور سالمیت کا کوئی تصور تھا، اس کا جواب بمشکل ہی اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر صوبیدار نہ صرف اپنی حکومت کے تحفظ اور حدود کو برقرار رکھنے کی فکر سے رنجور نظر آتا تھا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے صوبیدار کوڑک پہنچانے اور موقع ہے تو اس کے علاقے کا کچھ حصہ ہتھیالینے کا کوئی موقع ہاتھ سے دینے پر تیار نہیں ہوتا۔

اس افرا تفری اور آپادھاپی کے دور میں انگریزوں کو اپنی قوت بڑھانے کا جو نہری موقع ملا وہ اس زمانے کی سیاسی صورت حال میں بالکل قدرتی اور منطقی معلوم ہوتا ہے، اسی کشمکش اور خود غرضی، بلکہ صوبیداروں کے درمیان رشک و حسد کی کیفیات کی بدولت اور نگ زیب کی وفات کے صرف پچاس برس بعد انگریزوں نے پلاسی کے میدان میں علی وردی خاں جیسے عظیم کمانڈر اور بے مثال منتظم اور طاقتور حکمران کے جانشین سراج الدولہ کو در ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے بعدل میں ایسی بے بسی کی حالت میں مبتلا کر کے، شکست دی کہ میر جعفر جیسے اس کے خاندان کے بزرگ افراد، اس کے طاقتور امیروں اور فوجی کمانڈروں کے ساتھ مل کر عین حالت جنگ میں اسے تنہا چھوڑ کر الگ جا کھڑے ہوئے۔ اور انگریزوں کی حمایت کے بل پر شجاع الدولہ نے روہیلوں کی برہیلی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

پلاسی کی لڑائی کے بعد ہندوستان کے حکمرانوں کو ایک اور سنہری موقع متحد ہندوستان کی تشکیل کا ملا جب کہ در ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے برہٹوں کا زور توڑ کر ہندوستان کو، اس زمانہ کی سب سے بڑی شورش اور بد نظمی سے محفوظ کر دیا۔ لیکن اس وقت بھی ہمیں، متحد ہندوستان کا کوئی تصور کسی حکمران کے ذہن میں دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس کے اگلے ہی سال جب ۱۷۵۷ء کے باغی اور اس وقت کے بنگال کے حکمران میرقاسم نے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کی امداد اور تعاون کے یقین پر انگریزوں کے

بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی آخری کوشش کی تو شجاع الدولہ نے انگریزوں کی صرف اودھ کی حکمرانی پر قائم رہنے کی ضمانت پر، عین وقت پر بکسر کے میدان سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ عالم اور میر قاسم کو اس فیصلہ کن شکست سے دوچار ہونا پڑا، جس کے نتیجے میں میر قاسم تو سیاسی منظر سے اس طرح غائب ہوتے کہ آج تک ان کے انجام کا پتہ نہیں چلا اور بکسر کے میدان میں شکست یافتہ شاہ عالم بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں انگریزوں کے وظیفہ خوار بن کر کٹھ پتلی حکمران کی حیثیت پر اکتفا کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔

اگر سچ پوچھئے تو ہندوستان سے مغل حکمران کا خاتمہ ۱۷۶۵ء میں اسی وقت ہو گیا تھا جبکہ الہ آباد کے صلح نامہ کے ذریعہ شاہ عالم نے سیاسی اقتدار انگریزوں کے حوالے کر کے، ایک وظیفہ خوار بادشاہ کی حیثیت سے لال قلعہ میں سکونت اختیار کرنے پر رضامندی دیدی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک ایسا منطقی عمل تھا، جس کی بدولت مغلوں کی سبھی سربراہی کی حیثیت رفتہ رفتہ مٹنے کا کام تکمیل تک پہنچا۔

۱۷۶۵ء کے ۳۰ سال بعد ہمیں، دور جنوب کی میسور حکومت کے دو حکمرانوں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی حکمت عملی اور فکر و نظر کے دائروں میں ملکی سالمیت کے دھندلے تصور کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، جنہوں نے انگریزی اقتدار کے خاتمہ کو پہلی ترجیح دیکر ان کے خلاف ایک طویل مہم چلائی اور حیدر علی کی جنگی مہارت کے طفیل، چند دنوں کے لیے انہما بر ایسا محسوس بھی ہونے لگا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دن ختم ہونے کے قریب پہنچ گئے ہیں، لیکن حیدر علی کی زندگی نے وفا نہیں کی، اور ان کا عین اس وقت انتقال ہو گیا جبکہ وہ مدراس اور ارکاٹ میں انگریزوں کو فیصلہ کن شکستیں دیکر، اگلے محاذ کی طرف پیش قدمی کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کے بعد ٹیپو سلطان کی طرف سے افغانستان، ترکی کے حکمرانوں یہاں تک کہ فرانس کے حکمران

اور یورپ کے قارئین بننے والے انگریزوں کے خلاف فوجی مدد کی درخواستوں کے ساتھ سفارتوں کی روانگی سے البتہ اثر پیدا ہوتا ہے، جیسے انہوں نے پورے ہندوستان کی سالمیت کے تصور کے ساتھ اپنے عمل و کار کا دور رس نکتہ مرتب کر رکھا ہوا، لیکن اور کسی طریقہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ فی الواقعہ میسور کی حکومت کے تحفظ کے علاوہ پورے ملک کا مفاد ان کے مد نظر ہو۔ ان کی آخری تقریر سے بھی پتہ شمع نہیں ہوتا کہ انہوں نے میسور کے ہوا متحدہ ہندوستان کے تصور پر اپنی جد جہد کی بنیاد رکھی تھی، انہوں نے انگریزوں کے ساتھ شری رنگ پنہ کے قلعہ کے باہر دست بدست جنگ میں شہید ہونے سے تھوڑی دیر پہلے اپنے اعلیٰ ان حکومت کے سامنے، جن میں ان کے غدار کمانڈر میر صادق، اور وزیر مالیات چرنیہ شامل تھے، آخری خطاب میں اپنے وفادار اور قابل ترین کمانڈر سید غفار کی شہادت کے بعد کہتی کہ

”سید غفار شہید ہو گیا ہے۔ سید غفار کبھی نہیں ڈرے اور آخری دم تک وفادار رہا، سب سے بڑی سبب اس کی جد سنبھال لے۔ مابعد دولت کو معلوم ہو گیا ہے کہ غلطی کہاں ہوئی، اور شری رنگ پنہ کا یہ قلعہ کیسے غداروں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر افسوس یہ سب کچھ بعد از وقت ہے۔ میں تمہارے درمیان موجود نہیں ہوں گا، مگر اس غدار کی کانتیو تمہیں اس وقت معلوم ہو گا جبکہ تمہاری سلیں اس ملک میں محتاج و ذلیل بن کر ایک ایک مٹھی جاول اور پیاز کی ایک ایک ڈلی کو ترسیں گی۔“

یہاں سب بات بلکہ اس نکتہ کو بھی بوری طرح ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ انگریزوں نے میسور کی آخری رٹائی سے زیادہ تیاریوں کے ساتھ کوئی رٹائی نہیں لڑی۔ ہمارے پاس جو بھی تاحی شہادتیں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شری رنگ پنہ کے

محاصرہ کے وقت انہوں نے صرف اندر کے دغا بازوں اور غداروں کی اعانت اور آلہ کاروں کی تخریبی کارروائیوں پر بھروسہ کرنا کافی سمجھ کر، نظام حیدرآباد کے علاوہ شمال کی اودھ حکومت سے بھی باقاعدہ امداد طلب کی تھی، اور اودھ اور نظام کی باقاعدہ فوجیں ان کے ساتھ مشرقی رنگ پٹنم کے محاصرہ میں شامل تھیں، ۱۷ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان کی شہادت اور میسور حکومت کے خاتمہ کے بعد، اودھ حکومت کی طرف سے فوجی کمانڈر ہنری مارٹن، اور نظام حیدرآباد کی طرف سے میر عالم کی جو عزت افزائی ہوئی اور انہیں انعام و اکرام سے جس طرح سرفراز کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سالمیت کا تصور اس وقت کتنا کمزور اور معدوم ہو چکا تھا۔

ایک جملہ معززہ کے طور پر یہ بات کہنے میں حرج نہیں ہے کہ ہنری مارٹن نے انگریزوں اور اودھ حکومت سے ملی ہوئی انعامی رقم سے مارٹن یوروہ کی بستی بسائی، اور وہ لا مارٹن اسکول قائم کیا جو آج ہندوستان بھر میں انگلش میڈیم کا ممتاز تعلیمی ادارہ سمجھا جاتا ہے اور میر عالم نے اپنی انعامی رقم سے تالاب میر عالم نام کا وہ تالاب تعمیر کر دیا جو کچھ دلوں پہلے تک حیدرآباد اور سکندرآباد کے جڑواں شہروں میں عوامی آب رسانی کا واحد ذریعہ تھا۔

جہاں تک انگریزی حکومت نے اس کام اور ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے استقلال کا سوال ہے تو یہ کام میسور کی زلمانی کے نتیجے میں پورا ہو چکا تھا، اس کے بعد کے جتنے واقعات ہیں، وہ پرانے نظام کی باقیات کے خاتمہ کے مقصد کے تحت کیے گئے، جہاں تک شہزادہ کی عوامی جنگ آزادی کا سوال ہے۔ تو اس میں بھی مندرجہ ہندوستان اور سالمیت کے تصور کی کارفرمائی کی کوئی عدم موجودگی نہیں تھی، اول تو یہ ساری جدوجہد شمالی ہندوستان تک محدود رہی، راجستھان، پنجاب، اور جنوب کی ریاستوں میں اس جدوجہد کا نہ تو کوئی اثر تھا، نہ ہی اس علاقوں کا کوئی حکمران اس جدوجہد

میں شریک تھا، اس کے برعکس پٹیارہ ناچھ، کمپور کھنڈ، جے پور، جودھ پور، جیسلمیر، گوالیار بلکہ نپال تک کی فوجوں نے اس بغاوت کو کچلنے میں پورا حصہ لیا۔ اور اسی لئے انگریزی فوج کے ساتھ گورکھوں، راجپوتوں، مراٹھوں، اور سکھ رجمنٹوں کی لیٹ مار کی داستانیں بھی ماضی قریب تک بڑے بوڑھوں کی زبان پر رہی ہیں۔

الٹا نقاب کی موجودگی میں، یہ بات شہر سے بالاتر معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کی سالمیت اور یہ ملک کا تصور، انگریزوں نے پیدا کیا، اور مغل دور میں صرف اورنگزیب عالمگیر ایک ایسا بادشاہ تھا، جس نے ہندوستان کے سیاسی تشخص اور ایک ملک کے تصور پر کام کیا تھا اور اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں اپنی زندگی کے آخری ۲۵ برس گزارے تھے، اور آخری عمر میں اس مفہم کو حاصل بھی کر لیا تھا۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں میں، کوئی اس قابل نہ ہوا کہ اس تصور کو باقی رکھ سکے۔

انگریزوں نے البتہ متحد ہندوستان کے تصور کو اپنی سیاسی اور سامراجی مصلحتوں سے اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ اس کے ساتھ انتظامی ہولتوں کے لیے برما، سیلون اور عدن تک کو، ہلی کے مرکزی انتظامیہ میں شامل کر رکھا تھا، اور انہوں نے ہی افغانستان، نیپال، چین اور روس کے متوقع حصوں اور خطروں کے مقابلہ کے لیے شمالی مشرقی، اور شمالی مغربی ہندوستان کی سرحدیں معین کی تھیں، اسی احتیاطی تدبیر کے سلسلے میں وہ مشہور میکسوہن لائن بھی انہوں نے ہی مقرر کی تھی جو بعد میں ہند چین تنازعہ کا سبب بنی، اور آج تک چلی آرہی ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی تشخص متحد ملک اور سالمیت کا تصور بھی، ویسا ہی نیا اور انگریزوں کا قائم کردہ ایک تصور ہے، اور جمہوری نظام ہائی کورٹ، سپریم کورٹ، ڈاک تار کے نظام، ورریلوے کی طرح ان چیزوں میں ہے، جو انگریزوں سے نئے ہندوستان کو بریت میں ملی تھیں۔

غیر مسلم اور قرآن کے استفادہ

(قاضی اطہر مبارکپوری)

اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں جو اہم عالمی مسائل درپیش ہیں، ان میں غیر مسلموں کے قرآن مجید چھونے، اس کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اِدھر پچھلی چند دہائیوں سے پوری دنیا خصوصاً یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اسلام فہمی کے لیے براہ راست مطالعہ کا ذوق اور داعیہ بڑھ رہا ہے، اور اس کے اصل منبع و ماخذ یعنی کتاب و سنت اور قدامت کی تصانیف سے اسلامی عقائد و اعمال کی جستجو عام ہو رہی ہے کیونکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ مستشرقین اور ان کے ہم ذوق اہل علم نے اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، خلاف واقعہ یا ناقابل ہے، اس صورت حال کے نتیجہ میں یورپ وغیرہ کی عام درس گاہوں میں عربی زبان اور تحقیقات اسلامی کے مستقل شعبے کھل رہے ہیں، یہ بات بہت خوش آئند اور امید افزا ہے کہ خود غیر مسلموں میں اسلامی فہمی کا ذوق ان کو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بہت قریب کر رہا ہے، ایسی حالت میں ہم مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے، اور اسلام فہمی کی راہ میں ان کے لئے آسانی پیدا کی جائے، خاص طور سے

۱۔ یہ مقالہ ہمدرد فونڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام تیسری عالمی قرآن کانفرنس منعقدہ راولپنڈی میں ۲۴ نومبر ۱۹۸۳ء کو پڑھا گیا۔

ان کے پاس قرآن پہونچانے اور اس کو صحیح طور سے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا جائے۔

کئی سال ہوئے بمبئی میں ہمارے پاس جنوبی افریقہ (جوہانبرگ) سے اس سلسلہ میں لمبا پوڑا استفادہ آیا تھا جس میں یہی سوال تھا کہ ہمارے یہاں کے یورپین اور افریقین ہم سے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے طور پر اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں، ان میں اسلام فہمی کا شوق حد سے زیادہ ہے، جب سے یہاں کے مسلمانوں میں دینی شعور بیدار ہوا ہے اور ان کی بستیوں میں اسلامی اور دینی فضا پیدا ہو رہی ہے غیر مسلموں میں یہ ذوق بڑھتا جا رہا ہے، ایسی صورت میں ہم ان غیر مسلموں کو پورا قرآن یا اس کے اجزاء مع ترجمہ کے دے سکتے ہیں، یا نہیں؟ اس کے جواب میں ہم نے اس وقت لکھا کہ قرآن کا ترجمہ دیا جاسکتا ہے، اور اسی وقت سے اس مسئلہ میں مزید تحقیق و تلاش جاری رہی،

حالات کی تیز رفتاری اور ضرورت کی شدت نے بڑی حد تک قرآن کریم کو غیر مسلمانوں کے ہاتھ میں پہونچا دیا ہے اور وہ اپنے طور پر اس کو پڑھنے اور سمجھنے لگے ہیں، ان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کی تعلیم ہو رہی ہے اور دراساتِ اسلامیہ کا شعبہ قائم ہے، ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، اور کتاب و سنت اور سلف صالحین کے قول و فعل سے روشنی حاصل کی جائے،

قرآن مجید کے ادب و احترام پر ہر مکلف مسلمان کا عقیدہ و عمل ہے، اور عام مسلک یہی ہے کہ محدث اور غیبی مسلمان اور غیر مسلم قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے، البتہ محدث یعنی بے وضو مسلمان اس کو پڑھ سکتا ہے،

اس سلسلہ میں سورۃ واقعہ کی یہ آیات قابل توجہ ہیں جن کے بارے میں علماء سلف کے مختلف اقوال ہیں،

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ ۖ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ
لِّتَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ۚ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ
فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۚ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ
تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے پھینے
کی اور اگر تم غور کرو تو یہ بڑی قسم ہے کہ یہ
ایک مکرم قرآن ہے جو محفوظ کتاب میں ہے
اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں
لگائے پاتا ہے، یہ رب العالمین کی طرف
سے بھیجا ہوا ہے۔

جمہور صحابہؓ، تابعین اور سلف کا قول ہے کہ لا یمسہ الا المطہرون اس
قرآن کے بارے میں ہے جو عند اللہ اور آسمان میں ہے، اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں،
یعنی اس آسمانی کتاب الہی کو صرف فرشتے ہاتھ لگاتے ہیں، سورہ عبس کی ان آیات
سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

فَمِنْ شَأْنِ ذِكْرِكَ ۖ فِي صُحُفٍ مُّكْرَمَةٍ
مُّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۚ بِأَيِّدِ سَفَرَةٍ
كِرَامٍ بَكْرَةٍ ۚ

سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے وہ
ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں، رفیع المقام
ہیں، مقدس ہیں، جو ایسے لکھے والوں کے
ہاتھوں میں ہیں کہ وہ مقرب نیک ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور
جہاد، عکرمہ، ضحاک، سعید بن جبیر، ابو شعار، جابر بن زید، ابو نہیک، ابو العالیہ، قتادہ
حماد بن سلیمان، اسماعیل مدنی، عبدالرحمن بن زید بن اسلم وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔
دوسرے علماء کا قول ہے کہ لا یمسہ الا المطہرون میں مطہرون سے مراد جنابت
اور حدیث سے پاک لوگ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کو جنبی اور محدث ہاتھ نہ لگائے،
ان کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت میں اگرچہ خبر دی گئی ہے مگر اس کا مطلب دمعنی طلب
ہے اور قرآن کریم سے مراد مصحف ہے جو لکھا اور پڑھا جاتا ہے، صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے علاقہ میں قرآن لے کر سفر کرنے سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ دشمن اس کو پا جائے گا، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے عامل حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جو مکتوب روانہ فرمایا تھا اس میں درج تھا۔ ان لا یمس القرآن الا طہراً، یعنی قرآن کو صرف طاہر پاک شخص ہاتھ لگائے، سہ

اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جس میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے کہا کہ جو کتاب تم لوگ پڑھ رہے تھے مجھے دو، تو بہن نے کہا کہ "انک حبس وانہ لا یمسہ الا المطہرون" یعنی تم ناپاک ہو اور اس کو پاک ہی لوگ ہاتھ لگاتے ہیں، فقہم فاغتسلوا و ترضوا فتوضا ثم اخذ الکتاب فقرأ کا، یعنی تم اٹھو غسل یا وضو کرو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے وضو کیا اور قرآن کو پڑھا، دوسری روایت میں غسل کرنے کی تصریح بھی ملتی ہے، چنانچہ قاضی ابن عربی مالکی نے احکام القرآن میں واغتسلوا واسلم لکھا ہے یہ

حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک مرتبہ بغیر وضو کے قرآن پڑھا مگر اس کو ہاتھ نہیں لگایا، حضرت سعدؓ نے اپنے لڑکے کو قرآن پھونے کے لئے وضو کرنے کا حکم دیا، حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی مروی ہے، اور امام حسن بصریؒ، امام نخعیؒ بغیر وضو کے مس قرآن مکروہ سمجھتے ہیں۔ فرار نے سب سے الگ اور ظاہری معنی سے ہٹ کر کہا ہے آیت لا یمسہ الا المطہرون کا مطلب بیان کیا ہے کہ لا یجد طعمہ ونفعہ الا من امن بہ،

۱۔ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۸، ۲۔ احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۲۳۲

۳۔ احکام القرآن حصص ج ۳ ص ۵۱۱۔

۴۔ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸۔

قرآن کی چاشنی اور لذت اور اس کا نفع وہی شخص پائے گا جو اس پر ایمان لائے۔
 قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب کہ قرآن کی لذت وہی
 لوگ پاسکتے ہیں جو گناہوں سے پاک اور تائب و عابد ہیں صحیح ہے، امام بخاری نے اس
 کو مختار بتایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی لذت اس شخص نے
 پائی جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اور دین اسلام کی حقانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی
 نبوت پر راضی ہوا مگر یہ توجیہ بغیر عقلی اور سمعی دلائل کے ظاہر سے عدول ہے، لہ
 قاضی ابوبکر احمد بن علی جبتا صحنی ہستوفی سنہ ۳۳۰ھ میں مذکورہ آیت کے بارے میں
 لکھتے ہیں کہ اگر آیت کو خبر محمول کیا جائے تو اولیٰ یہ ہے کہ اس میں وہ قرآن مراد ہو جو اللہ تعالیٰ
 کے یہاں ہے اور مظهر دن سے مراد ملائکہ ہیں، اور اگر آیت کو نہی یہ محمول کیا جائے اگرچہ
 یہ بصورت خبر ہے تو ہم سب کے بارے میں عام ہوگی، اور یہی اولیٰ ہے اس لیے کہ صریح
 روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن جزم کے پاس جو تحریر روانہ فرمائی
 کھلی اس میں "وَلَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ" تھا۔ اور یہ بھی اسی آیت کی وجہ سے
 ہوگی کیونکہ اس میں نہی کا احتمال ہے۔

یہ ساری بحثیں مسلمان محدث اور جنہی کے مستقران کے بارے میں ہیں جو مکلف ہیں
 اور جن پر شرعی احکام لاگو ہوتے ہیں اسی کے ساتھ قرآن جہاں ہدیٰ للمتقین ہے وہیں
 "ہدیٰ للناس" بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین تک قرآن کی اُوار
 پہنچانے میں جو جدوجہد فرمائی ہے اور اس راہ میں جو مصائب برداشت کیے ہیں ہماری
 نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں، دربار رسالت میں جو وفود دین نہی کے لئے آئے ہیں کُل

کے لیے جواب تمام آپ نے فرمایا ہے وہ بھی معلوم ہے، اُن کی دلداری، پذیرائی، اس لیے
تھی کہ وہ خود دین کی سمجھ حاصل کرنے کے لیے آتے تھے، حتیٰ کہ جو حربی مشرک اور
کافر قرآن سننے اور سمجھنے کے ارادے سے آتے تھے ان کو اپنی زبان میں رکھ کر قرآن
سناتے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ
فَاجْرِهِ حَتَّىٰ تَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ، ثُمَّ
أَبْلِغْهُ مَأْمَرَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ
قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ۝

اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے آپ سے
پناہ چاہے تو آپ اس کو پناہ دیدیں، تاکہ وہ
کلام اللہ کو سن لے، پھر اس کو اس کی پناہ کی
جگہ پہنچا دیں، یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ
لوگ علم نہیں رکھتے،

امام ابو بکر صلی اللہ علیہ وسلم لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کافر جب ہم سے
دین کی حجت اور توحید و رسالت کے دلائل طلب کرے، تاکہ حجت اور دلیل کی روشنی میں
توحید و رسالت کو تسلیم کرے، تو ہم پر اقامت حجت، اور اللہ تعالیٰ کی توحید، اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بیان کرنا ضروری ہے، اور ایسے حربی کافر کا قتل کرنا جائز
نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کو امان دینے کا حکم دیا ہے تاکہ کلام اللہ کو سننے، اس
کے بعد لکھتے ہیں:

وَفِيهِ الدَّلَالَةُ لِذِي الصُّلَّةِ عَلَىٰ أَن عَلَيْنَا
تَعْلِيمَ كُلِّ مَنِ اتَّخَذَ مِنَّا خَرِيفًا مِّثْلًا
مِّنَ امْرَأَتِ بْنِ، لِأَنَّ الْكَافِرَ
الَّذِي اسْتَجَارَنَا لِيَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ إِنَّمَا
قَصْدُ الْمَأْمَرِ حَرْفَةُ صِحَّةِ الدِّينِ ۝

نیز اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ
جو شخص ہم سے دین کی کوئی بات معلوم کرنا
چاہے، ہم پر ایسے تمام لوگوں کو تعلیم دینا فرض
ہے، کیونکہ جس کافر نے کلام اللہ سننے کے
لئے ہم سے پناہ و امان چاہی ہے اس کا مقصد

دین کی صحت کی معرفت ہی ہے۔

موجودہ دور میں بہت سے غیر مسلموں کے بارے میں تقریباً یہی صورت حال ہے کہ وہ تحقیق کے لئے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور گویا ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو قرآن کی تعلیمات اور توحید و رسالت کے بارے میں بنیادی باتیں بتائی جائیں، اس لئے ان کی پذیرائی، دلداری اور تالیف قلب کے ساتھ اسلام کے اصل منبع و ماخذ تک ان کے لئے راہ پیدا کرنی چاہیے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے غیر مسلم کے مستحق قرآن کا مسئلہ سامنے آتا ہے، ظاہر ہے کہ عام حالات میں غیر مسلم کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، جبکہ وہ اپنے طور پر قرآن چھوتے اور پڑھتے ہیں۔ چنانچہ امام ابو بکر حبشہؓ نے مشہور تابعی امام ابو قتادہ بن دعامہ سدوسی بصریؒ متوفی ۱۱۷ھ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

وقال قتادة: لا يمسه عند الله، الا المطهرون فاما في الدنيا فانہ يمسه المجوسی، والنجس، والمنافق۔
جو قرآن عند اللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے ہیں اور جو دنیا میں ہے اس کو مجوسی اور ناپاک اور منافق بھی چھوتا ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے بھی حضرت قتادہ کا یہ قول معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے:

لا يمسه عند الله، الا المطهرون فاما في الدنيا فانہ يمسه المجوسی، والنجس، والمنافق۔
جو قرآن عند اللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے ہیں اور جو دنیا میں ہے اس کو نجس مجوسی اور ناپاک منافق بھی چھوتا ہے۔

۱۔ احکام القرآن ج ۳ ص ۵۵۔

۲۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۹۸۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول صورت حال کی خبر اور بیان واقعہ کے طور پر ہے، یعنی ان کے زمانہ میں بصرہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں جو غیر مسلم اور مجوسی وغیرہ آباد تھے اور مسلمانوں سے ان کا اختلاط تھا، وہ اپنے طور پر بوقت ضرورت قرآن کو ہاتھ لگانے اور پڑھتے تھے، جیسا آج بھی یہ صورت ہے کہ غیر مسلم تابعین و ناشرین قرآن مجید کی طاعت کرتے ہیں، اور ایسے ادارے اپنے طور پر اس کا احترام بھی کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام سے پہلے مصحف کو ہاتھ لگانے کے لیے جو وضو یا غسل کیا تھا ظاہر ہے کہ وہ بحالت کفر تھا اور اس کا مقصد ظاہری صفائی اور ستھرا پن تھا، غالباً اسی ظاہری صفائی کے پیش نظر ائمہ احناف میں امام محمد نے غسل کے بعد نصرانی کے مس قرآن کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ درمختار میں ہے:

وَمَنْعَ النَّصْرَانِي مِنْ مَسِّهِ، وَحُوزُهُ
عَلَى إِذَا اغْتَسَلَ، لَمْ
مَسَّ قُرْآنَ سَ نَصْرَانِي كَوْرُو كَا جَائِے كَا،
اور امام محمد نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔
جبکہ وہ غسل کر لے،

نیز اسی زمانہ میں کوفہ کے بعض اہل تابعین اور ائمہ یمن نے نصاریٰ سے اپنے لیے قرآن لکھوایا تھا، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے نصاریٰ کی ظاہری صفائی پر اعتماد کر کے یہ کام ان سے لیا تھا، چنانچہ امام ابوہریرہؓ نے اپنے استاد امام علقمہ بن قیس نخعیؓ کو فی مشو فی مس۶۲ ص ۶۲ کے متعلق بیان کرتے ہیں:

إِنَّهُ كَانَ إِذَا سَادَّ أَنْ يَتَخَذَ مَصْحَفًا
مِنْ نَصْرَانِيًا فَنَسَخَهُ، لَمْ
جب ان کو مصحف کی ضرورت پڑتی تو
ایک نصرانی کو حکم کرتے اور وہ ان کے

لَمْ يَدْرُ مَخْتَارٌ مَعَ الشَّامِيِّ ج ۱ ص ۱۸۳

لَمْ يَدْرُ: الْمُحَلِّي ابْنُ حَبِيبٍ ج ۱ ص ۸۴

لیے لکھ دیا کرتا تھا،

اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علقمہؓ اس عیسائی کاتب سے بار بار مصحف لکھوایا کرتے تھے، اور اس پر ان کو پورا اطمینان تھا۔

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ علماء ربانیین میں سے تھے، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر اہل صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، حضرت ابن مسعودؓ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور علم و عمل، سیرت و کردار میں ان کے مشنخ تھے، ان کے حلقہ درس میں حضرات صحابہ شریک ہو کر دینی سوال کرتے اور فتویٰ پوچھتے تھے۔

اسی طرح حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰؓ کو فی مشہد ہجے نے مقام حیرہ کے ایک نصرانی سے اجرات پر قرآن کی کتابت کرائی تھی، مصنف عبدالرزاق، باب بیع المصاحف میں ہے۔

ان عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کتب
لہ نصرانی من اهل الحیرة
مصنف السبعین درہما ۲۰
عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے لیے حیرہ کے
ایک نصرانی نے ایک مصحف شتر درہم
میں لکھا تھا،

حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰؓ کو ذہ کے کبار تابعین اور ثقات اسلام میں سے ہیں، ایک سونٹیل صحابہ کی صحبت و معیت سے فیضیاب ہیں، ان کے حلقہ درس میں بھی حضرات صحابہ تشریف لاتے تھے، جن میں حضرت براء بن عازبؓ بھی ہوا کرتے تھے، یہ حضرات نہایت خاموشی اور ادب کے ساتھ ان سے احادیث سناتے تھے، وہ

مشہور امام محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کے والد ہیں۔ ۱۵

ان حضرات کے اس عمل پر معاصر ائمہ دین کی طرف سے کسی قسم کی نکیر کا پتہ نہیں چلتا، حالانکہ اس دور میں ہر جگہ علماء و فقہاء اور محدثین کا جم غفیر موجود تھا اور مختلف فقہی مسائل میں اختلاف رائے ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ نصرانی کاتب سے قرآن لکھوانے میں ال کی ظاہری پاکی و صفائی کا لحاظ رہتا رہا ہوگا، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ میں یہی بات تھی، اور ایسی صورت میں وہ نصرانی کاتب قرآن کو چھوٹے اور پڑھتے تھے۔ اس کے باوجود عہد سلف میں بلا کسی شرط و قید ہر محدث و جنبی اور غیر مسلم کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانے اور پڑھنے کے جواز میں کوئی صریح قول نہیں ملتا، البتہ حضرت قتادہؓ کا قول: "فامتن فی الدنیا فانہ یحسبہ الجوسنی والنجرس والمنافق" بتاتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں قرآن کو غیر مسلم بھی ہاتھ لگاتے تھے۔ بعد میں پانچویں صدی کے مشہور نفاہر کی امام و عالم ابن حزم اندلسیؒ متوفی ۵۰۵ھ نے ہر بلا کسی قید و شرط کے علی الاطلاق اس کے جواز کے قائل ہیں اور محدث، جنبی اور کافر و مشرک سب کے لیے قرآن چھونے اور پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں، اور عدم جواز کے تمام دلائل کا رد کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

جنبی کے لیے مستقر قرآن کو ناجائز قرار دینے والوں نے جن آثار سے استدلال کیا ہے، ان میں سے کوئی صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ یا مرسل ہے، یا غیر مستند صحیفہ ہے، یا اس کا راوی جہول ہے، یا ضعیف ہے۔ ۱۶

اور اپنے اس قول کے استدلال میں مکتوب نبوی بنام ہرقل کو پیش کیا ہے۔

میں قرآنی آیات ہیں اور نہاری نے ان کو ہاتھ لگایا اور پڑھا ہے، یہ
مکتوب مبارک صحیح بخاری کتاب بدر الوحی میں یوں درج ہے۔

”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدَ اللَّهِ، وَرَسُولِهِ إِلَى
مُرْقَلٍ عَظِيمٍ الرُّومِ، سَلَامٌ عَلَى مَنْ أَتَى لَهْدَى، إِمَامٍ بَعْدَ قَاتِلِ أَعْوَالِهِ،
بِدَعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمَ تَسْلِمٌ يُوْتِيهِ اللَّهُ أَجْرَهُ مَرْقَيْنِ، فَإِنْ
وَلَيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيسِيِّ، وَإِنَّا أَهْلُ الْكِتَابِ نَعَالُو إِلَى
دِينِهِ سِوَايَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِلَّا نَعْبُدُ إِلَّا اللَّهَ، وَلَا نُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا، وَلَا
يُخَلِّدُ بَعْضُنَا بَعْضًا إِنْ بَايَعْنَا مِنْ دُونِ اللَّهِ، فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا
أَنَّا مُسْلِمُونَ“ ۸۵

اس مکتوب نبوی کو نقل کر کے ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ہیں جنہوں نے نہاری کے پاس یہ مکتوب روانہ فرمایا جس میں یہ آیت ہے
”لَا تَلْمِزْهُمْ أَشْيَاءَ“ کہ وہ اس مکتوب کو ہاتھ لگائیں گے، لہ
اس مکتوب کے پیش نظر بعض علماء مجنبی کے لیے ایک دو آیات پڑھنے اور دشمن
مملکت میں قرآن کے بعض اجزاء بھینچنے اور اس کے ساتھ سفر کرنے کے قائل ہیں، لہ
غیر مسلم کو قرآن کی تعلیم دینے کے بارے میں علماء سلف کے مختلف اقوال ہیں۔
لفظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے کافر کو قرآن کی تعلیم سے مطلقاً منع کیا ہے،
یہ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، امام شافعیؒ کے اس بارے میں دو اقوال ہیں۔
بعض مالکی علماء نے غیر مسلم پر دین کی حجت قائم کرنے کے لیے قرآن کی مختصر تعلیم

جائز قرار دی ہے، اور ضرورت سے زیادہ تعلیم سے منع کیا ہے، انھوں نے مکتوب نبویؐ بنام ہرقل سے استدلال کیا ہے، آخر میں لکھا ہے کہ =

وقد نقل النودی الاتفاق علی جوانہ
الکتابۃ الیہم بمثل بذلک
امام نوویؒ نے نصاریٰ وغیرہ کے پاس
اس قسم کے خط لکھنے پر علماء کا اتفاق نقل
کیا ہے،

حنفیہ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ غیر مسلم کے لیے قرآن کی تعلیم مطلقاً جائز سمجھتے ہیں، درمختار میں ہے،

وینتج النص فی من مسہ، وجوزہ
محمد اذا اغتسل، ولا بأس بتعلیمہ
القرآن والفقہ علی ان یجتہدی علیہ
نصرانی کو مس قرآن سے روکا جائے گا، اور
امام محمدؒ اس کو جائز قرار دیتے ہیں جبکہ وہ
غسل کرے، اور اس کو قرآن اور فقہ کی
تعلیم دینے میں کوئی ممانعت نہیں ہے، ہو سکتا
ہے کہ وہ اس سے ہدایت پا جائے،

علمائے ہند میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے غیر مسلم کو صرف ترجمہ قرآن دینا
جائز قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن مجید کا حکم
رکھتا ہے، اور غیر مسلموں کو تبلیغ کے لئے دینا جائز ہے۔

(الحاصل غیر مسلم کے ہاتھ میں قرآن کریم دینے اور اس کو قرآن کریم کی تعلیم دینے
کے بارے میں "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے سے پہلے غسل با وضو کے بعد قرآن

۱۔ فتح الباری ج ۶ ص ۱۳۲۔

۲۔ در المختار ج ۱ ص ۸۳۔

۳۔ کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۲۵۔

کا پھوننا اور پڑھنا، اس مکتوبِ نبویؐ بنام ہرقل (۳) حضرت قتادہؓ کا بیان، (۴) حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰؓ اور حضرت علقمہ بن قیسؓ کا نصرانی سے قرآن لکھوانا، (۵) امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا قول (۶) احناف کے نزدیک غیر مسلم کی ہدایت کی امید پر اس کو قرآن کی تعلیم دینے کا جواز، (۷) امام ابن حزم ظاہری اندلسیؒ کے نزدیک علی الاطلاق سب کے لیے مس قرآن کا جواز، ان سب تصریحات کی روشنی میں ایسے غیر مسلموں کو قرآن پھوننے اور پڑھنے پر سنجیدگی سے غور کیا جاسکتا ہے جو واقعی ہدایت کے طالب ہیں، اور اس کا اپنے طور پر احترام کرتے ہیں، ایک بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰؓ اور علقمہ بن قیسؓ نے نصرانی سے قرآن لکھوایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد سربراہان ملک کے پاس دعوتی مکاتیب روانہ فرماتے مگر نصرانی سربراہ ہرقل کے مکتوب میں قرآنی آیات تحریر فرمائیں، امام محمدؒ نے نصرانی کو غسل کے بعد قرآن پھوننے کی اجازت دی ہے، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے اہل مذاہب کے مقابلہ میں عیسائی اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ قریب تھے، اور قرآن کا کسی حد تک احترام کرتے تھے، اس لیے اہل علم کو ان پر اعتماد تھا،

دوسری بات یہ ہے کہ قتادہؓ، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰؓ، علقمہ بن قیسؓ اور امام محمدؒ علمائے عراقی ہیں سے ہیں جن کے یہاں نو مسلموں اور غیر مسلموں کے اخلاط و اجتماع کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے، اور ائمہ دین ان کو کتاب و سنت کی روشنی میں اپنی فقہی بصیرت سے حل کرتے تھے، اس دور میں عراق کے مرکزی شہر کوفہ، بصرہ وغیرہ عجیب و غریب رجال و افکار کا گہوارہ تھے، اور ان میں مذہبی بحث و مناظرہ کی مجلسیں برپا ہوا کرتی تھیں، اسی وجہ سے علماء عراق جدید مسائل کے بارے میں سند اور اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں توسع پایا جاتا ہے۔

امام ابو زرعة رازی

(از مولانا سید ادریس صاحب، ادری، اعظم گڑھ)

ابو زرعة الرازی اپنے دور کے مشہور محدث، حافظ حدیث، اسماء الرجال اور فن جرح و تعدیل کے بہت بڑے عالم اور امام فن تھے حفظ حدیث، ذکاوت اور علم و عمل ہر اعتبار سے ممتاز تھے، ان کی عظمت اور علم و فضل کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے تلامذہ میں امام ترمذی، امام نسائی، ابن ماجہ، ابو حاتم رازی جیسے مشہور محدثین شامل ہیں، آپ امام بخاری و مسلم جیسے بگڑوڑ گار محدثین کے معاصرین اور بہت سے شیوخ حدیث میں شریک ہیں، لاکھوں حدیثیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے نقل کیں، اسماء الرجال اور فن جرح و تعدیل کی کتابوں میں امام بخاری و مسلم اور دوسرے مشاہیر فن کے ساتھ ان کے کئی اقوال مذکور ہیں اور ان کی بڑی اہمیت ہے۔

آپ کا نام عبید اللہ بن عبد الکریم بن یزید بن فروخ ہے، لیکن علمی دنیا میں آپ کی شہرت صرف ابو زرعة رازی کے نام سے ہے آپ کی ولادت دوسری صدی کے آخر میں ۲۹۵ھ میں ہوئی۔ امام بخاری کا سال ولادت بھی یہی ہے آپ کی ولادت شہر رے میں ہوئی اور وہیں نشو و نما پائی۔

آپ کا خاندان ایک علمی خاندان تھا، آپ کے دادا یزید بن فروخ رے کے تین مشہور محدثین میں شامل ہیں، اسماعیل بن یزید

خاندان

اور محمد بن یزید ابو جعفر الاحدب اور تیسرے یہی یزید بن فروخ ہیں، آپ کے والد عبد الکریم بن یزید خود بھی صاحب علم تھے اور مشہور محدثین کی علمی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے، اسماء الرجال کی بہت سی معلومات ابو زرہ کو اپنے والد ہی کے ذریعہ حاصل ہوئیں، اسی طرح ان کے بھائی ابو بکر بھی اہل علم تھے اور محدثین سے حدیث کے سماع کے سلسلہ میں ابو زرہ اپنے بھائی ابو بکر کے ساتھ بسا اوقات جاتے تھے، اسی طرح ان کی بھوپھی کا گھرانہ بھی علمی گھرانہ تھا ان کے بھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مشہور محدث ابو حاتم رازی نے تحصیل حدیث کے سلسلہ میں اسفار کیے ہیں۔ ابو زرہ نے اپنے خاندان اور عزیز واقارب اور اپنے شہر کے علمی ماحول اور آب و ہوا میں نشوونما پائی جہاں ہر طرف اور ہمہ وقت قال اللہ وقال الرسول کے ایمان افرز اور حوصلہ افزا نغمے گونج رہے تھے۔

وطن | آپ کا وطن شہر رے ہے ایک مردم خیز شہر تھا اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا میں ایک علمی مرکز کی حیثیت سے بھی مشہور تھا۔ رے میں ہر طرف علم حدیث کا چرچا تھا، متعدد محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل کے علمی زمزمہ آرائیوں سے پورا شہر معمور تھا، دنیائے اسلام میں ہمہ وقت جو علمی کارواں سرگرم سفر رہا کرتے تھے، ان کی ایک منزل رے بھی تھی جہاں تک کردہ اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے، رے کے محل وقوع نے بھی اُن کی مرکزیت و مرجعیت میں اضافہ کر دیا تھا کیوں کہ ماوراء النہر کے تمام علمی مرکزوں نیشاپور، مرو، بلخ، ہرات وغیرہ مشہور شہروں کے قافلوں کی شاہراہ پر واقع تھا ان علاقوں سے حاجیوں کے قافلے اور طلب حدیث میں سرگرم سفر رہنے والے کارواں رے ہی سے ہو کر گزرتے تھے، اس کی سرائیوں اور مسافرخانوں میں یہ قافلے خیمہ زن رہا کرتے تھے، اور کارواں کے افراد اپنے اپنے ذوق کے مطابق رے کے محدثین کی علمی مجلسوں میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے اور کچھ دنوں قیام

کر کے پھر آگے کے سفر پر نکل جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے رُے میں ہمہ وقت علمی ہوا، ہی کا ایک ماحول بنا رہتا تھا، ہر طرف علمی چرچے، درسِ حدیث کی باتیں، مذاکرے و مباحثے اس طرح شب و روز ہوتے رہتے تھے جیسے اس کے علاوہ یہاں اور کوئی مصروفیت اور دلچسپی کی چیز ہی نہیں ہے۔ پھر رُے کا تجارتی مرکز ہونا، اور خلفاء کا خصوصیت کے ساتھ یہاں کے علماء و محدثین کا لحاظ و خیال رکھنا اور ان کو علمی مشغلوں کی سہولتیں فراہم کرنا بھی رُے کی شہرت کا باعث تھا۔

رُے میں بہت سے علمی خاندانے تھے جن میں درس و تدریس کا سلسلہ اور علمی چرچا رہا کرتا تھا اس کے افراد علمی مشاغل میں مصروف تھے اور وہ رُے آنے والوں کے سامنے اپنے آبا و اجداد کے علمی ذخیروں سے لوگوں کو مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرتے رہتے تھے، رُے کے متعدد علماء اور محدثین کی عالم اسلام میں شہرت نے بھی رُے کی مرکزیت میں اضافہ کر دیا تھا، مشاہیر اسلام اور حلیل القدر محدثین کے سفرِ رُے کا حال تاریخوں میں مذکور ہے، ان میں سے کچھ ممتاز اور نمایاں نام درج ذیل ہیں =

امام سعید بن جبیر الاسدی الوابی جن کو حجاج نے ۹۵ھ میں ظلماً قتل کرایا، مشہور محدث منہاک بن مزاحم الہمدانی الخراسانی (متوفی ۱۵۰ھ) امیر المؤمنین فی الحدیث عامر بن شراحیل (متوفی ۱۰۲ھ) جو صرف شعبی کے نام سے مشہور ہیں، جابہ بن نافع الفہمی الکوفی (متوفی ۱۱۰ھ) جو نافع مولیٰ ابن عمرہ کے مشہور راوی ہیں، حجاج بن ارطاط بن ثور النخعی الکوفی القاضی (متوفی ۱۱۵ھ) مشہور محدث و فقیہ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی امام المفاز محمد بن اسحاق بن یسار المدنی (متوفی ۱۵۲ھ) امیر المؤمنین فی الحدیث سفیان بن سعید بن مسروق الثوری (متوفی ۱۶۰ھ) امام القراءۃ والتجوید والنحو علی بن حمزہ بن عبد اللہ الاسدی الکوفی الکسانی (متوفی ۱۶۸ھ) مشہور

فقیر و محدث عبداللہ بن المبارک المروزی (متوفی ۱۸۱ھ) ابوالفضل سلمہ بن
بشر النیسابوری (متوفی ۲۱۱ھ) امام علی بن عبداللہ بن جعفر بن یحییٰ السعدی
ابوالحسن ابن المدینی ابھری (متوفی ۲۳۲ھ) جو امام بخاری کے مشہور شیوخ میں ہیں۔
دنیا اسلام کی ان مشہور اور عظیم المرتبت شخصیتوں کے خیر مقدم کرنے کا شرف سرزمینِ رسے
کو حاصل ہوا، ان علماء و محدثین نے افادہ و استفادہ کی غرض سے رسے کا سفر کیا۔ اس
تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ ابوزرعہ کے نشو و نما کا زمانہ کتنا زرخیز تھا۔ رسے
کے اس علمی ماحول اور فضا میں ان کا بچپن گزرا۔

کنیت | ابوزرعہ کی کنیت میں رسے اور دوسرے مقامات کے تقریباً پچاسوں اہل
علم شریک ہیں۔ لیکن فن اسماء الرجال و فن جرح و تعدیل اور علم حدیث
میں جب مطلق بغیر نسبت کے ابوزرعہ کی کنیت استعمال کی جاتی ہے تو اس سے مراد
یہی ابوزرعہ الرازی ہوتے ہیں کیونکہ المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل،
ابوزرعہ کی علمی عظمت و شان نے ان کے اسلاف و معاصرین کو جو ان کے ساتھ کنیت میں
شریک تھے پردہ خفا میں ڈال دیا۔

تحصیل علم | چونکہ گھر اور خاندان میں ہمہ وقت علمی چرچا رہتا تھا، خود ان کے والد
علماء و محدثین کی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے رہتے تھے اس لیے
قدرتی طور پر ابوزرعہ اپنی کم عمری ہی میں علمی مجلسوں میں شریک ہونے لگے تھے بعد اسلام
کی ابتدائی صدیوں میں تحصیل علم کا مروج طریقہ یہ تھا کہ طالبان علم حدیث کا قافلہ مرتب
ہوتا تھا اور اجتماعی طور پر یہ قافلہ شہروں و شہروں میں قیام کرتا ہوا علم حدیث کے
مرکزوں تک پہنچتا اور حسب ضرورت وہاں قیام کر کے پھر آگے بڑھتا تھا، چونکہ
راستے مخدوش تھے اس لئے جان و مال کی حفاظت کے خیال سے تنہا سفر نہیں کیا
جاتا تھا۔

ابوزرعہ کا پہلا علمی سفر تیرہ سال کی عمر میں ہوتا ہے، اسی عمر میں انہوں نے اپنی فطری ذکاوت و قوت حافظہ اور فہم و فراست کی وجہ سے اکابر محدثین کا اعتماد حاصل کر لیا تھا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب مشہور محدث قتیبہ بن سعید (متوفی ۲۴۰ھ) رے تشریف لائے ہیں تو لوگوں نے ان سے روایت حدیث کی درخواست کی تو انہوں نے کہا: "میری مجلس درس میں احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، ابوبکر ابن ابی لیلیٰ، شیبہ اور ابو خلیثمہ جیسے اہل علم شریک ہوتے ہیں، میں یہاں کس کے سامنے حدیث بیان کروں؟

لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے مختلف مجلسوں میں جو حدیثیں بیان کی ہیں ہمارے یہاں ایک لڑکا ہے جو ان حدیثوں کو پورے ترتیب کے ساتھ حرف بحرف بیان کر دے گا، یہ کہہ کر لوگوں نے ابوزرعہ سے کہا کہ ابوزرعہ کھڑے ہو جاؤ، چنانچہ ابوزرعہ آئے اور انہوں نے وہ تمام حدیثیں بیان کر دیں جو قتیبہ بن سعید اب تک رے کی مختلف مجلسوں میں بیان کر چکے تھے، یہ حیرتناک حافظہ دیکھ کر قتیبہ ششدر رہ گئے اور درسی حدیث شروع کر دیا۔

علمی اسفار علمی اسفار خاص طور پر دو مقصدوں کے پیش نظر ہوتے تھے ایک تو یہ کہ جس راوی سے ان کو حدیث ملی ہے اگر اس کے شیخ سے ملاقات ممکن ہے تو اس شیخ سے براہ راست مل کر حدیث کا سماع کرنا وہ پسند کرتے تھے، تاکہ سند مختصر ہو جائے، فن علوم الحدیث میں اس کو علو اسناد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسرا مقصد سفر راویوں کے حالات کا صحیح علم تاکہ حرج و تعدیل کے اعتبار

سے ان کا صحیح مقام و مرتبہ تعین کیا جاسکے اور روایت کا درجہ معلوم ہو جائے، اسی تلاش و تفحص اور جستجو کے نتیجے میں فن اسرار الرجال اور فن جرح و تعدیل وجود میں آیا۔ ان اسفار کا مقصد شیوخ حدیث اور اکابر اُمت سے خبر کا ملاقات کسی کے پیش نظر نہیں تھا۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ حدیث کی صحت اور ضعف کا دار و مدار اوکل کے مجروح و ثقہ ہونے پر منحصر ہے، تدوین حدیث کے سلسلہ میں اسکی اہمیت و ضرورت اور بڑھ جاتی تھی، ان سفروں سے جہاں ذخیرہ حدیث کی فراہمی میں مدد ملتی تھی وہیں روایتوں کی صحت و ضعف کا علم بھی علی وجہ البصیرۃ حاصل ہو جاتا تھا ان سفروں کو بڑی اہمیت حاصل تھی یہاں تک کہ جو لوگ طلب حدیث کے سلسلے میں اسفار نہیں کرتے تھے ان کا درجہ محدثین کی مجلسوں میں بہت کمتر سمجھا جاتا تھا، یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں:

اربعة لا توشى منهم، شد امنهم
رجل یکتب فی بلدة ولا یرحل فی
طلب الحدیث لہ
چار طرح کے لوگوں میں صحیح علمی بصیرت
نہیں پیدا ہو سکتی، ان میں سے ایک وہ
لوگ ہیں جو طلب حدیث میں اپنا وطن
نہیں چھوڑتے ہیں۔

ابن ادم کہا کرتے تھے کہ:

ان الله یوقع البلاء عن هذه
الامة، برحلت اصحاب الحدیث
اللہ تعالیٰ طلب حدیث کے سلسلہ میں سفر
کرنیوالوں کی برکت سے اس اُمت کو بہت
سی بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے،

۱۔ الرحلة فی طلب الحدیث للبغدادی ص ۴۷۔

۲۔ ایضاً ص ۴۷ و فتح المغیث ج ۲ ص ۲۱۵۔

تفصیل حدیث کے سلسلہ میں اسفار کی اس اہمیت کے باوجود یہ بھی ایک طے شدہ اصول تھا کہ ترک وطن سے پہلے اپنے شہر کے اہل علم اور شیوخ حدیث کی مجلسوں میں شریک ہو کر ان کے علوم کو حاصل کرے پھر اپنے وطن کے قرب و حواریں واقع شہروں اور قریوں کے اہل علم سے استفادہ کو مکمل کرنے کے بعد دور دراز کے علمی مرکزوں کا سفر اختیار کرے،

ابوزرعہ نے بھی اس اصول کو مد نظر رکھا، انھوں نے سن شعور کے ابتدائی مرحلوں میں زے کے محدثین سے سماع حدیث کے بعد اپنے علمی سفر کا آغاز کیا، خود ابوزرعہ کا بیان ہے:

کتبت ہالوی قبل ان اخرج الى العراق
عن نحو ثلاثين شيخا، منهم عبد الله
بن الجراح التيمي ابو محمد القهستاني
نزيل الري، عبد العزيز بن المغيرة
المنقري ابو عبد الرحمن البصري نزيل
الري، عبد الصمد بن حسان المروزي
خادم صفيان الثوري جعفر بن عيسى
البصري قاضي الري بشر بن يزيد
بن الانزه النسابوري، سلمة بن
بشير النسابوري نزيل الري، عبید
بن اسحاق العطاس ابو عبد الرحمن
الکوفي ط

سفر عراق سے پہلے میں اپنے شہر کے تقریباً
۳۰ شیوخ حدیث سے حدیثیں لکھ چکا تھا،
ان میں سے چند نام یہ ہیں عبد اللہ بن الجراح
تیمی ابو محمد قہستانی رمتوفی ۲۳۲ھ عمر ۷۰
بن مغیرہ منقری بصری، عبد الصمد بن حسان
مروزی خادم صفیان ثوری۔
جعفر بن عیسیٰ البصری قاضی ری رمتوفی ۲۱۹ھ
بشر بن یزید بن الانزه نیشاپوری، سلمہ
بن بشیر نیشاپوری۔
عبید بن اسحاق عطاس ابو عبد الرحمن کوفی
وغیرہ

ابوزرعہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے فضل بن وکیعہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۲۱۸ھ سے کس سال حدیثیں لکھیں تو انھوں نے کہا کہ ۲۱۴ھ میں یعنی اس وقت جب آپ کی عمر بیسویں سال میں داخل ہو چکی تھی۔

پہلا سفر | ابوزرعہ نے پہلا علمی سفر ۲۰ سال کی عمر میں کوفہ کا کیا ہے جو اس زمانہ میں علم و فن کا اہم ترین مرکز تھا، گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علماء و محدثین کی مجالس درس قائم تھیں، ہر طرف علم و فن، تعلیم و تعلم، درس و تدریس کی چہل پہل تھی، دارین و عبادین کا کوفہ میں ایک تسلسل لگا ہوا تھا، ابوزرعہ کا یہ سفر ٹھیک اسی طرح کے ایک قافلے کے ساتھ تھا جسے سوداگروں اور بیوپاریوں کا قافلہ چلا کرتا تھا، کیونکہ راستے خطرات سے خالی نہیں تھے، تنہا سفر کرنا ممکن نہ تھا۔

اس سفر میں آپ کے دس مہینے لگے، اسی سفر میں آپ نے کوفہ کے مشہور محدث ابو نعیم فضل بن وکیعہ سے حدیثوں کا سماع کیا۔

- تہذیب الشہذیب ج ۵ ص ۱۶۹۔
 ۳۹۔ الجرح والتعديل ج ۲ ص ۳۹۔
 ۴۰۔ الجرح والتعديل ج ۳ ص ۵۴۔
 ۴۱۔ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۳۔
 ۴۲۔ الجرح والتعديل ج ۲ ص ۱۵۷۔
 ۴۳۔ الجرح والتعديل ج ۲ ص ۱۵۷۔
 ۴۴۔ ایضاً ج ۲ ص ۴۰۱۔

دوسرا سفر ابو زرہ کا دوسرا علمی سفر طویل ترین سفر تھا اور اسی کے ساتھ ان کا یہ سفر استفادہ و افادہ کے لحاظ سے اہم ترین بھی تھا، یہ سفر ۲۳ھ سے شروع ہو کر ۳۳ھ کے ابتدائی مہینوں تک جاری رہا، اس سفر میں انھوں نے بہت سے علمی مرکزوں سے استفادہ کیا، مختلف شہروں اور دراز گاؤں میں پہنچ کر وہاں کے اہل علم سے علم حدیث حاصل کیا، خود ابو زرہ نے اپنے اس سفر کی روداد بیان کی ہے اس لیے اُن ہی سے یہ روداد سماع فرمائیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر

”میں دوسری بار ۲۳ھ میں رے سے نکلا اور ۳۳ھ میں رے واپس آیا، اس سفر میں سب سے پہلے میں نے مکہ پہنچ کر فریضہ حج ادا کیا، حج سے واپس آنے کے بعد مصر پہنچا، مصر میں ٹہرنے پر پندرہ مہینے گزارے جبکہ آغاز سفر کے وقت مصر میں کم سے کم قیام کا ارادہ تھا لیکن وہاں پہنچ کر جب میں نے علمی چیل چیل دیکھی، ہر طرت افادہ و استفادہ کا دلولہ اُتار دیا۔ ہماری پاپا تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور مصر میں میرے قیام کی مدت دراز سے دراز ہوتی چلی گئی، اسی طرح امام شافعیؒ کی کتابوں کے سماع کا بھی میرا ارادہ نہیں تھا لیکن جب میں نے غیر معین قیام کا ارادہ کر لیا تو میں نے ایسے شخص کی جستجو کی جو امام شافعیؒ کی کتابوں سے بہتر طور پر واقف ہو، جب ایسا شخص مل گیا اور میں نے اجرت پر نقل کرنے کا معاملہ طے کر لیا میرے پاس دو کپڑے اپنی ضرورتوں کے لیے تھے، ان کو فروخت کر کے کاغذ خریدا اور اس شخص کے حوالے کر دیا۔“

قیام مصر کے زمانہ میں ابو زرہ کے فضل و علم کو جو شہرت ملی اور محدثین مصر کے نزدیک

جوان کو مقام و مرتبہ حاصل ہوا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کے مشہور شاگرد ربیع بن سلیمان کہتے ہیں :-

لم تلق مثل ابی نر سعة و ابی حاتم
حیثی علمایہم آتے ان میں ابو زر عمار و ابو
معن و ابی عیسا من العلماء :- حاتم جیسا کوئی عالم نہیں آیا۔

تیسرا سفر تیسرے علمی سفر کا واقعہ بھی خود ابو زر عمار نے بیان کیا ہے انھوں نے بتایا ہے کہ اس سفر میں شام عراق اور مصر میں ساڑھے چار برس صرف

ہوئے، اس مدت میں ہر جگہ حسب حالات قیام کر کے وہاں کے مشاہیر شیوخ حدیث سے انہوں نے استفادہ کیا، حدیثوں کا سماع کیا، ان کی کتابوں کو نقل کیا، غرضیکہ علم حدیث کی تفصیل میں شب و روز کا ہر لمحہ لگا دیا اور ہر چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں تک پہنچنے کی کوشش کی جہاں بھی کوئی قابل ذکر محدث کی خبر ملی، حتیٰ کہ بعض حدیثوں کے سماع کے لیے وہ اسلامی قلمرو کے سرحدی مقامات پر واقع فوجی چھاؤنیوں میں بھی تشریف لے گئے جہاں غیر فوجی کو جانے کی اجازت نہیں تھی، انھوں نے رابطہ بن کر ان فوجی چھاؤنیوں میں مہینوں گزارے اور وہاں قیام پذیر ہو کر محدثین سے علم حدیث حاصل کیا۔ خلیلی نے ابو زر عمار کے شاگرد بردی کا بیان نقل کیا ہے، بردی کہتے ہیں،

معنت ابازرعة الرازي يقول له
اعرف لنفسی رابطاً خالصاً فی ثغرك
قصدت قزوین مرابطاً ومن همتی
ان اسمع الحديث من الطناتسی و
محمد بن سعید بن سابق و دخلت
میں نے ابو زر عمار راہزی سے سنا وہ کہتے تھے،
کہ میں فوجی چھاؤنیوں میں مرابطہ بن کر
داخل ہوا میرا مقصد صرف سماع حدیث تھا
میں قزوین کی چھاؤنی میں گیا میرا مقصد
وہاں علی بن محمد ابوالحسن الطناتسی،

بیروت مرابطاً ومن ہمتی ان اسمع عن
 انعباس بن الولید ودخلت دہا مرابطاً
 ومن یلتی ان اسمع عن ابی فروکۃ الرحابی
 فلا اعرف منسی دماطاً خلصت فلتی
 فیہ ثعبانی اعلم

متوفی ۲۳۳ھ) اور محمد بن سعید بن سابق
 ابو سعید الرازی (متوفی ۲۱۶ھ) سے سماع
 حدیث تھا۔ بیروت کی چھاؤنی میں جلنے
 کا مقصد عباس بن الولید العذری البیرونی (د
 متوفی ۲۴۴ھ) سے حدیث سننا تھا، رہا کی
 چھاؤنی میں جانے کی غرض ابو فروکہ راوی،

متوفی ۳۱۸ھ) سے سماع حدیث تھا، ہر باطل میں
 جاتے رہے میری نیت حالۃ طلب حدیث کی تھی کوئی
 دوسرا مقصد نہیں تھا۔ یہ کہہ کر وہ رو پڑے،

مختلف مقامات کا سفر | ابو زرعہ کے مقامات سفر کا جب تفصیل جائزہ لیا جاتا ہے
 تو پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف مشہور علمی مرکزوں ہی پر اکتفا
 نہیں کرتے تھے بلکہ اس مرکزی مقام پر استفادہ مکمل کرنے کے بعد اس کے اطراف و جوار
 کے چھوٹے چھوٹے نسبتاً غیر مشہور مقامات کا بھی سفر کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی قابل ذکر اہل
 علم موجود ہے، چنانچہ مختلف تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو زرعہ کے مقامات سفر
 میں مندرجہ ذیل شہر اور گاؤں شامل ہیں:

۱۔ قرظون جو خہرے سے ۲۰ فرسخ پر واقع ہے، قرظون کے مشاہیر علماء و محدثین
 میں ابو عبد اللہ بن ماجہ، موسیٰ بن یارون بن حیان، حسین بن علی طائسی، احمد بن ابراہیم
 بن سمویر العجلی، اسحاق بن محمد الکسانی اور ابو بکر بن یارون بن الحجاج سے حدیث کا
 سماع کیا اور ان سے علمی استفادہ کیا، یہ سفر ۲۱۴ھ سے قبل ہوا تھا۔ ۱۰

۲۔ ابو زرہ نے علماء سادہ سے بھی اکتساب فیض کیا، سادہ رے اور ہمدان کے وسط میں واقع ہے، دونوں جگہ سے اس کی مسافت ۳۰ فرسخ ہے، سادہ کے مشہور محدث عیسیٰ بن موسیٰ المعروف بفسجار (متوفی ۱۸۷ھ) کہتا کہ محمد بن اُمیۃ السادی کے پاس ان کی حدیثیں تھیں، ان حدیثوں کے سماع کے لیے یہ سفر کیا گیا تھا۔

۳۔ نیساپور اسلامی علوم و فنون کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، نیساپور میں ان دونوں مشہور محدث و فقیہ اسحاق بن راہویہ، ابو یعقوب الحنفی المعروف بابن راہویہ المروزی (متوفی ۲۲۸ھ) قیام پذیر تھے، ابو زرہ کا یہ سفر انہی سے سماعت حدیث کے لیے تھا، ابو زرہ کی نیساپور میں آمد کو ابن راہویہ نے کتنی اہمیت دی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ ایک نوجوان عالم ابو زرہ آپ کے پاس استفادہ کے لیے آئے ہوئے ہیں تو ابن راہویہ نے کہا کہ:۔

بلغنی ان هذا الفتي راو قد اعدت
مائة وخمسين الف حديث اُقيها
عليه خمسون الفاهم معلومات
لا تصح له

ہاں مجھے خبر ملی ہے، میں نے ڈیڑھ لاکھ حدیثیں
ان کے لیے تیار رکھی ہیں، جن میں پچاس
ہزار حدیثیں معلول ہیں یہ سارا ذخیرہ
حدیث ان کو پیش کر دوں گا۔

یہ ذہن میں رہے کہ ابن راہویہ کا یہ اہتمام اس نوجوان کے لیے ہے جس کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔

۴۔ ابو زرہ کا سفر بغداد ان کے علمی اسفار میں ایک اہم ترین سفر ہے، انہوں نے بغداد کا سفر ایک سے زائد بار کیا ہے جیسا کہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں تفصیل سے لکھا ہے، یہ سفر افادہ و استفادہ دونوں اعتبار سے ممتاز تھا۔ ایک طرف وہ عالم اسلام کی مشہور

ترین شخصیت امام احمد بن حنبلؒ سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں، دوسری طرف علماء بغداد میں ابراہیم بن اسحاق الحمری، عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ اور قاسم بن زکریا المطرز وغیرہ تین ابو زرہ سے سماع حدیث کرتے ہیں۔ ۱۔

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ،

لما وادعینا ابو زرہ سعة نزل عندنا فقال لی ابی یأبئی قال اعطت بنوافلی مدآلة هذا شیخ ۲۔
ابو زرہ جب بغداد آئے تو وہ ہمارے یہاں ہی تھے اس وقت والد صاحب نے کہا کہ صاحبزادے میں اپنی نفل نمازوں کے بدلے اس شیخ سے نہ کمرہ حدیث کرونگا۔

یوں تو حضرت امام احمد بن حنبلؒ ابو زرہ کے استاذ اور شیخ حدیث تھے اور ابو زرہ نے بھی آپ سے استفادہ میں کوئی مکی نہیں کی، لیکن دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کو بہت سی حدیثوں کی صحت میں تردد تھا اور ان روایوں کی صحت کو آپ نے ابو زرہ کے ذریعہ انا، چنانچہ ایک مشہور روایت کے سلسلہ کا ایک واقعہ ہے خطیب بغدادی نے اس واقعہ کو محمد بن صالح بغدادی کی روایت سے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ،

رأیت أبا زرہ سعة ذیل علی احمد بن حنبل وحديثه رأینہ قد یجمع علی حدیث کان حدثہ عبد الرزاق عن معمر عن منصور عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یسجد جانی بین حنیئ، قد یجمع علیہ احمد و...
حضرت ابو زرہ امام محمد بن حنبل کے پاس آئے اور انھوں نے حدیث بیان کی تو میں نے دیکھا کہ حضرت امام کو اس حدیث کو قبول کرنے میں تردد ہوا تو ابو زرہ نے امام صاحب سے کہا کہ اس حدیث کے بارے میں کیا تردد ہے؟

۱۔ تاریخ بغداد للخطیب ج ۱ ص ۳۲۶۔

۲۔ انباء ص ۳۲۰۔

فقال له ابو زرعة اى شئ خبر هذا الحديث فقال اخاف ان يكون غلطاً على رسول الله صلى الله عليه وسلم انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب ہے۔

اس کے بعد کا واقعہ یہ ہے کہ ابو زرعة نے کہا کہ حضرت! یہ حدیث صحیح ہے اور پھر ابو زرعة نے دو صحیح ترین سندوں سے اس حدیث کو امام صاحب کے سامنے پیش کیا، تب امام صاحب نے اس حدیث کی صحت پر اظہار اطمینان کیا اور ابو زرعة سے فرمایا کہ ذرا قلم دیجئے، اور ان کے ہاتھ سے قلم لے کر اپنی کتاب میں آپ نے صحیح، صحیح، صحیح تین بار لکھ دیا۔
۵۔ ابو یعلیٰ الموصلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو زرعة شہر واسط میں بھی کچھ قیام کر کے افادہ واستفادہ میں مصروف رہے ان کے الفاظ میں:-

کتباً بانتخاباً بواسطة ستة آلاف ہم نے واسط میں ان کی چھ ہزار منتخب حدیثوں کو لکھا ہے۔

۶۔ انبار سے چند فرسخ کے فاصلہ پر حدیث النورہ واقع ہے، مہر سے وابستہ ہوتے ہوئے یہاں بھی آپ نے قیام کیا اور وہاں کے مشہور محدث سوبید بن سعید بن سہل بن شہریار الہراوی ابو محمد الحدثانی الانباری نزہۃ النورہ (متوفی ۳۸۵ھ) جو امام مسلم، ابن ماجہ وغیرہ کے شیوخ میں سے ہیں، ان سے استفادہ کیا ابو زرعة کی ان کے بارے میں رائے ہے =

۱۰ مکتبہ فصیح و کتب التبیح اصول ان کی کتابیں تو سب کی سب صحیح ہیں، ان کی روایت کرنا صحیح ہے جو انہوں نے اپنے واکتب منها ما اذا احداث من

حفظہ فلا

حافظہ کی مدد سے بیان کریں وہ میں نے
نہیں لکھیں۔

ابوزرعہ کی اس رائے کا وزن امام بخاری کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے، جو انہوں نے
سوید بن سعید کے بارے میں پیش کی ہے امام بخاری نے لکھا ہے:
کان قد علم فیلقن مالیس من حدیثہ ۲
یور میں نابینا ہو گئے تھے یوگ ان کی روایتوں
میں آمیزش کر کے روایت کرنے لگے تھے۔

۷۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بصرہ علم حدیث کا ایک اہم ترین مرکز تھا۔ اس لیے ابوزرعہ
ایک سے زائد بار بصرہ تشریف لے گئے، در بصرہ کے بیشتر محدثین سے انہوں نے استفادہ
کیا، اسی کے ساتھ ساتھ علماء بصرہ بھی حضرت ابوزرعہ کے قدر شناس اور ان کی عظمت
و فضیلت کے معترف تھے اس انبیا حاتم کا بیان ہے: کہ حضرت ابوزرعہ نے بتایا کہ جب ہم
بصرہ میں تھے تو حضرت ابو الولید الطیالسی جو اپنے دور کے امام حدیث تھے انہوں نے ہم
سے کہہ رکھا تھا:

اذا کان عندنا قوم فلا تاذنوا
فلیس علیکم حجاب لکم
جب لوگ میرے پاس ہوں تو آپ کو اجازت
لینے کی ضرورت نہیں ہے تکلف چلے آئیں،
ابوزرعہ نے مزید بتایا کہ کبھی کبھی وہ دسترخوان پر ہوتے تھے تو ہمیں اپنے ساتھ کھانے
پر مجبور کر دیا کرتے تھے، ابوزرعہ نے ان سے بہت سی حدیثیں لکھیں لیکن وسعت علم اور تحقیق
و تنقیر کی فطری صلاحیتوں سے کام لے کر ان حدیثوں میں سے جو ان کے معیار صحت پر پوری
اترتی تھیں انہیں لکھ لیتے تھے، بغیر روایات کو ترک کر دیتے تھے۔

۱۔ تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۳۰۔

۲۔ التہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۲۔

۳۔ تقدیر الجرح والتعديل ص ۳۴۵۔

اسی طرح ابو زرعد نے بصرہ کے دوسرے مشہور محدث ابو سلمہ التبوذکی سے دس ہزار حدیثیں لکھیں، بصرہ میں بعض مواقع پر ان کے علم و فضل کا امتحان بھی لیا گیا لیکن جب انھوں نے ایک سے زائد ثبوت پیش کیے تو وہ مطمئن ہو گئے، جیسا کہ سلیمان الشاذلی کو فی کی مجلس درس کا واقعہ ہے جب انھوں نے ان کی کئی روایتوں پر تنقید کی تو انھوں نے غصہ کا اظہار کیا لیکن ابو زرعد کے بحر مباح نے اس آتش غضب کو بجھا دیا۔

۸۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو جو امتیاز اور خصوصیت حاصل تھی اسکی وجہ سے ہر صاحب علم کے لیے تکمیل علم کے لیے ان دونوں مقدس شہروں کے اہل علم سے استفادہ ضروری تھا، ابو زرعد اپنے دوسرے سفر میں جو ۲۲ھ سے شروع ہو کر اوائل ۳۲ھ میں ختم ہوتا ہے ان دونوں شہروں کے محدثین و علماء سے استفادہ کیا، مکہ میں محمد بن عاصم بن حفص المعافری ابو عبد اللہ المصری (متوفی ۲۱ھ) جو ان دنوں مکہ میں اقامت گزیر تھے ان سے حدیثوں کی کتابت کی بیٹھ

ابو زرعد نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ہی یعقوب بن اسحاق بصری، اسی طرح موسیٰ بن حماد النخعی، محمد بن سلام بن عبد اللہ بن زیاد ابو عبد اللہ الایلی، عمرو بن ہاشم البیرونی سے روایتیں لیں۔

مدینہ طیبہ میں بار جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کے مشہور محدث اسماعیل بن ابی اویس سے استفادہ کا موقع بعض اسباب کی وجہ سے نہ حاصل ہو سکا جیسا کہ خود ابو زرعد نے بیان کیا:

دخلت المدينة ثلاث مرات وهو
حي ولم يقدر على ان اكتب عنه شيئاً
میں مدینہ طیبہ میں بار گیا وہ اس وقت حیات
تھے لیکن ایسے اتفاقان ہوئے کہ میں ان

۱۰۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۳۶۹۔

۱۱۔ المخرج والتعديل ج ۲ ص ۴۵، ۱۲۔ ایضاً ص ۲۰۳۔ ۱۳۔ ج ۳ ص ۲۷۸۔

سے کچھ بھی نہ لکھ سکا۔

قلت۔ القائل البرذعی۔ وكيف ذلك؟
قال كان صرة عليلاً وصرة متواسياً
وكان صرة غائباً
سائل برذعی نے کہا، وہ کیونکر؟ تو انہوں نے
فرمایا کہ ایک بار تو وہ صاحب فراش تھے،
ایک بار وہ روپوش تھے ایک بار ان کے سلسلہ
میں کوئی بیری نہیں ملی کہ وہ کہاں ہیں؟

۹۔ حضرت ابو زرعہؒ کے مشہور شہروں میں بھی طلب حدیث کے سلسلے میں تشریف لے
گئے، پورے شام میں دمشق کو خصوصی اہمیت حاصل تھی، اسلامی حکومت کا دارالخلافہ
ہونے کی وجہ سے یہاں بہت سے صحابہ کرامؓ قامت گزین تھے، ان کی ذات سے احادیث
نبویؐ کا یقیناً عام ہوا، پھر ان کے بعد ان سے استفادہ کرنے والے تابعین و تبع تابعین
کا وہ مرکز رہا، بڑے بڑے محدثین نے وہاں اپنی مسند درس پچھائی، حضرت ابو زرعہؒ اس
سے کیسے صرف نظر کر سکتے تھے، آپ نے ایک سے زائد بار شام کے شہروں کا سفر کیا،
شہر دمشق کے ایک درجن سے زائد محدثین کے نام ملتے ہیں جن سے امام ابو زرعہؒ نے روایت
لی ہیں۔ حلب میں متعدد محدثین سے سماعِ حدیث کیا۔

ابو زرعہؒ جس شہر میں شریف نے جلتے وہاں تکمال استفادہ کے بعد اس باب کی بھی
جستجو کرتے کہ اطراف و جوار میں کہاں کہاں محدثین اور اہل علم موجود ہیں، اور جب
پتہ میں جاتا تو وہاں آپ تشریف لے جاتے چنانچہ حران سے دو فرسخ کے فاصلہ پر
ایک آبادی تھی، وہاں جا کر آپ نے محمد بن مالک سے علم حدیث حاصل کیا۔ ۱۰

اسی طرح عسقلان، بیروت، مصر اور راء میں بڑے والی آبادیوں میں رک
ہیں کر اہل علم سے استفادہ کرتے رہے غرض کہ حضرت ابو زرعہؒ نے سب شعور کو پہنچتے
۱۱۔ بر احوال ابی زرعہ علی اسۃ ہرذعی ورقہ ۳۹ بجوار ابو زرعہؒ الرازی و تہودہ فی السنۃ النبویہ ج ۱ ص ۵۸
۱۲۔ ابن حجر و تعذیل ج ۱ ص ۴۹۔

ہی جو علمی اسفار کا سلسلہ شروع کیا تو اس وقت تک وطن میں سکون کے ساتھ نہ بیٹھے جب تک ان کے پاس احادیث نبوی کا عظیم ترین ذخیرہ نہ جمع ہو گیا، چونکہ ان اسفار میں افادہ و استفادہ دونوں کا سلسلہ جاری تھا اس لیے اہل علم اور محدثین نے ابو زرہ کے مقام و مرتبہ کو بھی اچھی طرح پہچان لیا جیسا کہ مہر کے مستہر و محدث حافظ حدیث یونس بن عبد الاعلیٰ نے کہا ہے :

ابو زرعة اشھد فی الدنیا من
الدنیا ۱۰ زیادہ ہے۔

ان اسفار میں ابو زرہ نے ۵۵۶ شیوخ حدیث سے حدیث کا سماع کیا ان کی روایتوں کو قلم بند کیا ان کے علاوہ ۲۴ وہ شیوخ حدیث ہیں جن سے خط و کتابت کے ذریعہ علم حدیث حاصل کیا اور ان کی روایتوں کی اجازت ملی، ۱۴ شیوخ حدیث وہ ہیں جن سے ملاقات کے باوجود ابو زرہ نے ان سے روایتیں نہیں لیں ۱۰، کیونکہ ان کی روایتیں ابو زرہ کے مقرر کردہ معیار تحقیق پر پوری نہیں اترتی تھیں، انچہ ایسے شیوخ حدیث ضرور ہیں جن کے ضعف کے باوجود بھی ابو زرہ نے ان کی روایتوں کو ذکر کیا ہے، اس کا یہ معنی نہیں کہ ان کو ان کے ضعف کا علم نہیں، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ روایتیں انھوں نے بطور استشہاد اور شہادت زائد کے طور پر لی ہیں جیسا کہ صحیح بخاری میں امام بخاری نے کیا ہے، کہیں بنیادی طور پر ان کو نہیں لیا گیا ہے، ابو زرہ سے روایت کرنے والوں اور ان کے تلامذہ کی تعداد تلاش و تفحص کے بعد ۶۸ ملتی ہے۔ ۱۰

۱۰۔ تاریخ دمشق لابن عساکر فی ترجمۃ ابی زرہ۔

۱۱۔ ابو زرہ الرازی و جمہودہ فی السنۃ النبویہ ج ۱ ص ۱۵ تا ص ۱۵۸ میں تفصیل دیکھئے۔
۱۲۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ابو زرہ الرازی و جمہودہ فی السنۃ النبویہ ج ۱ ص ۱۶۳ تا ص ۱۷۲۔

فضائل و کمالات | علم القراءت جو حامل اس سلامی فنون میں سے ایک ہے، قرآن کے اندر مختلف قرائتیں ہیں، ان قرائتوں کی روایت کرنے

والے بھی الگ الگ ہیں، ابونعیم نے چودہ مشہور راویان قراءت سے روایتیں لی ہیں، علم القراءت میں ان کے تبحر اور وسعت علم کا اندازہ دینے کے واقعے سے ہوتا ہے جسے خطیب بغدادی نے پوری سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

عن أم عمر بنت شعوب التميمي سمعت
سويد بن عقلة يقول: عيسى بن عيسى
يرى جويريان، قال: صاحب القيت
هذا علي، ثم أعاد فبقي متحيراً
وقال: أنا أحفظ في القراءات عشرة
ألا حسد يث قلت: فتم حفظ هذا
قال: لا، لا

ان مروی حدیث شمرنے کہا کہ میں نے سو بدرہا
غملہ کو تورعین کا جگہ عیسیٰ عین پڑھتے
ہوئے سنا تو راوی صاحب نے کہا کہ میں
نے یہ بات ابو زرہ کے سامنے پیش کی،
انھوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا اور
کہا کہ میں قراءت کے سلسلے میں دیکھا ہزار
حدیثیں یاد رکھتا ہوں مجھے کسی روایت
میں یہ قراءت نہ ملی۔

ابن ربیع ابو زرہ کا بیان نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک دن فرمایا کہ۔
ان احفظا سن مائة الف حديث
صحيح ومربعاً. ثم الف امناً في
التفسير والقراءات. لہ

میرے حافظہ میں چھ لاکھ صحیح حدیثیں ہیں
اور چودہ ہزار سندیں تفسیر اور قراءتوں
کے سلسلہ میں ہیں۔

روایت و درایت کے اصول ابو زرہ کے یہاں پائے جاتے ہیں ان سے اندازہ
ہوتا ہے کہ کھوارہ نے ان صوبہ برکاتی غور و خوض کے بعد ان کو قبول کیا ہے مثلاً:

میں نے اس سے ستر ہزار حدیثیں سنیں اور چودہ ہزار سندیں تفسیر اور قراءتوں کے سلسلہ میں ہیں۔

لہذا

ایک مسئلہ یہ ہے کہ مراسیل حجت ہیں یا نہیں؟ اس کے متعلق ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے:

سمعت ابی دابازرعة يقولان
لا يحتج بالمراسيل ولا تقویم الحججة
الابالاسا فيل الصحاح المتصلة^{عليه}
میرے والد اور ابو زرعة دونوں کہتے ہیں
کہ مراسیل روایتیں حجت نہیں، صحیح سند متصل
سے جو روایتیں ہیں وہی حجت بن سکتی ہیں،

اسی طرح ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی ثقہ کسی ضعیف راوی سے روایت کرتا ہے تو کیا اس ضعیف راوی سے روایت کی جائے گی؟ ابن ابی حاتم نے ابو زرعة سے پوچھا کہ سفیان ثوری، کلبی سے روایت کرتے ہیں جبکہ کلبی ضعیف ہے تو سفیان ثوری کا اس سے روایت کرنے کا کیا مقصد ہے؟ کیا ان کے نزدیک وہ ضعیف نہیں ہے؟ اس کے جواب میں ابو زرعة نے کہا:

كان الثوري يذکر الرواية عن
الكلبي على الانكار والتعجب ليعلقون
عنه روايته عنه ولم تكن روايته
عن الكلبي قبولاً له^{عليه}
سفیان ثوری کلبی سے جو روایت کرتے ہیں
تو ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کو صحیح
سمجھتے ہیں بلکہ ان کا مقصد اس روایت
کی غلطی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، نہ کہ وہ
اس کو قبول کرتے ہیں۔

اس توجہ سے معلوم ہوا کہ ابو زرعة کے نزدیک کسی ثقہ کا کسی ضعیف راوی سے روایت کرنا اس کی تعدیل نہیں ہو سکتی۔

سندوں اور راویوں پر ان کی نگاہ کتنی گہری تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ اصح الاسانید کون ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ الزہری
عن سالم عن ابيه عن النبي^ص صحيح، منصور عن ابي ابيهم عن علقمة عن عبد الله^{رضي}

۱۔ المراسیل لابن ابی حاتم ص ۱۳۔

۲۔ المخرج والتعديل ج ۱ ص ۳۶ و ۳۷۔

عن النبی صحیح، ابن عون عن محمد بن سیرین عن عبیدۃ السلمانی عن علی عن النبی صحیح، ابو زرہ سے مزید دریافت کیا گیا کہ عن سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن ابی ہریرۃ؟ یہ کیسی سند ہے تو انھوں نے فرمایا کہ سہیل اشبک علیہ اسی طرح ابن ابی حاتم نے مختلف سندوں کو ابو زرہ کے سامنے پیش کر کے ان کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی ہے، اس کے جواب میں جو انہوں نے باتیں لکھیں وہ بعد کے محدثین کے لیے دلیل راہ ثابت ہوئیں، ایک سند ہے، عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس سند میں ابو الزناد سے روایت کرنے والے چار راوی ہیں، ابو زرہ کے نزدیک ان چاروں راویوں میں بعض کو بعض پر تفصیلت حاصل ہے، ابو الزناد سے روایت کرنے والے ابن ابی الزناد، ورقاء، شعیب ابن ابی حمزہ، مغیرہ بن عبد الرحمن المدینی چار راوی ہیں، ابو زرہ سے دریافت کیا گیا کہ ابو الزناد سے ان روایت کرنے والوں میں آپ کا یہ بیدہ کون راوی ہے؟ تو آپ نے کہا کہ ورقاء، ان سب میں بہتر ہے، پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ تو آپ نے کہا کہ مغیرہ بقیہ دونوں سے بہتر ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ ابن ابی الزناد و رشعیب سے باہر آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ نے کہا کہ ابن ابی الزناد کے مقابلہ میں شعیب بہتر ہے۔

ابو زرہ کے یہاں عنعنہ کے قبول کرنے کی شرط روایت کے ساتھ ثبوت سماع بھی ہے، اگر روایت ثابت ہے اور سماع کا ثبوت اور اعتراض نہیں تو عنعنہ ان کے نزدیک قابل قبول نہیں، جبکہ بعض لوگوں کے نزدیک امکان نقل و یاروین کافی ہے، یہی وجہ ہے کہ ابو زرہ نے یحییٰ ابن ابی کثیر کے حضرت انس سے عنعنہ کو

قبول نہیں کیا کیوں کہ روایت تو ثابت ہے لیکن ان سے سماع ثابت نہیں، ان کے نزدیک اتھال سند اس وقت مانا جائے گا جب سماع کا ثبوت مل جائے، یہ شرط ابن اللدینی اور امام بخاری کی شرط سے زیادہ کڑی ہے کیوں کہ ان کے نزدیک اتھال کے لیے لقاء اور سماع دونوں میں سے ہر ایک کافی ہے، جبکہ ابو زرہ کے نزدیک صرف لقاء کافی نہیں، جب تک کہ سماع کی تصریح نہ ہو، لہ

تصانیف ابو زرہ نے سارے عالم اسلام میں چل پھر کر اپنی زندگی کے بہت بڑے حصے میں جو علوم و معارف کا ذخیرہ کیا ہے، اس کا اندازہ مذکورہ بالا تفصیل

سے ہو چکا ہو گا۔ اسی سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تصانیف کتنی اہم رہی ہونگی لیکن افسوس کہ آج ان کی اکثر تصانیف ناپید ہیں اگر ابن ابی حاتم اور برذلی کی کتابیں نہ ہوتیں تو آج ہم ان کتابوں کے ناموں سے قطعاً ناواقف ہوتے، البتہ ان سے استفادہ کرنے والوں نے ان کے بہت سے علوم و معارف کو اپنی کتابوں میں محفوظ کر لیا ہے، تنہا ابن ابی حاتم کی کتابیں جو طبع ہو کر عام ہو چکی ہیں، ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ابو زرہ کے علوم و معارف پر مشتمل ہے، فن اسماء الرجال اور جرح و تعدیل میں اپنے والد ابو حاتم اور ابو زرہ کے حنفی کثرت سے اقوال نقل کیے ہیں اس سے ابو زرہ کی راویوں کے بارے میں ان کی وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے، ابن ابی حاتم اپنی کتابوں میں جرح و تعدیل، غلل الحدیث، مراسیل اور بیان خطا البخاری، اعتقاد اہل السنۃ و تفسیر کے سلسلہ میں ابو زرہ کی آراء کا مسلسل ذکر کرتے ہیں، ہم ابن ابی حاتم اور برذلی کی کتابوں کی مدد سے ابو زرہ کی کتابوں کے جتنے نام ملتے ہیں، اور ان کی مشتملات کا جو علم حاصل ہوتا ہے ان کی روشنی میں ابو زرہ کی تصانیف کا ایک اجمالی تعارف پیش کرتے ہیں۔

المسند

ابوزرہ سے پہلے اور ان کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی مساند کے جمع کرنے کا سلسلہ جاری رہا، مسند کا حدیث کے ایسے مجموعہ کو کہا جاتا ہے جس میں ہر صحابی کی الگ الگ روایتیں جمع کر دی جاتی ہیں، چاہے وہ روایت صحیح ہو یا ضعیف، صحابہ کرام کے ناموں کو حروف، ہجا کے اعتبار سے ترتیب دے کر ان کی روایتوں کو جمع کر دیا جاتا تھا بعض ایسی بھی مسندیں جس میں کسی ایک صحابی کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، جیسے مسند ابی بکر وغیرہ، بعض اور دوسرے نقطہ نظر سے بھی مسندیں جمع کی گئی ہیں، اس وقت ابواب کی ترتیب کے لحاظ سے احادیث کے مجموعے کم تھے۔

ابوزرہ کی مسند کا ذکر بھی ہمیں کتابوں میں ملتا ہے مگر اس کا کوئی نسخہ اب تک دنیا کے کتب خانوں میں دریافت نہیں ہو سکا، لیکن متقدمین کی کتابوں میں مسند ابی زرہ کا ذکر ضرور آتا ہے، جس سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی مسند جمع کیا تھا، دنیا کے بعض کتب خانوں میں جو مساند جن ناموں سے پائے جاتے ہیں وہی نام متقدمین نے ابوزرہ کی مسند کا بھی لیا ہے، اس لیے انہیں کو مسند ابی زرہ مان لیا گیا ہے حالانکہ محقق علماء نے اس کی تائید و تصدیق نہیں کی ہے بلکہ تحقیق اور غائر مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مسند احمد بن حنبل کے اجزاء میں جن کو غلطی سے مسند ابی زرہ سمجھا گیا ہے جیسا کہ برلن میں "مسند انسامین" کے نام سے جو نسخہ ہے اس کے متعلق بڑے دعوے سے کہا گیا ہے کہ وہ مسند ابی زرہ کا ایک جز ہے کیونکہ مسند ابی زرہ کا ذکر متقدمین کی کتابوں میں ملتا ہے لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ مسند امام احمد بن حنبل ہی کا ایک حصہ ہے۔

مختلف کتابوں میں مسند ابی زرہ کے حوالوں سے اس کی ترتیب کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ مسند ابی زرہ کی ترتیب عام مسندوں کی ترتیب سے الگ تھی، ان کی

اپنی مسند میں ترتیب یہ تھی کہ سب سے پہلے عشرہ مبشرہ کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، پھر مہاجرین کی حدیثوں کو، پھر انصار کی حدیثوں کو جمع کیا ہے اور پھر الگ الگ شہروں میں اقامت گزریں صحابہ کرام کی حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں شام میں مقیم صحابہ کرام کی روایتیں ہیں جن کو کچھ لوگوں نے "مسند الشامیین" کے نام سے ذکر کیا ہے، اسی طرح مسند کے مختلف اجزاء کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا ہے مثلاً ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب میں کہیں "مسند ابن عمر" لابی زرعہ کہلے ہے اور کہیں لکھا ہے "اخرج ابو زرعہ فی مسند البصریین" کہیں "ادخلہ ابو زرعہ فی مسند البصریین" لکھا ہے کہیں "اخرج اسم فلان ابو زرعہ فی مسند الشامیین" لکھا ہے، اس طرح مسند ابی زرعہ کے مختلف اجزاء کو مختلف نام دیے ہیں، لیکن وہ سب کے سب مسند ابی زرعہ کے اجزاء ہیں، آج دنیا میں "مسند ابی زرعہ" کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔

تمام مضمون نگاران سے اپیل برائے رسالہ برہان دہلی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی، حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے دود والے تحقیقی، دینی و ملی و علمی معیاری، مضامین کو شش فرما کر منج دیں، تو اس کا دینی معیار بلند عملاً قائم رہ سکے گا۔ اس کا بنیادی معیار ہی ہے۔ اس طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔
(منیجر رسالہ برہان)

ایران کی ایک عظیم نشاۃ

بیروین اعتصائی تبریزی

(سعیدہ خاں ایم، اے، لکچرار شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ۔)

فارسی زبان دنیا کی شیریں اور دل کش ترین زبانوں میں سے ہے اور فارسی شاعری میں کئی ایسے تخلیقی شاہکار پائے جاتے ہیں جو عالمی ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جیسے مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی، اور فردوسی طوسی کا شاہنامہ وغیرہ۔

فارسی شاعری کی تاریخ بنانے میں جہاں ہزاروں مردوں نے اپنا جگر خون کیا ہے، وہاں خواتین نے بھی اس راہ میں کہیں کہیں اپنے قدموں کے پتھر نقش ثبت کیے ہیں۔ اور اس لالہ راز سخنوری کی گل گشت میں ایرانی پری جہانوں کے ساتھ ساتھ افغانی امر لقا تیں اور ہندوستانی گوریاں بھی محو خرام نظر آتی ہیں۔

جو تھقی صدی بھری سے چودھویں صدی ہجری تک حسن و ادا کی بہت سی پتلیوں نے بساط شاعری پر جلوہ پامشیاں کی ہیں، جن میں سب سے زیادہ مکرر نظر آنے والی زہرہ دشوں کے نام اس طرح ہیں:

۱۔ اپنے غلام کے ساتھ عشق کی شطرنج کھیلنے والی امیرزادی، رابعہ قادری (چھٹی صدی ہجری)

۲۔ گنجر کے غلیب زائے کی عاشقہ معشوقہ، مہستی گنجوی (چھٹی صدی ہجری)

۳۔ بابی مذہب کی مبلغ اور اباحت کے فلسفے کی علمبردار، قرۃ العین قزوینی ریتڑہویں صدی ہجری)

۴۔ حد سے بڑھے ہوئے ادبی ذوق اور شاعرانہ مزاج کی وجہ سے ایک سنجیدہ شوہر کے ساتھ نہا، نہ کر سکنے والی پروین اعتصامی تبریزی (چودھویں صدی ہجری)
ان میں مؤخر الذکر (پروین) کو اپنے علمی ذوق اور غیر معمولی شاعرانہ لیاقت کی بنا پر بقیہ تمام شاعرات پر تفوق حاصل ہے۔

پروین اعتصامی کا باپ یوسف اعتصامی اپنے وقت کا معروف سیاستمدار رہنما اور اہل قلم تھا۔ اس کی متعدد طبعیات اور دوسری زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ سادہ اس کی ادبیت میں شائع ہونے والے رسالے "بہار"، "کلیں" اب بھی کتابی شکل میں مجلہ تہران کے بک سیلر فروخت کرتے ہیں۔ پروین اعتصامی ایران کے اسی مشہور لیڈر اور مصنف کی ذہین اور تعلیم یافتہ بیٹی تھی۔

پروین ۱۲۸۵ شمسی میں اپنے آبائی شہر تبریز میں پیدا ہوئی۔ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ تہران آگئی اور باقی عمر شہر تہران کے اندر بسر کی۔ فارسی اور عربی ادبیات کی تعلیم اس نے اپنے باپ سے حاصل کی اور ۱۳۰۲ شمسی میں تہران کے زمانہ امریکن کالج کا نصاب مکمل کیا۔ ۱۳۱۲ شمسی میں اپنے چچا کے بیٹے کے ساتھ شادی کی۔ لیکن یہ شادی اس کی طبیعت کو اس نہ آئی اور وہ ڈھائی ماہ سے زیادہ شہر کرمان شاہ میں اپنے شوہر کے پاس نہ رک سکی۔ اور اپنے باپ کے گھر لوٹ آئی اور نو ماہ کے بعد باقاعدہ طلاق حاصل کر لی۔ غالباً پروین کے یہاں شمار اسی دور کی یارگاریں سے

اسی گل نوز جمیعت گلزار چہ دیدی

جز سرزنش و سرسری خارجہ دیدی

ای لعل دل افروز تو یا ای ہمدید تو

جز مشتری سفلہ بازار چہ دیدی
رفتی بچیں، ایک قفس گشت نصیبت

غیر از قفس ای مرغ گرفتار چہ دیدی

ان میں سے پہلے شعر میں پرندہ نے خود کو ایسے پھول سے تشبیہ دی ہے جس کو چمن میں
کانٹوں کی جھڑکیوں اور بد مزاجی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے شعر میں وہ خود کو
دل کو روشن کرنے والا نعل بتاتی ہے اور بے وقوف بازاری خریدار کہہ کر اپنے شوہر
کی بھوکرتی ہے اور تیسرا شعر واضح طور پر یہ بتا رہا ہے کہ وہ شادی کے بعد شوہر
کے گھر میں باپ کے گھر سے زیادہ آزاد اور بے باک رہنا چاہتی تھی۔ اور چونکہ اس
کی توقع پوری نہ ہو سکی اسی لئے شوہر سے قطع تعلق کر کے اور اس کو اہل حق
بنا کر اپنے دل کو مطمئن کر رہی ہے۔

بہر حال اس کے بعد پرندہ نے دوسری شادی نہیں کی اور ۱۳۲۰ شمسی میں جب
اس کی عمر ۳۲ سال کی تھی بارہ روز چھپک کی بیماری میں مبتلا رہ کر اس کی موت
واقع ہو گئی اور اس کی نعش شہر قہم لے جا کر اس کے خاندانی مقبرے میں اس
کے باپ کی قبر کے نزدیک دفن کر دی گئی۔ اس کے سنگ مزار پر خود اسی کا مہیلا
کبا ہوا یہ قطعہ کندہ ہے۔

اے کھانک سبیش بالین است	آخر چرخِ ادب پر وین است
گرچہ جز تلخی ایام ندید	ہرچہ جو ای، مختش شیریں است
صاحب آں ہمہ گفتار، امروز	سائلِ قاتح و یاسین است
دوستاں بہ کہ زوی یاد کنند	دل بے دوست بل غلین است
خاک در دیدہ، بسی جان فرست	سنگ برین، بسی سنگین است
بہرہ باشی دزبہر جا بر کسی	آخر یا منزل ہستی، این است

آدمی ہرچہ نو نگر باشد
چوں بدیں نقطہ رسد، مسکین است
اندر آنجا کہ قصا حمد کند
چارہ تسلیم و ادب، شکین است
زادگان کشتن و پنہاں کردن
دہر را رسم درہ و دیرین است
خرم آن کس کہ در این محنت گاہ
خاطری را، سبب تسکین است

پروین کی ذہانت اور شعر گوئی کی یافت بچپن سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کے باپ یوسف اعظمی سے ملاقات کے لیے جو عمار و فضلہ اور شعراء و ادباء اس کے گھر آیا کرتے تھے وہ اس کی استعداد اور شاعرانہ صلاحیت پر تعجب کیا کرتے تھے۔ اور اس کی یہی فطری قابلیت تھی جس نے صرف ۵ سال کی عمر میں غزلی شیرازی کی طرح اسکو فارسی زبان کی ایک باکمال اور عظیم شاعر بنا دیا۔ پروین اعظمی نے زندگی بھر جو کچھ کہا ہے اس کا مجموعہ کن بی شکل میں پہلی بار اس کے بڑے بھائی ابوالفتح اعظمی نے ۳۴ اشعار شمس میں شائع کیا تھا جس پر ملک الشعراء محمد تقی بہار خراسانی نے دیباچہ لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک مفید فرہنگ کے اضافے کے ساتھ پروین کا دیوان متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ عام شعرا کے دیوان کے خلاف پروین کا تمام دیوان قصائد، قطعات اور مثنوی طبعی اخلاقی روحانی اور فلسفیانہ مثنویوں سے عبارت ہے۔ غزل اس کے دیوان میں تلاش کرنے سے بھی دستیاب نہیں ہو گی۔ پروین کے دیوان کو ابوالفتح نے دو جھٹوں میں ترتیب دیا ہے۔ پہلے جزء میں مکمل اور نامکمل قصائد ہیں۔ دوسرے جزء میں قطعات اور مثنویات کو محفوظ کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر قطعات و مثنویات ۱۶۹ ہیں۔

جیسا کہ ملک الشعراء بہار نے بھی لکھا ہے: پروین کی شاعری میں دو لفظی و معنوی اسامیب آہستہ ہو کر ایک مستقل اسلوب بن گئے ہیں۔ اس کا اسلوب

شاعری خراسانی شعر از اور بالخصوص ناصرخسرو جیسے اساتذہ سے ساکھ ساکھ درجن کا تعلق فارسی شاعری کے خراسانی انکوں سے ہے، عراق و فارس کے سعدی جیسے استادوں کے اسلوب کو بھی، اپنے اندر ضم کیے۔ دینے ہے جس سے ایک نیا اسلوب وجود میں آتا ہے۔ جس میں موجودہ عہد کا خاص اسلوب تحسین و تصویر کشی شامل ہے۔ معنوی اعتبار سے پروین کا کلام فلاسفہ اور مونیار کے خیالات و افکار کی نمائندگی کرتا ہے۔

پروین کے قصائد ناصرخسرو کے قصائد کی آب و تاب رکھتے ہیں جن میں درمیان درمیان بہت سے ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو سعدی اور حافظ کی زبان کی شیرینی کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کے قصائد میں نشیہ تپیں ہیں، اخلاقی خوبیوں کا بیان ہے، فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے دنیا کی حقیقت پر تبصرہ ہے اور اسی کے ساکھ ساتھ ساتھ داندان سعادت۔ زندگی گزارنے کا اعلیٰ دار فہریت، اور محنت کی اہمیت اور علم کی عزت و اقامت کو بھی دلپذیر انداز میں تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ زندگی کے طوفانی سمندر میں اٹھ اور ادا دے کی شہنشاہی پر سفر کرنا چاہئے اور امید و آرزو کا طنائیل ہنر کے بازوؤں پر پرواز کرتا پایا ہے۔ وہ کہتی ہے۔

علم۔ رانیہ ہستی است نہ گنج زردماں

روح باید کہ ازیں راہ تو نگر گردد

دمال دولت کا خزانہ نہیں، بلکہ ہستی کا سرمایہ علم ہے۔

روح کو علم کی دولت سے مالا مال ہونا چاہیے

پروین اپنے قصائد میں سعی و عمل، امید و حیات، وقت کی قدر، حصول کمال و بہرہ جہت اور پیش قدمی اور بزرگی و نیک نیتی کا راستہ دکھاتی ہے۔

دیوانگی است، قصہ نقد و نخت نیست

از بام سرنگوں شدن و گفتن این قضا است

در آسمان علم، عمل برتریں پر است

در کشور وجود بہتر بہترین غنا است

میجوی گرہ عزم تو ز اندیشہ برز است

میجوی گرہ راہ تو در کام اژدہا است

یہ تقدیر اور قسمت کی کہا نی نہیں، دیوانگی ہے کہ چھت پر سے چھلانگ لگا دی

جائے اور کہا جائے کہ حکم الہی یوں ہی ہے۔

در علم کے آسمان پر پرواز کے لئے عمل صواب سے بڑا پس ہے اور ملک بستی کے اندر بہتر

سب سے بہتر دولت ہے۔

اگر تمہارا ارادہ فکر کی حدود سے بھی بلند ہو تب بھی مسلسل جستجو کرتے رہو اور اگر صبر

تمہاری آرزو کا راستہ اژدہا کے منہ سے ہو کر گزرتا ہو تب بھی چلتے ہی رہو۔

قطعات و مثنویات کے اندر پردین کا اسلوب کیسے بدل جاتا ہے۔ اپنے زیادہ تر قطعات

اور مثنویات میں اس نے اسلوب سوال و جواب یا صنعت مناظرہ و مکالمہ کا استعمال کیا ہے۔

صنعت مناظرہ کا استعمال اگرچہ فارسی شاعری کی ایک بہت پرانی روایت ہے، لیکن غرض سے

یہ روایت مردہ ہو چکی تھی جس کو پردین نے دوبارہ زندہ کیا اور اس کو خوش اسلوبی

کے ساتھ بہت سے میں تمام متقدمین پر برتری کا حاصل کی ہے۔

در اصل پردین کی شاعری کی اصل جلوہ گاہ اس کے قطعات ہی ہیں۔ جن میں اس

کی صبیحت کا ہنر اوپر لے کمال کے ساتھ ظہور ہوا ہے۔ اس کے قطعات کے اندر میان کی

لطافت، معانی کی دقت، اور مضمون، آفرینی کا ذوق ایک مناسب ترتیب و ترکیب کا تقاضا ہے اور

تحدید ہو گئے ہیں قطعات کے اندر پردین نے اپنی شخصیت اور لباقت کو پورے طور پر نمایاں کیا ہے۔ ہر قطع

میں تخیل اور حقیقت کو لطیف احساسات کے ساتھ فنکارانہ طور پر جمع کر دیا ہے۔

اپنے قطعات میں پروین ماں کی ممتا اور اپنی روح کی لطافت کو، پرندوں
غریب ماؤں، اور مجبور لوگوں کی زبان سے بیان کراتی ہے، کہیں وہ ایک
غمگسار ماں کے روپ میں نظر آتی ہے اور کہیں مولانا کے روم، شیخ عطار اور
ملائے جامی کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

مرغک اندر بیہ چوں گرد و پدید

گوید اینجی بس فراخ امرت و سپید

عاقبت کال حصن از بہت شکست

سالمی بیند ہمہ بالا و پست

کہ پرد آزاد در گہا رہا

کہ چہ در مست در گلزار رہا

(جب انڈے کے اندر چڑیا وجود میں آتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ یہ جگہ بہت وسیع
اور دلکش ہے)

(آخر میں جب انڈے کا سوراخ قلعہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے تو اس کو ایک پوری
بلند اور سست دنیا نظر آتی ہے۔)

(جہاں وہ کبھی آزادانہ پہاڑوں میں اڑان بھرتی ہے اور کبھی مستی کے عالم
میں باغوں میں ٹہلتی ہے۔)

پردین کا ہنر خاص طور پر اس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب وہ آکھ اور
پلک، دام اور دانہ، سانپ اور چوٹی، سوئی اور قمیض، ہانڈی اور توا
مٹی اور ہوا، پرندہ اور مچھلی، شکاری اور پرندہ، شبنم، ابرا اور بارش،
ٹاٹ اور میرا، پہاڑ اور گھاس وغیرہ وغیرہ کی زبان سے گفتگو کرتی ہے، اور
پڑھنے والے کو، "الف لیلہ"، اور "کلید دومنہ"، کی دنیا میں پہنچا کر بچپن،

جوانی اور بڑھاپے کی کیفیات اور ہزاروں ظاہری اور باطنی احوال کی سر
کراتی ہے، اور انسان کو زندگی کی تاریک راہ میں امید و آرزو کی روشنی دکھا کر
سکون بخشنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور چونکہ مسرت کی طرح غم بھی نہ گئی کا
لازم ہے اس لیے وہ کبھی کبھی ایسی نظمیں بھی لکھتی ہے جن سے انسانی
عواطف کا یہ پہلو بھی نمایاں ہوتا رہے اور اس کے لیے وہ غریب بچے، مجبور و
گمزور بڑھیا اور کھلایا ہوا گلاب جیسے عنوانات و موضوعات کا انتخاب
کرتی ہے اور جب ان غمناک موضوعات سے افسردہ ہو جاتی ہے تو "لطف
حق" جیسی شاہکار نظم لکھتی ہے جس کو پڑھ کر قاری اپنی تمام مایوسیوں اور
اور محرومیوں کی گرد کو اپنے دامن احساس سے جھٹک کر خدا کی رحمت و کرم کے
آسرے پر از سر نو زندگی کی راہ میں سعی و عمل کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہاں
بھی پر دین کے اندر کی عزت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے، اور
بقول ملک الشعراء بہار کے وہ ایک ماں کے فرائض ادا کرنا نہیں بھولتی ہے چنانچہ
وہ حضرت موسیٰ کے واقعہ کا ذکر کر کے یہ بتانا چاہتی ہے کہ تمام مصائب کا علاج
خدا کی مہربانی اور رحمت سے وابستہ ہے۔

مادرِ موسیٰ جو موسیٰ را بہ نیل

درنگند از گفتہ ربِ جلیل

خوارِ ساحلِ کرد با حسرت نگاہ

گفت کامی فرزندِ خردِ بی گناہ

گر فراموشست کند لطفِ خدای

بچوں رہی زیں کشتی بی ناخدای

گر نیارِ دایزد پاکت بہ یاد

آب، طاقت را دہتا ہے تاکہ یہ باد

دموسیٰ کی والدہ نے جب خدا کے حکم سے موسیٰؑ کو دریائے نیل میں ڈال
 دیا تو خود ساحل سے حسرت کے ساتھ دیکھا اور کہنے لگی کہ: بے گناہ شخص
 سے بیٹے! اگر لطف الہی تجھ کو فراموش کر دے تو اس بے مزاح کی کشتی کے ذریعے
 تو کیسے بچ سکتا ہے۔ اگر خدائے پاک تیری خبر گیری نہ کرے تو، یہ دریائے نیل
 کا پانی تجھے اچانک ہلاک کر ڈالے گا۔

یہ درست ہے کہ پروین نے اپنی منظومات میں مستقیمین کے اسلوب کے ساتھ ان کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن اس نے صرف نقل اور ترجمے پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ ن خیالات پر اضافہ کیا ہے، اور ان کی لطافت و معنویت کو بڑھا کر مثنویوں کو اپنا بنا لیا ہے۔ مثلاً: بابا طاہر عریاں کا شعر ہے یہ

زدست دید، و دل ہر دو فریاد

کہ ہرچہ دیدہ بیند، دل کنہ یاد

یا اسی خمون کا۔۔۔ وحی کا ایک شعر ہے۔۔۔

تقصیر ز دل بود و گناه از دپده

آه از دل و صد هزار آه از دینه

ان دونوں شعروں سے استفادہ کر کے پروین نے "دیدہ و دل" کے عنوان سے مناظراتی انداز میں ۳۲ شعروں پر مشتمل ایک عمدہ منظم لکھی ہے۔ جس کے چند شعر یہ ہیں۔

ترا کہ آسمان صاحب نظر کرد

مراغیوں و غصت و بے خبری

شماره دگرگون نوشتند

حساب کارما باخوں نوشتند
 ہر آن گوہر کہ مرگاہ توئی سفت
 نہاں باطن ہزاراں قصی گفت
 مرا شمشیر ز گیتی، ترا مشقت
 تر از بخور کرد، اما مرا کشت
 اگر سنگی ز کوی دل برآمد
 ترا بر پائے و مارا بر مرآمد
 بتی اگر تیر ز ابروی کماں نزد
 ترا بر جامہ و مارا بر جاں زد

دل آنکھ سے کہتا ہے۔ جس وقت سے آسمان نے تجھ کو صاحب نظر بنایا ہے، مجھے عاشق اور مست اور بے خبر بنایا ہے۔
 تمہاری کہانی دوسرے انداز میں لکھی گئی ہے، لیکن ہمارے معاملات کا حساب خون کی روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔
 تیری پلکوں سے جو آنسو بھی گرتا تھا وہ خفیہ طور پر مجھ سے ہزاروں کہانیاں بیان کر جاتا تھا۔

دنیا نے تیرے تو صرف مٹا مارا ہے، لیکن مجھ پر تلوار چلائی ہے۔ تجھے تو صرف بیمار ہی کیا ہے، لیکن مجھ تو قتل کر ڈالا ہے۔
 اگر معشوق کے کوچے سے کوئی پتھر پھینکا گیا ہے تو وہ تیرے پیر سے ہو کر گز گیا ہے لیکن پیر سے سر میرا کر لگا ہے۔

اگر کسی معشوق نے کمان ابرو سے تیر چلایا ہے تو صرف تیرے لباس کو تھپو کر گزر گیا ہے لیکن ہماری روح پر آکر لگا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، پروین نے پونے دوسو کے قریب منظومات
وقطعات لکھے ہیں۔ ان میں سے اس کی ستائش و راتھوں اور قطعات کے
عنوانات یہ ہیں :-

سفر اشک، لطف حق، کعبہ دل، گوہر اشک، روح آرزو،
دیدہ دل، دریائے نور، گوہر دستک، حدیث مہر، ذرہ، جوانائے خدا اور
نغمہ صبح

ناقدین کی رائے ہے کہ اگر پروین کی معرفت ایک نغمہ، سفر اشک، موجود
ہو تو اس کے علاوہ اس کا سب کلام ضائع ہو چکا ہوتا یا اس کے علاوہ
اس نے کوئی نظم نہ لکھی ہوتی تب بھی وہ فارسی شاعری میں ایک بلند
اور ارجمند مقام پر فائز ہوتی

اور بقول ملک الشہید، پروین نے جتنا کام اور جس ہموار و
فصاحت اور روانی و رد و بدلے خصوصیات و کیفیات سے متصف اس مختصر
مجموعہ میں فارسی شاعری کے ذخیرے میں انسا ذخیرہ ہے وہ فارغ البال مردوں
کو بھی میسر نہیں۔ ایک عارف عورت سے اس کی کیا توقع کی جاسکتی تھی سچی
بات یہ ہے کہ ایرانی شاعر اب تک کوئی ایسی عورت پر نہیں ہوئی
جن کے اندر شاعری کی یہ بیاد و ذوق پایا گیا ہو، اور جس نے اپنے
دوسرے تعلیمی اور گھریلو مشاغل کے باوجود اپنی نادر قسم کی نظمیں فارسی زبان میں
کہی ہوں۔

منابع

۱۔ دیباچہ دیوانی کے دوین از ملک الشعراء محمد تقی بہار خراسانی، ص ۱۳۱ شمس
تہران :- (بقیہ صفحہ پر)

دوسری قسط

اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام

بہمال جعفری

اقبال کی نظر میں عورت کا مقام ایک واضح نصب العین کہتا ہے جو نہ بہت قدیم طرز معاشرت کا قائل ہے۔ اور نہ فیشن آمیز جدید آوارگی کا اقبال کا نقطہ نظر عورتوں کے مقام کے تعین میں درمیانی راہ کا حامی ہے۔ اقبال عورتوں کو چہار دیواری میں مقید رکھنے کے بھی خلاف ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو محض جاہل و ناکارہ بنا کر ان کی زندگی تباہ نہ کی جائے۔ وہ جدید علوم کے قائل ہیں لیکن تعلیمی بے راہ روی پر ٹالاں ہیں، علوم تازہ کو اقبال نے کبھی غلط نہیں سمجھا۔

علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اقبال نے عورتوں کے حقوق کی پامالی پر اپنے غم کا اظہار بڑے سیکھے لہجے میں کیا ہے اور انہیں اس کا دکھ ہے کہ موجودہ سماج نے عورتوں کے جائز حقوق تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے۔

میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدہ مشکل کی کشور

حاصل کلام یہ ہے کہ اقبال کا پیغام قرآن پاک کی روشنی میں عورتوں کے لیے سراپا مبنی بر حقیقت ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "عورت مرد کا لباس ہے اور مرد عورت کا، اگر اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اقبال کا پیغام عورت کے لیے دہکا ہے جو خود خدا نے اپنی مقدس کتاب قرآن کے ذریعہ عورتوں کے لئے وضع کیا ہے۔"

تاریخ دعوت و جہاد برصغیر کے نظریں

مصنف :- عبید اللہ فہد قلاچی
تبصرہ نگار :- پروفیسر مولانا محمد تقی امینی

دعوت و جہاد، اسلامی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ اصل تاریخ، اسلام کی دعوت و جہاد ہی کی ہے۔ یہ تاریخ پچھٹی صدی عیسوی سے (جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی) نہیں بلکہ اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء علیہم السلام مجاہد تھے اور ان ہی کی بدولت انسان کی زندگی کو زندگی ملی۔ وہ اپنی قدروں سے واقف ہوا۔ اچھائی برائی، حلال و حرام، پاکیزگی و گندگی سے اس کو شہنامہ سانی ہوئی۔ دعوت و جہاد کی کارگزاری اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس سے بہت آگے تک جاتی ہے۔ دنیا کو آباد کرنے، اس کو ترقی دینے، تہذیب و تمدن کی شمع روشن کرنے میں انسان نے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔

وَكُلَّ لَكَ كُلُّ نَبِيٍّ اسْتَخْلَفَهُمْ فِي عَمَارَةِ الْأَرْضِ وَمِثْلَ الْأَنْفُسِ

و تکمیل نفوسہم و تنفیذا صرہ فیہم۔ (بیضاوی)

دعوت و جہاد اسلامی زندگی کا پھول ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اسلامی تاریخ سے جو ہر نکال کر اس کی جگہ شیخ ریزیوں سے پُر کرنے کی کوشش ہوتی رہی اور دعوت و جہاد کے اصل کردار و انجازات کو نمایاں کرنے کے بجائے تاریخ کو واقعات کی کھیتونی بنایا گیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب مسلم نوجوان اپنی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں، یعنی دعوت و جہاد کی تاریخ۔ ان کو ایسے نقوش درکار ہیں جن کے مطابق خود کو سیکر بنا سکیں۔ خاکے درکار ہیں جن میں وہ خود رنگ بھر سکیں۔ عزیزم عبید اللہ فہد فلاحی نوجوان برادری کے نہایت ذہین باصلاحیت اور ہونہار فرد ہیں جنہوں نے اس کتاب میں دعوت و جہاد کے نقوش اُبھارنے کی کوشش کی ہے اور خاکے پیش کیے ہیں جن میں رنگ بھرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ موصوف جاموہ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کے فاضل، پولیٹیکل سائنس کے طالب علم اور فہم قرآن میں مکتبہ فراہی کے شیدائی ہیں جن سے بجا طور پر توقع ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں گے۔ مختلف موضوعات پر کئی کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں، یہ ان کی اپنی تصنیف ہے جس کو نوا ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح ہے:

پہلا باب: عرب تاجر اور دعوت دین

دوسرا باب: مسلم سلاطین اور اشاعت اسلام

تیسرا باب: صوفیاء و مشائخ اور تبلیغ اسلام

چوتھا باب: تجدید و احیائے دین

پانچواں باب: تحریکات اسلامی

چھٹا باب: تحریکات آزادی

ساتواں باب :- تعلیمی تحریکات

آٹھواں باب :- بیسویں صدی کی چند شخصیات

نواں باب :- اقامت دین کی جدوجہد

انتساب :- جل پورہ صیہ بردش کے اس گنام مسلمان کے نام ہے جو دن میں ٹھیلے پر سبزی بیچتا پھرتا ہے اور رات میں واپس آکر تحریک اسلامی کا کام کرتا ہے۔ کتاب کا مقدمہ بیس صفحات پر مشتمل ہے جس میں اسلام کو بحیثیت ایک نظریہ ایک تحریک متعارف کرانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کی فہرست بھی ہے جس سے قارئین کو مطالعہ کی سہولت فراہم ہو جاتی ہے۔

پیش لفظ مولانا جلال الدین النہر عمر کی ایڈیٹر تحقیقات اسلامی علی گڑھ کا، اور تعارف پروفیسر اقبال انصاری کا سابق چیرمین اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تحریر فرمایا ہے۔ شروع میں مصنف نے التماس نامہ بھی شامل کر دیا ہے جو محسنوں کی خدمت میں بذریعہ تشکر ہے کہ من
لہم شکر الناس لہم شکر اللہ۔

کتاب کے مندرجات اور حالات کے تجزیہ میں بعض جگہ اختلاف کی گنجائش ہونا فطری بات ہے۔ لیکن دعوت و جہاد کی تار و پود کو اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش قابلِ صدمہ قرار کیا ہے۔ یہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے زمانہ سے اب تک کی دعوت و جہاد کی مختصر تاریخ ہے۔ ضرورت ہے کہ حضرت آدمؑ سے ہی دعوت و جہاد کی یہ تاریخ شروع کی جائے اور اس کے کردار و اثرات پر اس انداز سے ہمہ جہت روشنی ڈالی جائے کہ دنیا اس اعتراف پر مجبور ہو جائے کہ :-

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے یہ سب پودا اسی کی لگائی ہوئی ہے
 ہندوستان کی دعوتی و جہادی تاریخ پر مشتمل ۱۹۳ صفحات کی یہ کتاب آفسیٹ
 کی روشن کتابت و طباعت اور حلازب نظر و معنی خیز ٹائٹل اور بہترین کاغذ کے باوجود
 صرف تیس روپے میں بازار میں دستیاب ہے اتنی خوبصورت اور علمی کتاب کو
 اتنی کم قیمت میں پیش کرنے پر ادارہ ہندوستان اپنی کیسٹنرز دہلی تعریف و
 ستائش کا مستحق ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ عزیز موصوف کی اس کوشش کو
 قبول فرمائے اور مقبول بنائے، اور اس راہ کی اگلی حد و جہد کی توفیق دے
 اور اسان بنائے آمین!

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
 فیضانِ محبت عام، اسی عرقانِ محبت عام نہیں۔

(پروفیسر مولانا محمد تقی اعظمی)

بقیہ صفحہ ۵۶ کا۔

- ۲۔ فرہنگ دیوان پروین از ابو الفتح اعظمی = تہران = ۱۳۲۳ شمسی۔
- ۳۔ دیوان پروین اعظمی = طبع چہارم۔ تہران ۱۳۳۳ شمسی
- ۴۔ زنانِ سخنور (جلد اول) از علی اکبر مشیر سلیمی = تہران = ۱۳۳۵ شمسی

ماہنامہ برہان کا

مفتی عتیق الرحمن عثمانی نمبر

مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے تذکرہ کے بغیر، آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حیر و حیر کا کوئی بھی تذکرہ نامکمل سمجھا جائے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی وفات پر ڈھائی سال سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود کسی اور کی تو کیا کہیں خود برہان کو کوئی یادگار نمبر نکالنے کی توفیق نہ ہو سکی۔

اس تاخیر کے اصل اسباب میں خود میری تساہلی، مفتی صاحب کے معاصرین اور قدر دانوں کی پے پر والی اور ادارہ برہان کی مالی کمزوری کا بڑا دخل رہا ہے۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی یادگار میں کوئی بھی اشاعت اس وقت تک ناقص اور نامکمل رہے گی جب تک اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، پرنسپل نجم الدین، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، قاضی سجاد حسین، قاری محمد ادریس، امام جامع مسجد نئی دہلی، مولانا انظر شاہ کشمیری، عابد رضا بیدار، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا محمد سالم قاسمی، اور درجنوں ان مشاہیر کے تاثرات شامل نہ ہوں، جو مفتی صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ قریشی معاہدہ، عقیدہ تمندانہ اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے شایان شان نمبر کوئی یادگار اشاعت کی تکمیل اس وقت

تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ کم از کم ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم پہلے سے ادارہ برہان کے پاس موجود نہ ہو۔

اور یہ دونوں باتیں دشوار اور ناممکن نہیں کہ اس وقت تک وہ وسیع و عریض حلقہ موجود ہے جس میں مفتی صاحبؒ نے آدھی صدی سے زیادہ مدت تک اپنی ذہانت و خدمت کی شمعیں روشن رکھیں، اور ایک تاریک مستقبل کو روشن کرنے کی جدوجہد میں بے نظر مشقت کا مظاہرہ کیا، ان تمام مصنوعات پر غور کرنے کے بعد۔ اب یہ فیصلہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ۔

جنوری ۱۹۸۶ء میں برہان کا

مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ نمبر۔

شائع کر دیا جائے۔

۵۔ ۵۰ کے قریب صفحات پر پھیلے ہوئے اس نمبر کی قیمت کا اندازہ فی الحال ۵۰ روپیہ کیا گیا ہے۔
۵۔ اس کے لیے مفتی صاحبؒ کے قدر دانوں، اور اہل استطاعت سے درخواست ہے کہ وہ اس نمبر کے اخراجات کی تخمینہ رقم کے لیے مالی اعانت اور عطیات فراہم کرنے میں ادارہ برہان کے ساتھ تعاون فرمائیں۔

۵۔ اہل قلم اور اہل ان علم و سیاست سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے تاثرات زیادہ سے زیادہ نمبر کے پہلے ہفتہ تک ارسال فرمادیں۔

۵۔ برہان کے خریداروں سے بھی درخواست ہے کہ وہ مبلغ ۵۰ روپیہ پیشگی روانہ فرمائیں، تاکہ اگست نمبر کی کتابت، طباعت اور کاغذ کی فراہمی کا کام رکے نہ پائے۔

عطیات ہفتامین، اور چندہ کی ترسیل — عید الرحمان عثمانی، منیجر ماہنامہ برہان کے نام دہلی کے پتہ پر ہونی چاہئے۔

بھیل مہدی — ایڈیٹر — برہان —

دہلی۔

اپنے محسنوں کو فراموش ایک معذرو گزارش

حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی کی یاد میں جس خاص نمبر کے شائع کرنے کا اعلان کیا گیا ہے اس میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ اس تاخیر پر ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ دراصل ہر قیمتی نمبر کے لئے جس تحقیقی مواد اور معیار کی مضامین کی ضرورت ہے ابھی تک وہ فراہم نہیں ہو سکے۔

ہماری کوشش یہ ہے کہ یہ نمبر حضرت مفتی صاحب کے شایان شان ہو۔ اور اس میں حضرت مفتی صاحب کی ہر گز خدمات اور ان کی جامعیت اور ان کے اعتدالی و توازن پر سہرا حاصل روشنی طواری نہ ہو۔ ہم اس میں کتنا کامیاب ہو سکیں گے تو اُسے والا وقت ہی بتائے گا۔

اس سلسلے میں ہم اپنے قارئین سے اپیل کرتے ہیں کہ تحقیقی مضامین سے خواہ وہ بصورت نظم ہوں یا شعر ہمارا تعاون فرمائیں۔

اور جس حضرات کے پاس حضرت مفتی صاحب کے مکاتیب ہوں اس کے منتخبات اور مال ذرا لیں تاکہ اس نمبر کی افادہ ہو۔ مزید اضافہ ہو۔

مشہور تجارتی مراکز بھٹی ٹانک، راس، میراباد، لکھنؤ وغیرہ کے لوہے گزارش ہے کہ اپنی اپنی انکوائری میں مدرسوں کتابوں اور دواؤں نے اشتہارات دیکر رکاوٹوں کو دور فرمائیں۔

رہے ہی حضرت مفتی صاحب کے مقامی و بیرونی معتقدین و محسنین سے گزارش ہے کہ حضرت کی ملی و ملکی خدمات کے پیش نظر بصورت ایک ایسی ڈیسی قائم کرنے اور علاقہ جامع مسجد میں مفتی عتیق الرحمن یوڈیوڈم کرانے کے لئے پوری سعی فرمائیں۔ ہم آپ کے مسنون و شکر ہوں گے۔

نوٹ:- اشتہارات کا نرخ - کامل صفحہ - ۵۰۰ روپے اور نصف - ۲۵۰ روپے اور دوا - ۱۲۵ روپے
دستخط: سید مجتبیٰ

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد ۹	صفر المظفر ۱۴۰۷ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۶ء	شمارہ ۴
-------	-------------------------------------	---------

۱۔ نظرات	۲۔ عمید الرحمن عثمانی
۲۔ صحابہ کرامؓ کی تحصیل حدیث کی کیفیات	جناب مولوی محمد رفیع الاسلام ندوی
۳۔ امام ابو زرہ رازیؒ	ندوة العلماء۔ لکھنؤ
۴۔ الواح الصنادید	جناب السیراد روی
۵۔ اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء	ادری (اعظم گڑھ)
	۲۸ جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب
	۳۵ شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور
	مصنف: ڈاکٹر محمد طاہر علی
	تبصرہ نگار: عبدالرؤف خاں ایم اے
	۴۹

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بانار
جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

از عمید الرحمن عثمانی

دامائے راز علامہ اقبال نے کہا ہے اور بجا کہا ہے کہ

آدمیت احترامِ آدمی باخبر شوازمقامِ آدمی

انسان اس سرزمین پر خالق کائنات کا حسین شاہکار اور نائبِ سلطنت ہے اور اس میں ان تمام اوصاف اور کمالات کا ہونا لازمی اور ضروری ہے جو خود خالق کائنات نے اس کی ذات کے اندر ودیعت کر رکھے ہیں۔ اور ان سب میں اہم ترین صفت انسان شناسی ہے۔ اس میں خود اس کی اپنی ذات بھی شامل ہوتی ہے۔ جب انسان کو یہ ملکہ حاصل ہوگا تو وہ بجا طور پر خالق کائنات کا خلیفہ اور نائبِ سلطنت ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ انسان کو اپنی معرفت اور نوع انسانی کے عرفان کے لئے کیا کرنا ہوگا؟ ہمارے خیال میں اس کا آسان ترین اور تجربہ ترین نسخہ دنیا کے سب سے بڑے انسان اور مردِ کامل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر دنیا کو حیران کر دیا ہے کہ ”اوروں کے لئے اس بات کو پسند نہ کرو جو تمہیں اپنی ذات کے لئے پسند نہیں“ یا یہ کہ ”خدا کی قسم وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے کمرے سے اس کے پڑوسی پریشان ہوں۔“ یہ دور ہما اصول ہیں جن کو سامنے رکھ کر انسان بنتا ہے اور وہ آدمیت کا احترام کرنے لگتا ہے۔ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ کون انسان ایسا ہوگا جو اپنا قتل ہونا پسند کرے، کون انسان ہوگا جو اپنے ماں و متاع کو آگ لگانا پسند کرے، کون انسان ہوگا جو اپنے گھر کی عورتوں کی عصمتیں برباد ہوتے دیکھے اور خوش ہوتا رہے۔ کون انسان ہوگا جو اپنے عزیزوں، جگر کے ٹکڑوں اور دل کی راحوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے

نیزوں، بندوقوں اور ٹھپروں کا نشانہ بننا دیکھے اور وہ پاگل نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی اس وسیع و عریض سرزمین میں کہیں بھی کوئی انسان نہیں ملے گا۔ یورپ میں اس کا نام و نشان نہیں ملے گا۔ ایشیا میں اس کا وجود نظر نہیں آئے گا۔ افریقہ میں اس قسم کی ذلت شیعہ کا پتہ نہیں ملے گا، اور جہاں جہاں انسان رہتا ہے وہاں وہاں ایک بھی انسان ایسا نظر نہیں آئے گا جو اپنے سرمایہ جیٹ کو غارت ہوتا دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔ دنیا کے سب سے بڑے انسان نے فرمایا کہ جو چیز تمہیں اپنے لئے پسند نہیں اسے دوسروں کے لئے پسند نہ کرو۔ پس اگر دنیا کے کسی انسان کو اپنی ذات کے لئے اس قسم کی مجنونانہ حرکتیں پسند نہیں ہو سکتیں، تو وہ ان چیزوں کو اوروں کے لئے کیوں پسند کرتا ہے؟ اور پھر بھی اپنے انسان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ اس انسانی معاملے میں مذہب کے فرق کو کوئی دخل نہیں۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب دراصل انسان کو انسان بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ کون مذہب ہے جو غارتگری کی تعلیم دیتا ہے؟ کون مذہب ہے جو لوٹ مار سکھاتا ہے؟ کون مذہب ہے جو انسان کو وحشت و بربریت کا فلسفہ پڑھاتا ہے۔ تمام مذاہب کے بنیادی اصولوں کو دیکھا جائے تو یہ بات واضح طور پر نظر آئے گی کہ ہر مذہب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان انسان بنے تاکہ آدمیت کا احترام کرے اور آدمی کے مقام کو پہچانے اور اس طرح سے خود کو پہچانے۔ دنیا کے اس سب سے بڑے انسان نے یہ بھی فرمایا کہ تمام انسان اللہ کا کنبہ اور عیال ہیں۔ ایک گھر میں دس افراد ہوں گے اور تمام کے تمام خاندان کے افراد ہوں گے۔ ان افراد خاندان میں کون ایک کو دوسرے سے ممتاز سمجھتا ہے، کون آپس میں غارتگری کرتا ہے۔ اگر افراد خاندان میں اختلافات ہوں تو ان کو بوجہ احسن دور کیا جاتا ہے اور خاندان کو ایک دوسرے کی جان کا ہونے سے بچانے کے لئے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ انسان پیرائش کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں البتہ ذہنی طور پر ہر شخص کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک انسان کا دوسرے

انسان کے ساتھ اختلاف ہونا بھی فطری ہے اُسے روکا نہیں جاسکتا مگر اختلاف کو دور کرنے کے معاملہ میں انسان کو انسانیت کی شان کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اختلاف کو دور کرنے کے لئے اگر انسان بربریت اور بہیمیت کا مظاہرہ کرنے لگے تو وہ انسان اور انسانیت کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے۔

ہمارا ملک ایک نیم براعظم ملک ہے۔ مختلف تمدنوں کا گہوارہ ہے۔ اس میں قدرتی طور پر مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف معاشرتی رکھنے والے الگ الگ رنگ اور روپ کے لوگ موجود ہیں، صوبے صوبے میں اپنے اپنے رسم و رواج ہیں۔ رہن سہن کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ بول چال اپنی اپنی ہے مذاہب اپنے اپنے ہیں اور اسی اختلاف میں اتحاد بھی ہے اور کثرت میں وحدت پنہاں ہے کہ سب ایک سرزمین کے رہنے والے ہیں جن کے مفادات بھی مشترک ہیں اور نقصانات بھی۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ لگاتار بارشوں سے دریاؤں میں باڑھ آجاتی ہے تو وہ تباہی پھیلاتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ مسلمان کا کھیت تباہ ہو رہا ہے یا ہندو کا، محلے میں آگ لگ جاتی ہے تو آگ یہ نہیں سوچتی کہ ہندو کا گھر جلتا ہے یا مسلمان کا۔ اسی طرح خدا نخواستہ ملک پر بیرونی حملہ ہو تو حملہ آور اس ملک کے رہنے والوں کے چہروں کو دیکھ کر ان کی گردن نہیں پکڑے گا۔ اس کے سامنے جو آئے گا برباد ہو جائے گا۔ ہندوستان انگریز سامراج کی غلامی میں گرفتار رہا تو ہر ہندوستانی کے گلے میں غلامی کا طوق تھا۔ آزاد ہوا تو ہر ہندوستانی آزاد ہوا۔ اب جب یہ صورت ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے اور اس لڑنے جھگڑنے میں انسانیت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر حیوان بننے کا کیا جو آئے؟ مگر اس بات کا ہے کہ انسان حیوان بن رہا ہے وہ اپنی پیدائش کے مقصد کو بھول رہا، مقصد زندگی سے اعتراف کر رہا ہے۔ ہندو اپنے مذہب کی تعلیمات پر پانی پھیر دیتا ہے،

ہندو گوتم کے پیغام کی مٹی پلید کرتا ہے اور مسلمان امن و سلامتی کے پیغمبر کے پیغام سے
وگردانی کرتا ہے۔ سکھ اس ملک کے سب سے بڑے صوفی اور امن دوست مصلح نانک کے
صلح کل والے مسلک سے منہ موڑتا ہے اور ہر ہندوستانی بلا لحاظ مذہب و ملت جو اس
شرمناک خونی میں حصہ لیتا ہے، عہد حاضر کے ایک بہت بڑے انسان کی توہین کرتا
ہے جس نے اپنی جان ہندو مسلم اتحاد کے کاز کے لئے قربان کر دی اور جس کے خون کے
داغ ابھی تک ہندوستان والے اپنے دامن سے نہیں دھو پائے ہیں۔

ہماری پریشانی اور ہماری تشویش اس بات پر ہے کہ انسان بے رحمی کا شکار ہو رہا ہے۔
آزادی کے ۳۹ سال بعد بھی ایک فرقہ دوکفر فرقے کی تباہی کے درپے ہے مگر اس زیادہ پریشانی
اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان اپنی زریں زریں روایات کو خاک میں ملا کر
انسانیت کو رسوا کر رہے ہیں اور یہ اتنا بڑا نقصان ہے کہ ہم صدیوں تک اس کی تلافی نہیں
کریں گے۔ تاریخ بہت ظالم اور بے رحم ہوتی ہے وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ ایک وقت آئے
گا جب آج کی اس بربریت کی تاریخ پڑھی جائے گی اور آئندہ آنے والی نسل
ہم پر رحمت کی بجائے لعنت بھیجے گی۔ ہماری آنے والی نسلوں کو معلوم ہو گا کہ
ہندوستان کی جنگ آزادی لڑنے والا عدم تشدد کا پرچارک گاندھی خود
تشدد کا شکار ہوا اور ہندوستان کی تہذیب داغدار ہوئی تو وہ کیا کہیں گی
پھر جب ان کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ گاندھی صرف ایک دفعہ گولی کا شکار نہیں
ہوا بلکہ آزادی پالنے کے بعد بھی چار دہائیوں میں اس کا سینہ ہر روز گولیوں
سے پھینسی ہوتا آرہا ہے۔ مراد آباد میں اس پر قیامت برپا کی جاتی ہے۔
علی گڑھ میں اسے تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے۔ جمشید پور اور احمد آباد میں
اسے سولی پر چڑھایا جاتا ہے تو ظاہر ہے ہماری یہ آنے والی نسلیں ہم پر

درود و سلام نہیں، لعنت ہی بھیجیں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سوال ہر ہندوستانی کو اپنے آپ سے کرنا ہوگا اور خود ہی اس کا جواب بھی دینا ہوگا اور ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص اس سوال کا جواب دینا چاہے تو آسانی سے دے سکتا ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر ملک کا ہر باشعور انسان قدرتی طور پر تشویش میں گرفتار ہے۔ لیکن صرف تشویش میں گرفتار ہونا کافی نہیں بلکہ ہر درد مند دل والے انسان کو اس صورت حال کی اصلاح کے لئے حتیٰ الامکان کوشش کرنی ہوگی۔ ہر دانشمند اور صاحب فہم انسان پر یہ ایک انسانی اور قومی فریضہ ہے کہ وہ اس عذاب سے ملک کو نجات دلانے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ عام لوگوں پر یہ بات ذہن نشین کرنا ہوگی کہ بیرونی جارحیت کے مقابلے میں ملک کا اندرونی انتشار زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اندرونی انتشار بیرونی جارحیت کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کو غلام بنانے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ ہندوستانی قوم بحیثیت جمہوی صلیح پسند، روادار اور عالی حوصلہ ہے نسا دیوں، فسطائی قوتوں اور بد معاشوں کی ایک مٹھی بھر جماعت ملک کے امن اور ملک کی تہذیب کو برباد کر دیتی ہے اور افسوسناک بات یہی ہے کہ اتنی بڑی صلیح پسند قوم اس مٹھی بھر گروہ کا قمع قمع نہیں کر سکتی۔ اس کے عزائم کو خاک میں ملا نہیں سکتی اور اس کے ارادوں کو ناکام نہیں بنا سکتی۔ دانشور طبقے کا یہی کام ہے کہ وہ قوم کو ایک سمت دیں اور

اسے خبردار کریں کہ مفسدہ پردازوں کی اس مٹھی بھر جماعت کا صفایا کر دے۔
یہ واقعی بڑی شرم کی بات ہے کہ صرف چند غنڈے اتنی بڑی قوم کو
یرغمال رکھنے میں کامیاب ہو رہے ہیں اور قوم اس کا تدارک نہیں
کر سکتی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ غنڈوں اور بد معاشوں کا کوئی مذہب
نہیں ہوتا۔ اُن کا اگر کوئی مذہب ہے تو وہ فساد فی الارض ہے
اور اس طرح افراتفری بپا کر کے اپنے حقیر مفادات کی حفاظت کرنا ان کا
دین بھی ہے اور دھرم بھی۔ یہ منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی دیندار
مسلمان فساد کا روادار ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ ایک انسان کے بلا وجہ قتل کو
قرآن مجید نے تمام عالم انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ ہم یہ نہیں مان سکتے
کہ ایک سچا ہندو امن کو درہم برہم کرنے اور قتل و غارت کو ہوا دینے
کا ناپاک کام کرے گا کیونکہ اسے اپنے مذہب اور دھرم نے بتایا ہے
کہ عدم تشدد سب سے بڑا دین اور سب سے بڑا مذہب ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تشدد، تعصب، نفرت، دہشت
انگیزی، تنگ نظری اور فرقہ واریت کی لعنتوں سے ملک کو پاک
کرنے کے لئے انسانیت، آدمیت اور احترام آدمیت کا سبق ملک
کے کو نے کو نے میں پھیلا دیا جائے۔ انسانیت، شرافت، محبت کا
پیغام سب سے بڑا پیغام ہے۔ انسان کو حقیقی انسان بنانے کی طرف راغب
کرنے کا کام سب سے بڑی عبادت ہے۔ نفرت ایک آگ ہے

جس میں خود نفرت کرنے والہ بھی چل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ محبت آپ حیات ہے جو قوموں کو رہتی دنیا تک زندہ رکھتی ہے۔ بہر حال س
جو ارباب سیاست ہیں وہ سیاست دنیا
میر پر پیام محبت ہے جہاں تک پہنچے

معزز قارئین ! ہمیں شرمندگی ہے کہ مفکر ملت حضرت مولانا مفتی
علیق الرحمن عثمانی علیہ الرحمہ کے شایان شان اب تک برہان کا خصوصی شمارہ
منظر عام پر نہیں آ سکا۔ کوشش برابر جاری ہے اور اس سلسلہ میں محترم قبلہ
ہمیں مہدی، قبلہ مولانا فقیہ الدین، مولانا سعید انیس احسن، مولانا
محمد سعید الرحمن شمس مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر اور راقم نمبر کی ترتیب اور مواد
کی فراہمی میں مصروف کار ہیں۔ امید ہے کہ اللہ نے نئے سال کے
آغاز میں یہ دستاویزی پیشکش نذر قارئین ہو سکے گی، آپ سے
دعا کی درخواست ہے۔

نوٹ : حضرت مولانا حکیم محمد زماں صاحب حبیبی مدظلہ رسالہ برہان
کے سرپرست اور مدیر اعزازی جناب مولانا قاضی اطہر مبارک پوری صاحب
مدظلہ ان حضرات کی موجودگی کے بغیر یہ اہم کام میں سمجھتا ہوں کہ پایہ
تکمیل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ (شکریہ)

صحابہ کرامؓ کی تحسیل حدیث کی کیفیت

جناب مولوی محمد رفیع الدین صاحب دہلی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اسلامی شریعت میں قرآن کریم کے بعد دوسرا درجہ حدیثؓ کا ہے اور اس پر عمل کرنا اسی طرح واجب اور فرض ہے جس طرح قرآن پر۔۔۔ حدیث ایک ایسا مستند اور معتبر ذخیرہ ہے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، آپ کے اقوال و افعال، آپ کی سیرت و شماتت، آپ کے عادات و اطوار اور اخلاق و اوصاف غرض یہ کہ حیات طیبہ کا ایک گوشہ ہمارے سامنے پورا طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کی حیثیت تاریخ کے ان ذخیروں کی سی نہیں جن کا اساس محض چند افواہوں، سنی سنائی یا زاری باتوں، مجہول کرم خوردہ مخطوطات یا کچھ الواح ہے۔ بڑھ کر نہیں ہونسی زمانہ میں قلم بند کر لی جاتی ہیں اور جن کے نہ راویوں کا پتہ چلتا ہے نہ ان کے اقوال معلوم ہوتے ہیں بلکہ حدیث ایک ایسی مستند و متداول ہے جس کے عینی مشاہدین لاکھوں کی تعداد کو پہنچ ہوئے ہیں اور جس کے راویوں کی پورا زندگی ہمارے سامنے واسطہ ہے۔

تاریخ کے عام ذخیروں سے حدیث کا امتیاز :

حدیث نبویؐ کو عام تاریخی ذخیروں سے صرف یہ ایک چیز ممتاز ہے کہ

بلکہ اس سے بھی اہم امتیاز یہ ہے کہ موقین کا اپنی تاریخ سے کوئی قلبی ربط نہیں پایا جاتا۔ اولاً تو تاریخ کے اولین راویوں کا پتہ ہی نہیں چلتا پھر اگر عرصے بعد کے کسی مؤرخ کا نام بھی ملتا ہے تو نا ہر سہ کہ تاریخ سے اس کا قلبی ربط اور باہمی تعلق مفقود ہوتا ہے برخلاف اس کے صحابہ کرام کا جو قلبی تعلق، باہمی ربط اور شدید محبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور احادیث نبویہ سے تھی وہ روزِ نشن کی طرح عیاں ہے۔ حضرات صحابہ کو آپ کی ذات سے جو حقیقی عشق تھا اس کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ آپے ماں باپ اور عزیز و اقارب تک کو آپ پر مذاکرے کو تیار رکھتے تھے اور اپنی جان و مال کو آپ کے ایک اشارے پر قربان کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ تاریخ شاید یہ ہے کہ غزوہ بنوک کے موقع پر آپ کا اشارہ پاتے ہی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اپنے ثلث مال سے جیشِ غمرہ کی تجہیز کرتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنا نصف مال لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنا کل مال لا کر آپ کی خدمت میں ڈھیر کر دیتے ہیں اور اپنے پیچھے اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسول کا ذکر چھوڑ آتے ہیں۔ غزوہ احد میں جب جثثیں وفداکاری کا موقع نصیب ہوتا ہے تو حضرت ابو جحشؓ اپنے جسم کو ذاتِ رسول کے لئے ڈھال بنا دیتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ آپ کے سامنے سینہ سپر ہو کر دشمنوں کے تیروں کا جواب دیتے ہیں اور کچھ جانشین صحابہ آپ کے گرد حصار کر کے آپ کو دشمنوں کی ایذا سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ ایک صحابیہ اپنے پدر، فرزند اور خواہر کی شہادت کی خبر سننے کے باوجود جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخیر و فاقیت دیکھ لیتی ہیں تو ان کی زبان سے بے اختیار نکل پڑتا ہے۔ کل مصیبت بعد ک جمل را آپ کو یسیرت دیکھ لینے کے بعد ہر مصیبت گوارا ہے) صحابہ کرام کے آنحضرت سے انتہائی محبت کی اس سے

اعلیٰ مثال اور کیا ہوگی جو ایک دشمن اسلام کی زبان سے بیان ہوئی ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود نے قریش کو مخاطب کر کے کہا تھا:

یا معشر قریش واللہ إلی ما ہا ایت
ملکافی قوم قط مثل محمد فی اصحابہ
ولقد ہا ایت ما یصنع بہ اصحابہ
لا یتوضأوا الا ابتداء وا وضوءہ
ولا یصق بسات الا ابتداء وروہ
ولا یسقط من شعرہ شیء الا
أخذوا۔ (سیرت ابن ہشام)

اے قریش کے لوگو! خدا کی قسم میں نے محمدؐ کی طرح کبھی کسی قوم کے بادشاہ کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ دھوکے دیتے ہیں تو لوگ ان کے مستعمل پانی کے سے دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ تھوکتے ہیں تو وہ ان کا تھوکر۔ اصل کرنے کے سے دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ ان کے ایک بال کو بھی گرنے نہیں دیتے اور اسے حاصل کر لیتے ہیں۔

یوں اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت کی وجہ :

جو شخص بھی جاہلیت اور اسلام دونوں کا موازنہ کرے گا وہ باسانی اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ صحابہ کرام کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجہ تہی تعلق کیوں تھا؟ ”جاہلیت“ جس کا نام سنتے ہی چاری آنکھوں کے سامنے وحشت و بربریت ظلم و ستم، جنگ و ہرجال، لوٹ مار و خون ریزی، باہمی عداوت و دشمنی اور اس سے بڑھ کر فحشائت و گمراہی کی بھیانک تصویریں آجاتی ہیں۔۔۔ کے گستاخوں و احوال سے نکل کر انہیں امن و امان، عدل و انصاف، اخوت و محبت، اور ہر ایت و حق کی طرف لانے والی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو تھی جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ قرآن کریم اس انسان کا بھراحت ذکر کرتا ہے :

وَادْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً
فَأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبِرْتُمْ بِنِعْمَةِ
إِخْوَانِكُمْ - وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ
مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا -
(ال عمران - ۱۰۳)

اپنے اوپر ہونے والے خدا کے احسانات
کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے اس
نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم آپس
میں بھائی بھائی ہو گئے۔ تم ایک آگ کے
گڈبھے کے کنارے کھڑے تھے اس نے تم کو

اس سے نجات دی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا طبعی تقاضہ :

صحیحہ کرم کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت، عشق اور بی پایان
طبعی تقاضہ تھا کہ آپ سے آپ کی تعلیمات اور خدا کے احکام حاصل کرنے، پھر اسے
اپنی زندگیوں پر جاری و ساری کرنے میں پوری کوشش صرف کر دیں جنہوں نے
ان کو ضلالت و جہالت کو تاریکی سے نکال کر نور حق کی شاہراہ پر ہدایت فرمایا تھا اور
یہ مذہب اور وحشت ناک زندگی سے نجات دل کر ایک پاکیزہ اور مہذب
نہایت عطا کیا تھا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام کہ قرآن و حدیث حاصل
کرنے اور حضور اکرم کے اسوہ کو اپنی زندگیوں پر لایق کرنے کا غایت درجہ شوق
تھا، چنانچہ وہ ہر اس عمل کی طرف دوڑ پڑتے تھے جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کو کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور ان اعمال سے نور اجتناب کر لیتے تھے جنہیں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ
ایک بار آنحضرتؐ نے سونے کی انگوٹھی بنوائی تو صحابہ کرامؓ نے بھی بنوائی پھر رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھینک دیا اور فرمایا اب کبھی نہیں پہنوں گا چنانچہ تمام صحابہؓ
نے بھی پھینک دی (بخاری) اسی طرح ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ نماز ہی میں اپنے جوتے نکال دیے

تمام صحابہ نے آپ کی نقل کرتے ہوئے اپنے اپنے جوتے نکال دیے۔ نماز کے بعد سچے نے صحابہ سے پوچھا کہ تم لوگوں نے جوتے کیوں نکال دیے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے بتایا تھا کہ میرے جوتے میں گند آگئی ہوئی ہے (کتاب الشفاء بن عبد البر) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کی اتباع کرتے تھے حتیٰ کہ ایک بار حج کرنے جا رہے تھے راستے میں اونٹ سے اتر کر ایک جگہ بیٹھ گئے پھر اٹھ گئے۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا کہ ایک بار میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ آپ نے یہیں بیٹھ کر استنجا فرمایا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و افعال کی اتباع کرتے ہوئے دیکھتے تو انہیں پاگل سمجھتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک بار جمعہ کی نماز پڑھتے جا رہے تھے ابھی دروازے ہی تک پہنچے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ میں فرماتے سنا "اجلسوا" فوراً وہیں بیٹھ گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو بولیا۔ ان روایات و عوامل و بواعث کے ساتھ ساتھ کچھ اور عوامل تھے جو صحابہ کرام کے قرآن و حدیث کے شوق و حصول میں بیکار فرماتے تھے۔

صحابہ کرام کے تحصیلِ قرآن و حدیث کے عوامل :

۱۔ ان کے سامنے قرآن کریم اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے کی بہت سی فضیلتیں بیان کی تھیں اور علماء اور غیر علماء کے درمیان بہت بڑا فرق بتلایا تھا۔ مثلاً :

إِنَّهُ يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

خدا سے اس کے بندوں میں سے صرف

رفقہ - ۱۶۸

علماء ڈرتے ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

صاحبِ علم اور غیر ذی علم کھلا برابر

ہو سکتے ہیں :

فدا ہونوں اور اصحاب علم کے درجات
بڑھاتا ہے۔

ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے
بڑھ کر ہے۔

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جسے
میری نصیحت ایک ادنیٰ امتی کہے۔

جو شخص علم کے راستے میں چسے گا اللہ اس
کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمائے گا۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

فرشتے طالب علم کے لئے اس کے عمل
سے خوش ہو کر پڑھاتے ہیں۔

۲۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و عمل
اور ہر نمونہ کو اختیار کریں اور اپنی زندگیوں پر جاری و ساری اور نافذ کریں
رسول نے انہیں جس چیز کا حکم دیا ہے
اس پر عمل کرو اور جس چیز سے منع کیا
ہے اس سے رک جاؤ۔

ہم رسول کو اسی لئے بھیجتے ہیں کہ خدا کے
حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

لَا يَتْلُمُونَ - (الزمر - ۹)

يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ

أَتَوْا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (مجادلہ - ۱۱)

فَفِيهِ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ

مِنَ الْفِرْعَوْنِ عَابِدِ تَرْمِذِي - (ابن ماجہ)

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ

كَفَضْلِ عَلِيٍّ أَدْنَاكُمْ (ترمذی)

مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ

عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا

إِلَى الْجَنَّةِ (احمد، رمذی، ابوداؤد)

الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ -

إِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَقَعُ اجْنَحَتُهَا

لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًا بِمَا صَنَعَ -

(ابوداؤد، ترمذی)

۳۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و عمل

اور ہر نمونہ کو اختیار کریں اور اپنی زندگیوں پر جاری و ساری اور نافذ کریں

رسول نے انہیں جس چیز کا حکم دیا ہے

اس پر عمل کرو اور جس چیز سے منع کیا

ہے اس سے رک جاؤ۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ

وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا -

(حشر - ۱)

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ إِلَّا بِطَاعَةِ

رَبِّكَ اللَّهُ - (نساء - ۵۸)

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

(آل عمران - ۳۱)

وَلَكُمْ فِي مَآسُورِ اللَّهِ
أَسْوَأَ حَسَنَةٍ (احزاب - ۳)

اے رسول! کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت
کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم
سے محبت کرے گا۔

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین
اسوہ ہے۔

۳۔ ان پر صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی اتباع
ہی غروری نہ تھی بلکہ مزید برآں یہ بھی فریضہ شائد تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سے ہونچ سنین اور جو کچھ دیکھیں اسے دوسروں تک پہنچائیں۔

تم بہترین امت میرے لوگوں کے لئے پیدا
کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائیوں
سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے
ہو۔

تم میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہو جو خیر
کی طرف دعوت دے نیکیوں کا حکم دے
اور برائیوں سے روکے۔ دراصل ایسے
ہی لوگ خارج پانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاداں و فرماں
رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے
یاد رکھا پھر جس طرح ست تھا اسی طرح
دوسروں تک پہنچا دیا۔

میں نے تم لوگوں میں دو چیزیں چھوڑی

(آل عمران - ۱۱۵)

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران - ۱۰۴)

نَصْرَ اللَّهِ إِسْرًا سَمِعَ مَقَالَتِي وَنَعَاَهَا
شَمَادًا هَا كَمَا سَمِعَ

(صحاح)

تَرَكْتُ فِيكُمْ شَيْئَيْنِ لَنْ تَضِلَّوَا

بعد ہا کتاب اللہ و سنتی
ولن یتفرقا

(صحاح)

أول ما يبلغ الشاهد الغرض

فرب مبلغ أوعى من سامع

(صحاح)

تسمعون وسمع منكم وسمع

من الذين يسمعون منكم

(ابوداؤد - مستدرک)

ہیں ان کو پاٹنے کے بعد بھی گمراہ نہ
ہو گئے کتاب اللہ اور میری سنت ۔

بشرطیکہ دونوں جدا نہ ہوں ۔

سن لو یہ جو شہادتیں کتاب کو سب کچھ بتا دے

بسا اوقات پہنچا یا جانے والا شخص سننے

والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے ۔

اس وقت تم لوگ سن رہے ہو پھر تم

سے سنا جائے گا پھر تم سے سننے والوں

سے سنا جائے گا ۔

۴۔ انہیں جو کچھ معلوم تھا اسے چھپنا اور غلط بیانی سے کام لینا سخت جرم

اور گناہ سمجھتے تھے اور اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اور خدا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے متعدد ذبیحات و زغیر میں بیان فرمائی تھیں :

جو لوگ ہماری نازل کردہ کھلی نشانوں

اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جبکہ ہم نے

انہیں لوگوں کے لئے کتاب میں واضح

کو دیا ہے ان لوگوں پر اللہ بھی لعنت

کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا

مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنَّا

مَكْتُمِينَ إِنَّا سَنُلَاقِيهِمْ

أَوَّلَ آيَةٍ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَ

اللَّاعِنُونَ

(البقرہ ۱۵۹)

من سنن عبد شمس کہ : الحجۃ یوم

القیامۃ بلجام مہم الثانی ۔

(ابو داؤد ترمذی)

لو کسی سے کچھ پوچھا جائے اور وہ اس کو

چھپائے تو قیامت کے دن اس کے

منہ میں آگ کا دھماکا زلزلہ ہو جائے گی ۔

مَنْ كَذَبَ عَلَىَّ مُتَعِدًّا فَلْيَتَبَوَّأْ
مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

جو مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنا
ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

(حدیث متواتر)

صحابہ کرامؓ کا حدیث میں غایت درجہ اشتیاق :

ان عوامل و اسباب کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے اور آپ سے قرآن و حدیث کی تعلیمات و احکام حاصل کرنے کا بے انتہا شوق پایا جاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ اپنی معاشی اور دیگر مصروفیتوں کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہونے کی کوشش کرتے۔ ان میں ایک جماعت ایسی تھی جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی "ملازمت" اختیار کر لی تھی اور سفر و حضر، گھر بازار، ہر وقت اور ہر جگہ آپ کے ساتھ رہتی تھی اور جس کا کام ہی یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر قرآن و حدیث حاصل کرے اور دوسروں تک پہنچائے۔ اس مقدس و مبارک جماعت کو ہم "صحابہ کُفَّہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس جماعت کے سرخیل حضرت ابوہریرہؓ اس پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

إِنكُمْ تَزْعُمُونَ أَنِّي أَبْهَرُ سِرًّا
يَكْثُرُ الْأَحَادِيثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَاللَّهِ...
كُنْتُ رَاجِلًا مَسْكِينًا أَصْحَبَ
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
بَطْنًا وَكَانَ الْمُهَاجِرُونَ يَشْغَلُهُمُ الصَّنَقُ
بِالْأَسْوَاقِ وَكَانَتْ الْأَنْصَارُ تَشْغَلُهُمُ
الْقِيَامُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ۔ (مسلم ج ۲)

تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت احادیث روایت کرتا ہے۔ خدا کی قسم میں غریب آدمی تھا۔ قوت لایموت کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا جبکہ مہاجرین تجارت میں مشغول تھے اور انصار اپنے اموال کی حفاظت میں لگے رہتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت آیا جایا کرتے تھے حتیٰ کہ صحابہؓ یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ بھی اہل بیت میں سے ہیں (دارمی) ان سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ تم ہر وقت میرے گھر میں داخل ہو سکتے ہو اور کھلے چھپے سے باخبر ہو سکتے ہو۔

جو صحابہؓ معاشی مشاغل کی وجہ سے روزانہ حاضری نہ ہو سکتے تھے انہوں نے آپس میں یہی مقرر کر لی تھی چنانچہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ واپس جا کر اپنے ساتھی کو پورے دن کی خبریں پہنچاتا۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں :

کنت أنا وجارٹی من الانصار
من بنی امیہ بن ناید۔ وہی
من عوالی المدینۃ۔ وکنا
فتناوب النزول علی عہد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم۔ ینزل یوما
وانزل یوما فاذا نزلت جئت بخبر
ذلک ایوم من وحی وغیرہ
واذا نزل فعل مثل ذلک۔

میں اور میرا ایک پڑوسی جو قبیلہ بنی امیہ بن زید
میں سے تھا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
مجلس میں باری باری آیا جایا کرتے تھے۔
ایک دن وہ آتا ایک دن میں۔ جس دن
میں آتا اس دن کی تمام خبریں وحی اور اس
کے علاوہ دیگر چیزیں سب اس کو بتلا دیتا
تھا اور جس دن وہ آتا وہ بھی ایسا ہی
کرتا۔

(بخاری کتاب العلم)

جو صحابہؓ بہت دور رہتے تھے وہ وقتاً فوقتاً اپنے وفود اور نمائندوں کو بارگاہ رسالت میں بھیجتے تھے تاکہ آپ کے پاس چند دن ٹھہر کر اسلامی احکام اور تعلیمات حاصل کریں اور پھر واپس اپنی قوم میں جا کر تعلیم و ارشاد کی خدمت انجام دیں۔ حضرت مالک بن الحویرثؓ فرماتے ہیں :

أَتَيْنَا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ
شَبِيحَةٌ مُتَقَارِبُونَ فَأَقَامْنَا عِنْدَهُ عَشْرِينَ
لَيْلَةً نَظُنُّ أَنَّنَا اسْتَقْنَا أَهْلِيْنَا
وَسَأَلْنَا عَنْ تَرْكِنَا فِي أَهْلِنَا
فَأَخْبَرَنَا هَا وَكَانَ رَفِيقًا رَاحِمًا
فَقَالَ ارْجِعُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ
فَعَلُّوهُمْ وَمَرُّوهُمْ۔

(صحیح بخاری)

ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہوئے۔ ہم لوگ ادھیر طبر اور
ایک ہی عمر کے تھے ہم آپ کی خدمت میں
بیس دن رہے حتیٰ کہ آپ گمان کرنے
لگے کہ ہم اپنے اہل و عیال کے خشتاق ہو گئے
ہیں لہذا آپ نے ہم سے ان کے بارے
میں پوچھا ہم نے آپ کو بتلایا۔ آپ کا پتاؤ
ہمارے ساتھ بہت ہی رحمت و رافت کا
تھا۔ پھر فرمایا اپنے اہل و عیال کی طرف
واپس جاؤ، انھیں تعلیم دو اور نیکیوں
کا حکم دو۔

اسی طرح اگر کوئی صحابی دور رہتا ہوتا اور اسے کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی
اشکال ہوتا تو وہ فوراً مدینہ طیبہ روانہ ہو جاتا اور طویل مسافت طے کر کے آپ کی خدمت
میں حاضر ہوتا اور اس واقعہ میں حکم الہی دریافت کرتا۔ حضرت عقبہ بن الحارث کا ایک
مشہور واقعہ ہے کہ ایک عورت نے انھیں بتلایا کہ اس نے ان کو اور ان کی بیوی دونوں کو
دودھ پلایا ہے۔ وہ فوراً مدینہ روانہ ہوئے یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے
شادی کر لے پھر بعد میں معلوم ہو کہ وہ اس کی رضاعی بہن ہے تو اس کا کیا حکم ہے۔
آپ نے فرمایا کینہ و قد قیل (اب کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کہا جا چکا) چنانچہ
انھوں نے فوراً اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی۔

اسی طرح جو صحابی کسی سر یہ میں چلے جاتے یا کسی وجہ سے پیچھے رہ جاتے وہ

واپس آکر دوسرے صحابہؓ سے تمام احادیث معلوم کر لیا کرتے تھے۔ حضرت ہر ائمہ بن عازب فرماتے ہیں :

ما كل الحديث سمعناه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يحد ثنا أصحابنا وكننا مشغولين في رعاية الإبل وأصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا يطلبون ما يفوته سماعه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمعوا من اقتراهم.

تمام احادیث ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی ہیں ہم سے بھی اب حدیث بیان کرتے تھے اور ہم اونٹوں پر چرانے میں مشغول رہتے تھے۔ اصحاب رسول اگر کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سُن پاتے تھے تو اپنے رفقاء سے حاصل کر لیتے تھے۔

(معرفة علوم الحديث)

حضرات صحابہؓ کا معمول تھا کہ جو احادیث وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں سنتے تھے وہاں سے اٹھنے کے بعد آپس میں مذاکرہ کر لیتے تھے تاکہ اگر کسی کو ٹھیک سے یاد نہ ہوئی ہو تو سچتہ ہو جائے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں :

كنت اكون عند النبي صلى الله عليه وسلم فنسمع هذه الحديث فاذا قمنا تذكرة فيها بيننا حتى نحفظها.

میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے تھے تو آپ سے احادیث سنتے تھے پھر جب آپ کے پاس سے اٹھتے تھے تو مذاکرہ کر لیتے تھے یہاں تک کہ انہیں یاد کر لیتے۔

(الجامع لأخلاق وأدب السامع)

صحابہ کرام کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں حدیث کے غایت در

اشتقاق کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان سے کوئی ایسا بھی سوال کرتے جس کا جواب پوری طرح واضح ہوتا پھر بھی وہ جواب دینے کے بجائے فرما دیتے: **اَعْلَمُ** (اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے) کہہ دیا کرتے تھے کیونکہ وہ سوچتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذریعے کوئی نئی حکمت عملی بتانا چاہتے ہوں۔ احادیث کے ایک بڑے ذخیرہ میں ہم یہ شے دیکھتے ہیں جتہ اللہ اع کے مشہور خطبے میں جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ یہ کون سا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ یہ کون سا شہر ہے؟ ہر سوال کے جواب میں صحابہ فرماتے: **اللہ ورسولہ اعلم** پھر خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے: کیا یہ یوم عرفہ نہیں ہے؟ کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ کیا یہ بلد حرام نہیں ہے؟ پھر آپ نے فرمایا:

ان دماءکم و اموالکم حرام علیکم
 الی ان تا قوا ربکم بحرمۃ یومکم
 هذا فی شہرکم هذا
 فی بلدکم هذا۔ (بخاری)

تمہارا خون اور تمہارے اموال تم پر
 قیامت تک حرام ہیں جس طرح آج
 کے دن کی حرمت اس مہینہ کی حرمت
 اور اس شہر کی حرمت ہے۔

اسی طرح حدیث جبریل میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمزہ سے پوچھا: **اَتَدْرِیْ مِنْ السَّائِلِ** (جانتے ہو یہ پوچھنے والے کون تھے؟) انہوں نے عرض کیا: **اللہ ورسولہ اعلم** فرمایا: **انما جبریل** اُتاکم ایحکم دینکم (یہ جبریل تھے جو تم لوگوں کو دین کی باتیں سکھانے آئے تھے) (متفق علیہ)

صحابہ کرام کا قوی حافظہ:

تحفیں حدیث کے سلسلہ میں صحابہ کرام کا اس درجہ اشتقاق انہیں احادیث کے حفظ و اتقان پر اسکا تا تھا اور وہ احادیث کو یاد کر کے محفوظ کرنے میں پوری

کوشش صرف کرتے تھے۔ پھر یہ کہ صحابہ بلکہ عرب کی اکثریت جاہل اور آن پڑھ تھی۔ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ ان کی تاریخ کا پورا دار و مدار ان کے حافظے پر تھا۔ خدا نے انہیں حافظہ کا انتہائی قوی ملکہ عطا فرمایا تھا حتیٰ کہ روایتوں میں آتا ہے کہ وہ اپنے جانوروں تک کی پشت پر پشت کی نسلوں سے واقفیت رکھتے تھے۔

حافظہ پر پورا اعتماد ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کی اکثر تعداد احادیث کو حفظ کرتی تھی۔ ابتداء اسلام میں احادیث کی عدم کتابت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسا کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور یہ کند ذہنی اور غباوت کی علامت تھی۔

حدیث کے تحمل و ادا میں صحابہ کے مراتب :

چنانچہ حدیث کے تحمل و ادا میں تمام صحابہ کرام برابر نہیں تھے بلکہ ان میں مراتب تھے۔ بعض صحابہ بڑھے ہوئے تھے بعض کچھ کم تھے۔ اس لئے کہ :

۱۔ بعض صحابہ ہر وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے مگر بعض دیگر مصروفیات کی وجہ سے کم کا سر ہو پاتے تھے اور جو صحابہ دور رہتے تھے ان کو اس کا موقع کم ہی نصیب ہوتا تھا۔

۲۔ صحابہ کرام کی اکثر تعداد احادیث کو زبانی یاد کرتی تھی اور لکھنے کا رواج نہ تھا مگر چند صحابہ احادیث کو ضبط تحریر میں لاتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میرے سب سے زیادہ احادیث روایت کی ہیں مجھ سے زیادہ صرف عبداللہ بن عمرؓ کی روایات ہیں اور وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ لکھتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا۔ (بخاری کتاب العلم)

۳۔ بعض صحابہ فطری استعداد میں کچھ سے فقہ حدیث میں بڑھے ہوئے تھے چنانچہ وہ تاریخ و منسوخ عام و خاص، مطلق و مقید اور مجمل و مفتر وغیرہ سے بخوبی واقف تھے مگر بعض ذہن و دیت میں اس درجہ کے نہیں تھے، چنانچہ مروی ہے

کہ ایک بار حضرت عمر بن الخطابؓ نے صحابہ کی ایک مجلس میں سوال کیا کہ سورۃ نصر کا شان نزول کیا ہے؟ کوئی صحابی صحیح نہیں بتلا پایا۔ حضرت ابن عباسؓ نے — جو اس وقت بھی کم سن تھے — بتلایا کہ ہوا اجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أعلمہ، قال إذا جاء نصر اللہ والفتح فذلك علامة أجلك فسبح بحمد ربك الخ (بخاری کتاب التفسیر) اس سے مراد رسول اللہؐ کی وفات کی خبر ہے جو انھیں بتلائی گئی ہے یعنی جب خدا کی مدد اور فتح آجائے تو وہ تمھاری وفات کی علامت ہے لہذا خدا کی تسبیح بیان کرو الخ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی مجالس:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحابہ کرام کو ہر وقت تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت سے نوازتے تھے۔ آپؐ کی حیثیت ایک معلم و مربی کی سی تھی آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو دعوت و تربیت سے معمور تھا۔ آپؐ ہر وقت اور ہر جگہ تعلیم و تربیت میں مشغول ہوتے۔ آپؐ کے لئے کوئی جگہ یا کوئی وقت مخصوص نہ تھا۔ آپؐ جنگ میں ہوتے تو وہاں بھی معلم و واعظ ہوتے اور لوگوں میں اپنے وعظ سے جوش و ولولہ پیدا کرتے، اگر سفر میں ہوتے تو وہاں بھی مرشد و ہادی ہوتے۔ گھر میں اہل و عیال کے ساتھ ہوتے تو انھیں بھی تعلیم دیتے۔ بازار جاتے تو وہاں لوگ روک کر مسئلہ پوچھ لیا کرتے اور مسجد نبوی میں ہوتے تو وہاں بھی لوگوں کو وعظ و نصیحت سے نوازتے۔

البتہ یہ بات ضرور تھی کہ آپؐ کی اکثر مجلسیں مسجد نبوی ہی میں ہوتی تھیں، جہاں صحابہ نماز کے اوقات میں جمع ہوتے اور آپؐ انھیں درس و تعلیم دیتے تھے، اوقات نماز کے علاوہ بھی جب کوئی اہم معاملہ ہوتا تو آپؐ لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیتے اور ان کے سامنے تقریر فرماتے۔ ایک بار سورج گرہن

ہوا۔ اسی دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم کا انتقال ہوا تھا۔ لوگ کہنے لگے کہ پیغمبر کے بیٹے کی وفات کے سوگ میں سورج گرہن ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَنْكَسِفَانِ
لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ
أَيَّتَانِ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ -
سورج اور چاند میں کسی کی موت و حیات
سے گہن نہیں پڑتا بلکہ وہ دونوں خدا
کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔

(ابوداؤد)

اسی طرح حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ کے ہاتھ نیچتے وقت ان کے آقا نے یہ شرط لگائی کہ حق ولایت ہمارا ہی ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا اُولَاءِ لِمَنْ اَعْتَقَ (حق ولار، تو آزاد کرنے والے ہی کا ہوگا) اس کے بعد آپ مسجد شریف لے گئے اور صحابہ کو جمع کر کے تقریر کی اور فرمایا:

مَا بَالُ رَجُلٍ يَقُولُ أَحَدُهُمْ
اَعْتَقَ يَافُلَانٍ وَالْوَلَاءُ لِحَاوَانِمَا
الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ -
ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جن میں کا
آدمی کہتا ہے کہ اے فلاں تم آزاد کرو
مگر حق ولار ہمارا ہی ہوگا جبکہ ولار کا
حق آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔

(ابوداؤد)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے چند مخصوص طریقے:
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکیم معلم و مربی تھے اس لئے آپ صحابہ کو علم کو
قرآن و حدیث کی تعلیمات دیتے وقت متعدد چیزوں کا خاص طور پر لحاظ رکھتے
تھے تاکہ تعلیم و تربیت کا مثبت اثر ہو اور صحابہ اس سے پورا فائدہ
اٹھائیں۔

۱۔ آپ جب کوئی اہم بات بتلاتے تو اس کا تین بار اعادہ فرماتے تاکہ لوگ ٹھیک سے سمجھ لیں اور اس کو اہم سمجھیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے خطبہ دیا جس میں اصول دین بتلائے پھر تین مرتبہ فرمایا: ہل بلغت (کیا میں نے پورا دین پہنچا دیا ہے) ایک بار آپ نے خطبہ دیتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: التتوی علیہا ہر بار آپ اپنے سینے کی طرف اشارہ فرماتے تھے۔

۲۔ آپ صحابہ کی نگرانی بھی کرتے تھے تاکہ وہ احادیث کو صحیح صحیح اسی طرح یاد کریں جس طرح آپ بتلاتے تھے چنانچہ ایک بار آپ نے ایک صحابی کو سونے کی دعا بتلائی پھر پوچھا کہ اچھا میں نے کیا کہا؟ اسے دہراؤ صحابی نے آخری فقرہ آمینت یکتابلک الذی أنزلت ونبیک الذی أسسلت میں نبیک کے بجائے رسولک کہہ دیا آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ نہیں کہا۔ وہی کہو جو میں نے کہا تھا۔ (ترمذی) یہی وجہ تھی کہ آپ ایک کلمہ کا تین بار اعادہ فرماتے تھے۔

۳۔ کبھی آپ خود ہی صحابہ سے سوال فرما دیتے تھے تاکہ ان کے اذہان کی تشحیذ و تصفیہ کر سکیں۔ چنانچہ ایک بار صحابہ سے ایک مجلس میں آپ نے فرمایا کہ مومن کی مثال اس درخت کی سی تھی جس کے پتے کبھی نہیں جھڑکتے۔ پھر صحابہ کرام سے پوچھا کہ بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟ صحابہ کے ذہن میں طرح طرح کے درختوں کے نام آئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے لیکن میں اپنی سفسستی کی وجہ سے نہ کہہ سکا پھر صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہی بتلائیے۔ آپ نے فرمایا: فی النخلة (وہ کھجور کا درخت ہے)۔

۴۔ آپ سے کوئی سوال کیا جاتا آپ اس کا جواب بھی دے دیتے پھر اگر اسی سے متعلق کوئی اور بات ہوتی یا موقع دخل کے مطابق کوئی شے قابل ذکر ہوتی تو اس کا بھی ذکر کر دیتے تاکہ سائل اور حاضرین کو نئی بات بھی معلوم ہو جائے مثلاً

ایک دفعہ ایک صحابی آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سمندر کا سفر بہت کرتے ہیں۔ وہاں مار خالص نہیں ملتا اگر اپنے پاس کے پانی سے وضو کریں تو پتیں کیا پھر کیا سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا: ہوا الطہور مافوقہ والحل مہیتہ اس کا پانی پاک ہے اور کفار حلال ہے (یعنی پانی کی طہوریت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلادیا کہ اس کا مردار (یعنی پھلی) بھی حلال ہے۔

۵۔ آپ صحابہ کرام کو اتنا زیادہ غظ و نصیحت نہیں کرتے تھے کہ وہ اکتا جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے جب ان کے شاگردوں نے عرض کیا کہ وہ روزانہ درس دیں تو انھوں نے فرمایا:

إني أمانتكم بامو عظة كما كان
سأول الله يتخولنا كراهة
السامة علينا
ہم تمھیں اسی طرح غظ و نصیحت دیں گے
جس طرح ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
وقفہ وقفہ سے غظ و نصیحت کرتے تھے
اکتا ہٹ کے خوف سے۔

۶۔ آپ بعض باتیں صرف مخصوص صحابہ کرام کو بتلاتے تھے اس خوف سے کہ دوسرے اس کا غلط مطلب سمجھ کر فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مجھ سے فرمایا اے معاذ کوئی بھی شخص اگر دل سے لا إله إلا الله محمد رسول الله پڑھ لے تو اس پر اللہ تعالیٰ دوزخ حرام کر دیتا ہے انھوں نے عرض کیا کہ کیا میں لوگوں کو یہ نہ بتلا دوں تاکہ وہ خوش ہو جائیں آپ نے فرمایا لا تبشروہم فیتکلو (صحیحین) (ان کو اس کی بشارت نہ دو کیونکہ وہ لوگ اسی پر بھروسہ کر لیں گے) اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ اعلان

کرنے کے لئے بھیجا کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة جو بھی لا الہ الا اللہ کہہ دے وہ جنت میں داخل ہوگا (راستے میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث انھیں سنائی وہ انھیں واپس لوٹا لائے اور آپؐ سے عرض کیا کہ ایسا مت کیجئے کیونکہ لوگ اسی پر بھروسہ کر لیں گے ان کو عمل کرنے کے لئے چھوڑ دیجئے آپؐ نے فرمایا فخلہم (مسلم) (چھوڑ دینے دو)۔

معذرت

ماہنامہ برہان دہلی افسوس کہ ان دو ماہ میں وقت پر ضائع ہو کر آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ اس سے شرمندگی سمجھیں یا پریشان کن حالات کی سرکردگی تصور فرمائیں۔ ازراہ کرم آپ حضرات کسی قسم کی غلط فہمیوں کا شکار نہ بنیں بلکہ یہ جو میں لکھ رہا ہوں وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ دعا فرمائیں کہ رسالہ برہان اپنی مقررہ تاریخوں پر جلد از جلد بحال ہو۔ مجھے امید ہے کہ ماہ نومبر سے اپنے ان ہی خوشگوار ماحول میں اس کی اشاعت ہوتی رہے گی اور مجھے آپ سے مزید تعاون کی بھی درخواست کا حق ہے۔

عمید الرحمن عثمانی

امام ابو زرہ رضی

(آئیر آڈرونی، آڈری اعظم گڑھ)

معرفۃ صحابہ میں ابو زرہ کا علم بڑا وسیع تھا، صحابہ کی عظمت و فضیلت
 کتاب الصحابہ اور مقام و مرتبہ کے سلسلہ میں وہ بہت ہی متشدد تھے اور
 ان حضرات کے بارے میں ادنیٰ کُست مخی بھی آپ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، آپ بارہا ان
 سے کہا کرتے تھے کہ تم لوگ کہتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف چار ہزار حدیثیں صحیح ہیں، البقیہ
 سب غلط اور بے بنیاد ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ کس نے یہ بات کہی ہے؟ خدا کرے اس کے
 دانت ٹوٹ جائیں یہ کسی زندیق اور بددین ہی کا قول ہو سکتا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ
 یہ زندیقوں کا قول ہے، کون ہے جو حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی متعین تعداد
 بتا سکتا ہے؟ حضور جب اس دنیا سے تشریف
 لے گئے اس وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ
 کرام موجود تھے جنھوں نے حضور سے روایت
 کی اور پھر سے سنا، لوگوں نے کہا کہ وہ لوگ
 کہاں تھے؟

هذا قول الزنادقة، ومن يخصني حديث
 من رسول الله صلى الله عليه وسلم
 قصص رسول الله صلى الله عليه وسلم
 من مائة ألف واربعمائة عشر ألفاً من
 الصحابة ممن سمعوا مني عنه وسمع منه
 بل يا أبا ربيعة هؤلاء أين كانوا؟
 ومن هو آمنه؟

قال أهل المدينة وأهل مكة ومن بينهما
والأعراب ومن شهد معه حجة الوداع^{عليه}
تو انھوں نے فرمایا کہ وہ مدینہ میں تھے مکہ میں
تھے، دیہاتوں اور گاؤں میں تھے اور وہ لوگ
تھے جو حجۃ الوداع میں آپ کے ساتھ شریک
حج تھے۔

صحابہ کرامؓ پر تنقید و جرح کرنے والوں پر زندقیت کا فتویٰ خود خطیب بغدادی نے
اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور انھوں نے سند متصل سے ابو زرہ کے اس فتویٰ کو
نقل کیا ہے خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ ابو زرہ نے فرمایا کہ:

إذا رأيت الرجل ينتقص أحداً من
أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم
فاعلم أنه زنديق وذلك بيان الرسول
حق والقرآن حق وما جاء به حق
وأما أذى أئمة الدين فكلام الصحابة
وهؤلاء يؤيدون أن يعرجوا مشهودنا
ليسطوا الكتاب والسنة والحجج بهم
أولئ هم زنادقة سلم
جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ کسی صحابی رسولؐ
کی تنقیص کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ بد دین ہے
اس لیے کہ رسولؐ، قرآن برحق ہیں جو حضورؐ
لے کر آئے وہ بھی برحق ہے اور یہ سب
باتیں ہم تک صحابہؓ نے پہنچائیں، یہ لوگ
ہمارے گواہوں کو مجروح کر کے پورے دین
کو بے اعتبار بنا دینا چاہتے ہیں۔
جرح کرنے والے خود جرح کے سزاوار ہیں
اور یہ سچ ہے کہ وہ بد دین ہیں۔

کتاب الصحابہ ابو زرہ کی ایک محققانہ کتاب ہے، کتاب میں صحابہ کرامؓ کے مقام
و مرتبہ کے علاوہ ان کی تعارید صحابی اور تابعی میں اشتباہات کو بڑی دیدہ وری اور
تحقیق سے دور کیا گیا ہے ابن حجرؒ نے اپنی مشہور کتاب "الاصابہ" میں ابو زرہ کی رائے

۱۔ انتقید والایضاح شرح مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۵۔

۲۔ الکفایہ للخطیب ص ۹۷ الاصابہ لابن حجر ص ۱۱۔

کو بطور سند اور دلیل کے پیش کیا ہے، مثلاً: مسلم بن الحارث التیمی کے حالات میں لکھا ہے:
صحیح البخاری والبخاری والترمذی وابن قانع
الدرر والترمذی وابن قانع
وغیر واحد ان مسلم بن الحارث
هو صحابی سلمہ
امام بخاری، ابو حاتم، ابو زرہ رازی
اور ترمذی، اور ابن قانع اور بہت
سے لوگوں نے تصحیح کی ہے کہ مسلم بن الحارث
صحابی ہیں۔

ابو زرہ رازی صحابہ کے حالات، ان کی شخصیتوں کی معرفت، تعین و تشخیص میں بڑی
دقت نظر سے کام لیتے ہیں، حتی الامکان کسی تابعی کو صحابی اور کسی صحابی کو تابعی قرار
دیے جانے سے احتیاط کرتے ہیں، الاصابہ وغیرہ میں جو ابو زرہ کے اقوال ملتے
ہیں مثلاً: کسی کے بارے میں کہتے ہیں یس له صحبة یا کہیں له صحبة قدیمۃ یا لایستی
وهو صحابی فی الصحابة یا بعض شخصیتوں کے متعلق هو من التابعین ان تصریحات
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحابہ کی شناخت میں بڑی دقت نظر سے کام لیتے ہیں۔ اور
لیک قطعاً حکم رکھتے ہیں، مثلاً ابو عبد اللہ الحاکم نیشاپوری نے ام خالد کو تابعیات
میں شمار کر دیا ہے، ام خالد کے بارے میں ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ

سمعت ابازرعة يقول أم خالد بنت
خالد بن سعيد بن العاص الأكبر
اسمها أمة صح لهما عن النبي صلى الله
ام خالد بنت خالد بن سعيد بن العاص
الأكبر كان أمة أمة ہے، انھوں نے حضور
سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، یعنی ان کا

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۵۔

۲۔ الاصابہ ج ۲ ص ۶۰۔

۳۔ کتاب الجرح والتعديل ج ۴ ص ۵۴۔

۴۔ معرفۃ علوم الحدیث مطبوعہ جدیداً بار ص ۵۷۔

ملیہ وسلم احادیث سے
مسیحیہ ہونا یقینی ہے۔

اس کتاب کا مکمل نسخہ ابھی تک دنیا کے کسی کتب خانے میں دریافت نہیں ہو سکا ہے، دوسری کتابوں میں حوالوں کی وجہ سے اس کتاب کو ابو زرہ کی تصانیف میں شمار کیا گیا ہے۔

محدثین نے عام طور پر راویان حدیث کے حالات کتاب اسامہ الضعفاء جمع کیے اور بلا امتیاز ثقہ و ضعیف ہر طرح کے راویوں کا ذکر کیا، لیکن اسی دور میں بہت سے محدثین نے ضعیف راویوں پر مستقل کتابیں لکھیں جن کو کتاب الضعفاء کہا جاتا ہے جن میں صرف ضعیف یا مجروح راویوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے، ابو زرہ نے بھی ایک کتاب الضعفاء لکھی ہے جس میں انہوں نے ان راویوں کے بارے میں اپنی تحقیقی رائے کا اظہار کیا ہے اس کتاب میں ۳۸۴ راویوں کا ذکر ہے اس کتاب کا مخطوطہ دریافت کر لیا گیا ہے اور طبع ہو کر عام ہو چکا ہے۔

اجوبۃ ابی زرۃ علی اسئلۃ البرذعی (فی الضعفاء) اور اجوبۃ ابی نر سۃ علی اسئلۃ البرذعی فی الثقات یہ دو مستقل کتابیں ہیں، برذعی ابو زرہ کے مخصوص شاگرد ہیں، ان کا نام ابو عثمان سعید بن عمرو البرذعی ہے، انہوں نے ثقہ اور ضعیف راویوں کے سلسلہ میں اپنے شیخ ابو زرہ سے بہت سے سوالات کیے، ابو زرہ نے ان کے تحقیقی جواب دیے ہیں، انہیں جوابات کو دونوں کتابوں میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

ابو زرہ اپنے طویل ترین علمی اسفار کی وجہ سے راویوں کے بارے میں ذاتی طور پر صحیح واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے کسی راوی کے بارے میں ان کی رائے ایک خاص

وزن رکھتی ہے، ضعیف راویوں میں ۳۸۴ راویوں کا ذکر آیا ہے، ان کے بارے میں ابو زرہ کی رائے اجتہاد اور تجرباتی مشاہدات کی بنیاد پر ہے۔

اسی طرح ثقہ و ضعیف راویوں کے بارے میں ابو زرہ کی یہ دونوں کتابیں قدیم ترین ماخذ ہیں اور ذاتی واقفیت و اطلاع اور مستند معلومات کی بنیاد پر ان کی رائے میں وزن ہے، ان دونوں کتابوں کی دریافت سے فن جرح و تعدیل کے ایک امام کی رائے کا اس فن میں اضافہ ہے، کیونکہ ان میں سے بہت سے راویوں کا ذکر جرح و تعدیل کی کتابوں میں پایا جاتا ہے لیکن وہاں ابو زرہ کی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے، ان کتابوں کے ذریعہ ہم ان کے متعلق ابو زرہ کی رائے معلوم کر سکتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے ایسے راوی ہیں جن کے بارے میں جرح و تعدیل کی کتابوں میں ترجمے نہیں پائے جاتے ہیں ان راویوں کا ذکر اور ان کے بارے میں ایک تحقیقی رائے ان کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح متداول کتابوں میں ابو زرہ کی جو رائے نقل کی گئی ہے ان میں کہیں کہیں خلاف واقعہ رائیں نقل کر دی گئی ہیں، ان کتابوں سے اس راوی کے بارے میں ابو زرہ کی حقیقی اور اصل رائے کا پتہ چلتا ہے مثلاً عبد الرحمن بن حماد الشعمی کے بارے میں متداول کتابوں میں ابو زرہ کی رائے "لا بأس بہ" کے لفظ سے ظاہر کی گئی ہے لیکن برذعی نے ان کا قول "شیخ یس بن اذہ" نقل کیا ہے، اسی طرح عبد اللہ بن قانع الصانع کے بارے میں عام کتابوں میں ان کی رائے "لا بأس بہ" لکھی جاتی ہے جبکہ برذعی بتاتے ہیں کہ ابو زرہ کی رائے ان کے بارے میں "متکون الحدیث" ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابو زرہ کی یہ دونوں کتابیں اسرار الحال میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

حافظ شمس الدین محمد بن علی داؤدی (متوفی ۹۴۵ھ) نے ایک کتاب طبقات المفسرین لکھی ہے۔ اس میں ابو زرہ کو ممتاز ترین

التفسیر

مفسرین میں شمار کرایا گیا ہے، ان کی تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تفسیر مستند مفسرین قرآن تابعین و تبع تابعین کے اقوال کی روشنی میں مرتب کی ہے، آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں انھوں نے صرف انہی روایتوں کو لیا ہے جن کی صحت معلوم ہے چاہے وہ مرفوع روایتیں ہوں یا صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین کے اقوال ہوں اور بطور خاص اس کا اہتمام کیا ہے کہ تفسیروں میں جو ضعیف اور اسرائیلی روایتوں کا انبار لگا دیا گیا ہے ان سے مکمل اجتناب کریں۔

ابوزرہ کی تفسیر کے وجود کا اب تک علم نہ ہو سکا ہے، ابنہ ابن ابی حاتم کی تفسیر کے بعض اجزاء قاہرہ کے دارالکتب اور ظاہریہ میں یا مکتبہ محمودیہ مدینہ طیبہ یا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پائے جاتے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ابی حاتم کی تفسیر کا بڑا حصہ ابوزرہ کی تفسیروں پر مشتمل ہے، اگر ابن ابی حاتم کی تفسیر کے یہ اجزاء نہ ہوتے تو شاید ہم کو ابوزرہ کی تفسیر کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

کتاب الجرح والتعديل | ابوزرہ کی تصانیف میں کتاب الجرح والتعديل بھی شامل ہے، ابوزرہ کی کتاب سے پہلے امام بخاریؒ کی "التاریخ الکبیر"، اہل علم اور محدثین میں عام ہو چکی تھی، اسی لیے ابوزرہ کی اس کتاب پر اعتراض کیا گیا۔ یہ کتاب امام بخاریؒ کی کتاب کی نقل ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اسماء الرجال کے فن میں تصنیف کر لے والا کوئی مصنف امام بخاریؒ کی کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چالیس ہزار افراد پر اظہار رائے میں ہر رائے کو حرفِ اعتراض نہیں قرار دیا جاسکتا، حالات، تجربات، مشاہدات اور معلومات کے لحاظ سے اتنے طویل و عریض میدان میں کہیں نہ کہیں خفا ہو ہی سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے صاحبِ نظر کو کسی خاص راوی کے

بارے میں خصوصی اور قطعی معلومات حاصل ہو جائیں تو امام بخاری کی رائے سے وہ اختلاف کر سکتا ہے اور اسے اس کا حق بھی ہے۔

ابوزرعہ کی کتاب کی بھی یہی حیثیت ہے، ابوزرعہ اور ابن ابی حاتم دونوں محدثین کے سامنے امام بخاری کی "التاریخ الکبیر" موجود تھی، ایک ایک راوی کے حالات ان حضرات کے سامنے پیش کئے گئے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں اضافہ کیا گیا، جہاں خلاف واقعہ بات تھی اور ان حضرات کے علم میں حقیقت دوسری تھی وہاں اس کا اظہار کر دیا گیا، اس طرح ابوزرعہ کی کتاب امام بخاری کی کتاب کی روشنی میں ترتیب ضرور دی گئی لیکن اس میں ابوزرعہ نے اپنی خصوصی رائے کا اظہار کر کے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا اس لیے بخاری کی کتاب کے ساتھ ابوزرعہ کی کتاب کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔

الواح الصنادید

از جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب - شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

بر عظیم پاک و ہند کے نامور عالم دین اور دانشور شاہ محمد جعفر پھلواری ^{مغفور} رحمہ اللہ
گلشن اقبال کراچی کے قبرستان میں جو خواب ابدی ہیں۔ ان کا ذکر پہلے بھی
الواح الصنادید کے نغمہ میں آچکا ہے لیکن اُس وقت ان کی قبر پر کتبہ نصب نہیں
تھا۔ اب اُن کے لواحقین نے ان کی قبر پر کتبہ لگوا دیا ہے جس پر یہ عبارت کندہ
ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری

ابن

حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان قادری چشتی پھلواری

تاریخ وفات ۳۰ جمادی الآخر ۱۴۰۲ھ

مطابق ۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء

اسی قبرستان میں نالہ پار حضرت نواب احمد قادری چشتی نقشبندی ابوالعلائی

کی درگاہ ہے۔ ان کے مزار کے سر پہنے کی جانب ڈاکٹر اشیانی احمد قریشی دفن ہیں اور جانب مشرق اندازاً پچیس میٹر کے فاصلے پر ڈپٹی تدفین احمد کے پوتے اور بشیر الدین صاحب "واقعات دارالحکومت دہلی" کے فرزند شاہد احمد دہلوی کی قبر ہے۔ شاہد احمد کی قبر بڑی تلاش اور محنت کے بعد ملی ہے۔ ان کے لوح مزاپر یہ عبارت درج ہے:

هو النکل

انا لله وانا اليه راجعون

شاہد احمد دہلوی

تاریخ وفات

۲۷ مئی ۱۹۶۷ء مطابقت

۱۷ صفر المظفر ۱۳۸۷ھ

بہر ۶۱ سال

اس قبرستان میں شفیع بریلوی کی قبر سے اندازاً پندرہ میٹر جانب شمال مغرب تحریک آزادی کے ایک نامور مجاہد محمد حسین علی خان کی قبر ہے۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم

مجاہد تحریک آزادی

محمد حسین علی خان مرحوم علی آبادی

ولد مقصود علی خان مرحوم ایمن زئی

تاریخ ولادت: ۱۰ اگست ۱۹۱۶ء

تاریخ وفات: ۶ نومبر ۱۹۷۷ء

کراچی میں شاہراہ قائدین اور طارق روڈ کے اتصال پر جو قبرستان ہے، وہ سوسائٹی کا قبرستان ہے۔ اس قبرستان کے وسط میں پہاڑی کے دامن میں مشہور شاعر اور تاریخ گو عبد الحفیظ سلیم کی آخری آرام گاہ ہے۔ مرحوم علمی اور ادبی حلقوں میں حفیظ ہوشیار پوری کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :

بسم الله الرحمن الرحيم
لا اله الا الله محمد رسول الله
حفیظ ہوشیار پوری

پیدائش : ۵ جنوری ۱۹۱۲ء

وفات : ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء

سوئیں گے حشر تک کہ سبکدوش ہو گئے

بارِ امانتِ غمِ ہستی اتار کے

حفیظ

قبرستان سوسائٹی میں ایک بلند ٹیلے پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے صحن میں چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان اور حضرت مفتی محمد حسن امرتسری خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ دفن ہیں، ان کی قبروں کے سرہانے مسجد کی حدود دے باہر، مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے والد بزرگوار مولانا ظہور الحق مغفور کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے :

بسم الله الرحمن الرحيم
مولانا ظہور الحق رحمۃ اللہ علیہ
وفات شبِ دو شنبہ ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ بمطابق ۶ سال

عزیز الحق غمین شد از وفاست والد ماجد
ہم ارشاد و عماد و اعتماد و اعظام الحق
بزرگے زندہ دل بود بہ علم و اتقا یکتا
علومش جملہ مستحضر دلش در شوق مستغرق
گجے نطق بلیغش منبر و محراب را زینت
گجے طبع لطیفش محفل ارباب را رونق
بہ فیض اشرف علی از ہمدان اشرف
ز صدق حضرت صدیق طبعاً صادق و اصدق
نہ ریزد تیج برگے جز بہ حکم خالق عالم
نہ میرد، هیچ کس الا بہ امر قادر مطلق
اسد مگر چار سال دیگر اور زندگی بودے
شدے تاریخ رحلت اسم "مولانا ظہور الحق"

۱۳۷۸

اسد ملتانی

(۱۳۷۸ میں سے اگر ہم تفریق کر دینے جائیں تو باقی ۱۳۷۴ بچتے ہیں اور یہی ان کا سال وفات ہے)۔

اسی قبرستان میں مشہور مورخ اور دانشور احمد عبداللہ بھی
محو خواب ابدی ہیں۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت
کندہ ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ربنا امانا غفر لنا وارحمنا وانت خیر الراحمین

سینئر صحافی دانشور مؤرخ اور مصنف

احمد عبداللہ

ولد شیخ غلام رسول

تاریخ پیدائش: جمعہ ۵ اگست ۱۹۲۱ء

تاریخ وفات: شب جمعہ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۳ء

اسی قبرستان میں نواب معشوق یار جنگ مرحوم کے صاحبزادے محمود حسین خاں کی بھی قبر ہے۔ گوانھوں نے اپنے والد بزرگوار جیسی شہرت نہیں پائی، تاہم ان کی قبر کا کتبہ قابل توجہ ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

محمود حسین خاں ایڈوکیٹ

فرزند

نواب معشوق یار جنگ مرحوم

تاریخ وفات: ۷ رذی الحجہ ۱۳۹۴ھ

مطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۷۴ء

اسی گورستان میں حفیظ ہوشیار پوری کی قبر سے اندازاً بیس میٹر جانب جنوب مشہور مفتراور عالم دین سید طفیل حسن رضوی نحو خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ابوالنظر حکیم سید طفیل حسن رضوی مروہوی

مفکر قرآن

تاریخ پیدائش : ۱۷ ستمبر ۱۸۵۹ء امرتسر

تاریخ وفات : ۸ اپریل ۱۹۵۳ء کوہاچی

انا لله وانا الیہ راجعون

اسی قبرستان کے شمال مشرقی گوشے میں ایک چھتری کے نیچے ہندوستان کے مشہور فلمی اداکار چارلی کی قبر ہے۔ چارلی اپنے دور میں مزاحیہ اداکاری کے لئے مشہور تھے۔ اس کے ہونے پر یہ عبارت منقوش ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

لا اله الا الله محمد رسول الله

الحاج نور محمد چارلی

ولد حاجی علی محمد

تاریخ پیدائش : ۷ جنوری ۱۹۱۱ء

تاریخ وفات : ۱۹ رمضان ۱۳۰۳ھ

مطابق : ۲۳ جون ۱۹۸۳ء

بروز جمعرات

قبرستان سوسائٹی میں شعیب اتریشی مرحوم کی آخری آرام گاہ کے سر لانے ایک کمرے میں دسگاہ حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کے سجادہ نشین شاہ عبدالرشید کی قبر ہے ان کے مزار کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے :

مولانا حافظ قاری شاہ عبدالرشید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سجادہ نشین آستانہ عالیہ شاہ بوعلی قلندر پانی پتی

رفت از جہاں سوئے جہاں ما وائے ما لمجائے ما
 یعنی جناب مرشد و مولائے ما عبدالرشید
 سجادہ و اولاد حضرت بوعلی پانی پتی
 درویش کامل صاحب لطف و عطا عبدالرشید
 از ہر ادائے دلبری شان قلندر آشکار
 حسن و جمال بوٹلی یا آئینہ عبدالرشید
 اے عازم حج و زیارت بر تو از ہر حد سلام
 قربان راہ مصطفیٰ صد مرحبا عبدالرشید
 تا حشر روح پاک تو در کعبہ شد وقف طواف
 بخشید این رتبہ ترا رب العلا عبدالرشید
 اکرم لنا یا مرشدی اذک لنا یا سیدی
 بالرحمۃ لہ انظر حالتنا عبدالرشید
 بنوشت تاریخ و فاقش عارف اندوہ گیس
 لمجائے عالم معدن صدق و صفا عبدالرشید

۱۳۸۱ھ

نثار احمد فاروقی خیر آبادی

۱۹ ذی قعدہ ۱۳۸۲ ہجری

مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ عیسوی

شاہ عبدالرشید کے مزار سے پندرہ میٹر جانب شمال مشرق سید عبدالوحید
 ابن سید عبدالاحد دہلوی مانگ منلیع مجبتائی کی قبر ہے۔ ان کے سنگ مزار پر
 یہ عبارت منقوش ہے :

بسم الله الرحمن الرحيم
 لا اله الا الله محمد رسول الله
 حسبنا الله ونعم الوكيل نعم المولى ونعم النصير
 سيد عبد الوحيد
 خلف

خان بہادر سید عبدالاحد مالک مطبع مجتبیٰ دہلی

تاریخ پیدائش ۲۱ فروری ۱۹۰۶ء
 تاریخ وفات ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء

بروز جمعہ

شاہ عبدالرشید کی قبر سے امانڈا تیس میٹر جانب شمال ایک بارہ دری کے نیچے مشہور صحافی سردار علی صابری محو خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم

يا ايها النفس المطمئنة ارجعي الى ربك ما اضيت مرضية
 فادخلي في عبادي وادخلي جنتي

العلق هو الله حق حق حق

یہاں تحریک پاکستان کے سرفرش مجاہد برصغیر کے بیباک صحافی اور سلسلہ عالیہ چشتیہ کے صاحب اجازت بزرگ
 حضرت سردار علی صابری رحمۃ اللہ علیہ

طلبہ

شیخ المشائخ شاہ محمد شہزاد علی خاں المعروف (بہ) عبدعلی پیار میاں صوفی

آرام فرما لیں۔ صاحب مرقہ کانپور میں ۲۱ فروری ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے
اور کراچی میں ۱۳ مارچ ۱۹۸۴ء مطابق ۲۵ جمادی الثانی ۱۴۰۳ھ
کو جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب میں واصلِ جنت ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

وہ صابریہ چشتیہ مسلک کا پرستار اس کو تو فقط مہتمی مولیٰ ہی تھی درکار
اعزاز بھی حاصل تھا اسے ابنِ ولی کا اور اس کا وظیفہ تھا سردارِ نادعلی کا
لوحِ مزار کی پشت کی جانب یہ عبارت منقوش ہے:

پیکرِ محبت
با و اسرار علی صابری رحمۃ اللہ علیہ

وفات کراچی

۲۹ مارچ ۱۹۸۴ء

جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب

ولادت کانپور

۲۱ فروری ۱۹۰۱ء

شام ۵ بجکر ۲۵ منٹ

قطعہ تاریخ وفات

علم و صحافت ادب و معرفت	دولت سردار علی صابری
صفحہ تاریخ پر تحریر ہے	خدمت سردار علی صابری
عزم مسلسل کی ہے اک داستان	عظمت سردار علی صابری
جلوہ گم رحمت غفار ہے	تربیت سروار علی صابری
گوشہ تربت سے عیاں ہے رگتیں	صولت سردار علی صابری

۱۴۰۳ھ

رئیس اردو بھوی

تاریخ لوح مزار
چراغ روشن گھر

۱۹۸۵ء

ارشاد صابری

خطاطی

محمد یامین دہلوی

(صفحہ رقم)

محمد فہیم ۳ مارچ ۱۹۸۴ء

بعد نماز جمعہ

رہے نام اللہ کا

کراچی کے نئے قبرستانوں میں سخی حسن کا قبرستان بہت بڑا قبرستان ہے۔ نارتھ ناظم آباد، نیو کراچی اور فیڈل بی ایریا سے زیادہ تر میتیں یہیں تدفین کئے لائی جاتی ہیں۔ اسی قبرستان میں قاری احمد پبلی بھیتی کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

یا محمد

یا اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هو الحی القيوم ابداً ابداً ذو الجلال والاكرام بوجہك استغیث

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مولانا حکیم قاری احمد پبلی بھیتی

ولد

سلطان الواعظین مولانا عبدالاحد ولد مولانا وی احمد محد سورتی رحمۃ اللہ علیہ

نواسہ

شاہ عبدالکریم خلیفہ اعظم حضرت شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی

تاریخ وفات

۱۳ جمادی الاول ۱۳۹۲ھ مطابق

۱۳ ارمی ۱۹۷۶ء بروز جمعہ

عمر ۶۵ سال

قبرستان سخی حسن کے شمال مغربی حصے میں لب سڑک بنگال کے نامور
سیاسی رہنما اور تحریک آزادی میں صف اول کے مجاہد راغب احسن کی قبر ہے۔
ان کی قبر بھی ہے لیکن اس کے سرہانے ایک پتھر نصب ہے جس پر یہ عبارت
مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

علامہ راغب احسن

ولد

ریاض الدین احمد

۱۹۰۵ء

تاریخ ولادت

۲۷ نومبر ۱۹۷۵ء

تاریخ وفات

ہمارے فاضل دوست محمد فرید الحق صاحب ایڈووکیٹ نے علامہ اقبال
کے راغب احسن کے نام خطوط کا مجموعہ ”اقبال جہان دگر“ کے
عنوان سے چھاپ دیا ہے۔ ان خطوط کی اشاعت نے سیاسی حلقوں
میں تہلکہ مچا دیا ہے۔

قبرستان سخی حسن کے وسط میں مشہور ماہر تعلیم اور دانشور سیہ منظر الدین
مدنی کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
 لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
 اسلامیات کے ماہر استاد ادیب اور دانشور
 جناب پروفیسر سید مظفر الدین ندوی
 ولد

مولوی سید عبداللہ مرحوم
 تاریخ وفات
 ۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ
 مطابق ۱۸ جون ۱۹۸۴ء
 ان اللہ وانا الیہ راجعون

قبرستان میوہ شاہ کراچی کاسب سے بڑا قبرستان ہے۔ اس قبرستان
 میں سب سے نمایاں مزار بابا ذہین شاہ تاجی کا ہے۔ ان کے مزار کا گنبد
 میلوں سے نظر آتا ہے۔ بابا صاحب بڑے اچھے شاعر تھے اور کراچی کے
 بڑے بڑے ادیب اور ماہرین تعلیم ان سے بیعت تھے۔ ان کی قبر کے سرہانے
 دیوار پر یہ عبارت درج ہے :

بابا ذہین شاہ کہ تھے تاجدار فخر
 ان کو ارم نشین و ولایت نشاں لکھو
 سال وفات تاج ولایت ذہین شاہ
 بابا ذہین شاہ بزرگِ زمان لکھو

۱۳۹۸ھ

عارف و حق آگاہ مولانا محمد طاسین المعروف بابا ذہین شاہ تاجی

تاریخ وصال ۳ شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ

مطابق ۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء

بابا ذہین شاہ اپنے مرشد بابا عبدالکریم یوسف شاہ کے پہلو میں
محو استراحت ہیں۔ بابا یوسف شاہ کے مزار کے سرہانے دیوار پر یہ عبارت
کندہ ہے:

اللہ غفار احمد

۱۳۶۶ھ

ترتیب مقرب ایزد

۱۳۶۶ھ

چراغ کعبہ اجلال

۱۳۶۶ھ

صاحب کرامت چشمہ نور

۱۳۶۶ھ

نور دربار چشت

۱۳۶۶ھ

سعادت دو جہاں پیر و مرشد

۱۳۶۶ھ

تاج نہ بہشت

۱۳۶۶ھ

حق آگاہ مولانا عبدالکریم المعروف (بہ) سید محمد بابا یوسف شاہ تاجی

یکم ذی الحجہ ۱۴۱۸ سنہ تیرہ سو چھیاسٹھ

۱۹۴۸ء

تاریخ وصال پاک بابا

۱۳۶۶

بابا عبدالکریم یوسف شاہ ناگیور کے مشہور بزرگ بابا تاج الدین کے مرید

اور مجاز تھے۔ ان کے خلیفہ بابا ذہین شاہ سے پاکستان میں اس سلسلے کی
داغ بیل پڑی۔ بابا ذہین شاہ تاج لالہ لیاقت کے عنوان سے ایک اردو ماہنامہ

اور THE TAT کے نام سے ایک انگریزی مجلہ شائع کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کا موضوع تصوف تھا۔

بابا ذہین شاہ کے مزار کے عقب میں ایک احاطہ قبور کے اندر مشہور سیاست داں چوہدری خلیق الزماں کی قبر ہے۔ انھوں نے شاہراہ پاکستان کے عنوان سے تحریک آزادی کی دستاویز تیار کی تھی۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں تھی، پھر انھوں نے اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ چوہدری صاحب کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :

۷۸۶

قلعہ تاریخ و فات

محسن قوم و ملت

چوہدری خلیق الزماں مرحوم و مغفور

پیدائش چتر ۲۵ دسمبر ۱۸۸۹ء

وفات کراچی ۱۸ مئی ۱۹۷۳ء

رفت خلیق الزماں جانبِ قصرِ جنان

مومن ملت نواز محسنِ اسلامیاں

ہمدردِ یرینہ و کند و بابائے قوم

حافظ و دانائے راز مرجعِ دانشواں

مصرعہ تاریخِ گفتِ ہائے راعب نواز

قبر خلیق الزماں جنتِ نام آوراں

۶۱۹۷۳

راغب مراد آبادی

اوزنگ زیب کے عہد میں مغل امرار

مصنف: ڈاکٹر محمد اطہر علی

تبصرہ نگار: عبدالرؤف خاں ایم اے (ادبی کلاں راجھان)

اوزنگ زیب کی عظمت و شوکت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس اولوالعزم شہنشاہ پر اب تک جتنا لکھا گیا ہے شاید ہی کسی سکاٹ، سلطان یا کسی دیگر مغل حکمران پر لکھا گیا ہو۔ ڈاکٹر محمد اطہر علی کا تحقیقی مقالہ

‘THE MUGHAL NOBILITY UNDER AURANGZEB’

بھی اسی سلسلہ کی طلائی کڑی ہے۔ جسے موصوف نے ۱۹۶۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پیش کر کے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ گرانقدر مقالہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ مقالہ کی افادیت کے پیش نظر ترقی اردو بیورو وزارت تعلیم حکومت ہند نے بہ اشتراک انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، اسے ”اوزنگ زیب کے عہد میں مغل امرار“ کے نام سے جناب امین الدین صاحب سے اردو میں ترجمہ کروایا اور جنوری۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ اصل مقالہ سے، سرحد و تاقہ سرکار اور دوسرے مؤرخین کے، اوزنگ زیب پر عائد کردہ الزامات کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہ اپنی سبب اسے قومی اتحاد و ہمہ آہنگی

کے تناظر میں اردو میں منتقل کرنا یقیناً قابلِ ستائش کام تھا۔ لیکن اصل مقالہ فقہا
 وقیع اور بلند پایہ نیز منطقی و تحقیقی ہے ترجمہ اس معیار کو نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ تاریخ
 کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کارپردازانِ ترقی اردو بیورو کی توجہ ترجمہ
 کے سلسلہ میں چند امور کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو درج ذیل ہیں :

مؤذن بالِ تصنیف میں بعض تاریخی مصطلحات، کتابیات اور مقامات و رجالات
 کے ناموں کا اظہار بیشتر صفحات پر غلط ثبت ہوا ہے۔ ممکن ہے ایسا کاتب کی
 کم سوادگی کے سبب ہوا ہو۔ بہر حال ص ۳۴ پر اورنگ زیب کے میر عسکر عاقل خاں
 رازی کو دو دفعہ ”عاقل خاں راضی“ تحریر فرمایا ہے۔ یہ وہی عاقل خاں رازی
 ہے جس نے شہزادہ اورنگ زیب کو، جبکہ اُس کی طبیعت اپنی پرستارِ خاص زین آباد
 کو عالم شباب میں انتقال کو جانے کے سبب، نہایت مضمحل اور نڈھال تھی۔
 فی البدیہہ حسب ذیل شعر ہے

عشق پہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
 ہجر پہ دشوار بود یا رہ آساں گرفت

سنا کر شہزادہ کی مصاحبتِ خاص حاصل کر لی تھی۔ فنِ موسیقی کی مشہور کتاب راگ
 درپن کے مصنف اور معروف شاعر ناعظمی سرہندی کے ممدوح امیر فقیر اللہ سیف
 بن تربیت خاں کو ص ۲۵ پر اورنگ زیب کے امیر سیف خاں بن سیف الدین
 محمود کو ص ۲۵۵ نیز لفظ ”سیف“ کو دیگر صفحات پر کم از کم تیرہ دفعہ ”صیف خاں“
 لکھا ہے۔ ممکن ہے فاضل مترجم کے نزدیک مذکورہ دونوں امراء کی عمر گرانمایہ
 صیف وشتا (موسم گرما و سرما) میں خودش و پوشش کی احتیاج ہی میں صرف
 ہوئی ہو۔

عمر گرانمایہ دریں صرف شد تاچہ خورم صیف چہ پوشم ہشتا

معاوض و جیہ عہد شاہجہانی میں سنٹی شکر اور دور عالمگیری میں محتسب عسکر مقرر کئے گئے تھے۔ ملائے مرحوم جیسا متورع محتسب شاید ہی کوئی دوسرا ہوا ہو۔ مزین فتاویٰ الہندیہ المعروف بہ فتاویٰ عالمگیریہ میں بھی آپ کا شمار ہے۔ بہر کیف ان باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے، زیر نظر تصنیف کے ص ۱۳۶ نیز ۲۸۹ پر ہمیں ”عوض“ اور ”وجیہ“ ”عیوض“ اور ”وجیہ“ لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ عیوض یا عیوض اور وجیہ حائے حلی سے نہیں لکھنا چاہئے۔

اکبر آباد کا قلعہ دار رعد انداز خاں جو ستنامیوں کی شورش کو فرو کرنے کے صلہ میں شجاعت خاں کہلا یا، اور نگ زیب کا نہایت معتمد منصب دار تھا۔ چنانچہ شیواجی کو پہلے انہی کی تحویل میں نظر بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ خیر فاضل مترجم کو ”رعد انداز خاں“ کے بارے میں یہ باتیں مستحضر نہ بھی ہوں تو کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، لیکن انداز جو انداختن مصدر سے مشتق ہے اور رعد کے ساتھ کے ساتھ برق انداز کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور اسی ترکیب پر تیر انداز وغیرہ بنتے ہیں۔ اسی رعد انداز کو ص ۷۰ ۱۴۰ نیز ۲۳۲ پر ”رعد انداز“ ارقام فرمایا ہے۔ گویا شجاعت خاں کی تمام رعد اندازی بیک جہش قلم مستور کر دی گئی۔ رعد انداز خاں چونکہ اکبر آباد کا قلعہ دار تھا چنانچہ اس تاریخی شہر کی مناسبت سے یہاں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اسے ص ۲۳۷ پر توسین میں آگرہ آباد تحریر فرمایا ہے، اگر اسی خوبصورت ترکیب پر ہمارے ملک کے چند دیگر شہروں کو قیاس کر لیا جائے تو پھر شاہجہان آباد ”دہلی آباد“ اور ”عظیم آباد“ پٹنہ آباد کہلائے گا۔ بہر حال ”آگرہ“ اور ”اکبر آباد“ الفاظ کا یہ حسین امتزاج پہلی دفعہ نظر سے گزرا۔ تاریخ سے معمولی شغف رکھنے والا طالب علم شائستہ خاں کی قد آور شخصیت سے واقف اور اردو زبان کا مبتدی بھی اس لفظ کے اظہار سے آگاہ ہے لیکن ہماری نگاہ کتاب کے ص ۱۸۷ پر سائستہ خاں، اور ص ۲۰۵ پر

شائستہ خاں سے دو چار ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ تصحیف ہو۔

شہزادہ عالیجاہ دارا شکوہ کو ص ۲۳ پر دارہ شکوہ اردان کے فرزند سلیمان شکوہ کو ص ۳۴ پر سلمان شکوہ نیز دارا کے استاذ محترم شیخ میرک ہروی کو ص ۲ پر ہاروی بنا دیا ہے۔ وقائع دکن کے مصنف نعمت خان عالی کا شمار عالمگیری عہد کے ممتاز شعراء میں بھی ہوتا ہے۔ یہ محاصرہ قلعہ گولکنڈہ میں، جو آٹھ ماہ تک مسلسل جاری رہا تھا، از اول تا آخر شریک تھے۔ فاضل مترجم نے ان کی مذکورہ بالا تاریخی تصنیف کو ص ۳۴ پر "داغیات" اور موصوف کے نام کو "نعمت خان علی" یا نعمت خاں علی تحریر فرمایا ہے۔ اردنگ زیب کے درجہ اول کے منصب دار اور "میر بخش" عزیز الدین بہرہ مند خاں کو ص ۱۷۴ پر دیگر صفحات پر مکرر "سہرہ مند خاں" بنا دیا ہے۔ شکر ہے کہ اسے "گراں گوش خاں" نہیں لکھا کیونکہ بہرا اس شخص کو کہتے ہیں جسے اونچا سنائی دے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ یہ

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے جلیل القدر خلیفہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے کون واقف نہیں؟ فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی اور تمام تر فیروز مناریاں آپ ہی کی دعاؤں اور توجہات کی رہیں منت تھیں۔ مترجم موصوف نے انہی بزرگوار محترم کا اسم گرامی "ناصر الدین" (ص ۲۴۷) رقم فرمایا ہے۔ دیگر بہت سے امراء کے نام بھی صحیح طور پر ضبط تحریر میں نہیں آ سکے ہیں مثلاً: مکرمات خاں ص ۲۷۳ کے علاوہ دوسری دو جگہ "مکرمات خاں" بایزید ص ۱۰۶ پر "بایزید" ایزد بخش ص ۱۳۸ پر "ایزد بخش" یزدی ص ۲۶۴ پر یزدی، ہزیر خاں ص ۲۸۰ پر "ہزیر خاں" علی مردان ص ۱۰۷ پر علی مراد "شمس الدین خوشگل"

کو ص ۲۶۵ نیز دیگر صفحات پر کم از کم آٹھ دفعہ "شمس الدین خشکی" مرزا ابراہیم کو ص ۲۶۲ پر "لہر است" مفتخر خاں کو ص ۲۶۳ پر "مفتخر خاں" اور ص ۲۹۶ پر "مفتخر خاں" قیاد خاں میر آخوند کو ص ۲۶۵ پر "میر آخر" کر دیا ہے "میر آخر" داروغہ اصطبل یا سردار غولہ کو کہتے تھے جو ایک اہم عہدہ تھا۔ اسی طرح فیروز کو جا بجا "فروز" خانی خاں کو دو دفعہ خدائی خاں اور قیباد کو ص ۶۵ پر "قیباد" ارقام فرمایا ہے اور نوبت بہ اس جا رسید کہ رشید خاں کو ص ۲۲۳ پر "رسید خاں" ممکن ہے غائب موصوف آمد و خرچ کی رسید کے "داروغہ" رہے ہوں۔ صاحب مرقعات حسن یعنی سید ابوالحسن (۱۶۶۶ء) کو ص ۳۲۳ پر "سید عبدالحسن" لکھا ہے۔ مترجم موصوف نے عالم اسلام کے مستند ترین عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا اسم گرامی تو ضرور پڑھا اور سنا ہوگا۔ اس مناسبت سے ہی اسے درست لکھا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مشاہیر بھی اس نام کے ہو گزرے ہیں نیز ابوالحسن اور عبدالحسن کے معنی میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خیر آج کل اردو سے ناواقف لوگ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو بھی "عبد الکلام" ہی بولنے لگے ہیں۔ فی الحقیقت تاریخ کی کتابوں کے مترجمین کو بقول محترم پروفیسر محمد اسلم صاحب، پنجاب یونیورسٹی لاہور "رجال و اماکن کا علم ہونا بھی ضروری ہے اور جب تک مترجم تاریخ سے واقف نہ ہو اس وقت تک وہ اس کام کو ہاتھ نہ لگائے (ماہنامہ برہان دہلی۔ فروری ۱۹۸۱ء) رجال و شخصیات کا حال قارئین نے ملاحظہ فرمایا۔ اب ایک نظر احوال و مقامات پر بھی ڈال لی جائے۔

اورنگ زیب کے قاب ترین کماندار مرزا راہ جے سنگھ کچھواہہ اور شیواجی کے مابین ۱۶۶۵ء میں بمقام "پرنڈ" مشہور صلح ہوئی تھی جس کے بعد ہی شیواجی مغال دہلی میں آگے حاضر ہوا تھا۔ پرنڈر کی اس صلح سے بچہ بچہ واقف ہے لیکن اس مقام کا

نام ص ۱۰۲ پر پورا ندھر اور ص ۱۵۹ پر پورا ندھر لکھا ہوا ملتا ہے جس سے اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ کسی مقام کا نام نہ ہو کر فرد کا نام ہے۔ برادران وطن میں بہت سے لوگوں کے نام پورا ندھر ہیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان ۱۷۵۹ء میں لڑا جسے میدان میں شہید جنگ واقع ہوں تھی۔ اسے کاتب کے نوک قلم نے کچھوا جی سنگ پست بنا دیا ہے (ص ۱۸۲)۔ کچھوا کی مناسبت سے بطور جملہ موصوفہ یہاں یہ حرف کرنا ہے جس نے ہوگا کہ اسی جنگ میں جو دھپور کے راجہ جسونت سنگھ نے، جسے اورنگ زیب نے بمبئی کی کمان سپرد کی تھی، لڑائی سے ایک رات قبل شجاع سے ساز باز کر لی مگر شہنشاہ نے اس کی اس غداری پر غصہ و تھل کا ثبوت دیتے ہوئے کوئی باز نہ کرنے کی اہلستہ چونکہ جسے سنگھ کی وساطت سے اورنگ زیب اس کی خدمت سے رشتہ کو سرف کر چکا تھا چنانچہ اس کی اس سازش اور غداری کے سلسلہ میں جسے سنگھ کو جو کچھ لکھا اس کا ایک قابل توجہ (Remarkable) فقرہ ہے: ”بچہ اور دستاویز بیچ کہ ذات یا سپاہیئے نہ کند چہ جائے راجپوت از حالو ادہ کدوں“۔ قزوین مصنفات ایران میں ایک شہر کا نام ہے یہاں کے باشندے کو اردو نے صفت نسبتی قزوینی کہا جاتا ہے مگر یہ لفظ صکت کے حاشیہ ۳۲ پر ”قنونی“ لکھا ہوا ہے غالباً یہ پادشاہ نامہ کے مصنف محمد امین معروف بہ امینائے قزوینی کے ہیں بطور اختصار یہ تحریر فرمایا ہے۔ مغل عہد حکومت میں حصار فیروزہ کی جاگیر اسی شہزادہ کو تفویض ہوئی تھی جسے تخت و تاج کا وارث خیال کیا جاتا تھا گو یہ بات ریگڑ ہے کہ اس امر کا فیصلہ اکثر میدان جنگ ہی میں ہوتا تھا تاہم حصار کی بہت سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ آج کل ہریانہ میں ہے۔ اسے ص ۱۳۳ پر ”حصار“ لکھا ہے۔ مغل تاریخ میں نہ صرف جاگیر کی عہد سے سادات ہریانہ کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ ان میں بعض شخصیات تاریخ ساز ہو گزری ہیں شد

صاحب سیف القلم نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید بخاری جنھیں مجدد الف ثانیؒ سیادت
 پناہ“ کہہ کر مخاطب فرماتے تھے اور جنھوں نے جہانگیر کو تخت نشین کرنے میں نمایاں
 رول ادا کیا تھا یہ جہانگیر کے مینر بخشی بھی تھے، نیز سید حسن علی خاں قطب الملک
 اور ان کے برادر خورد امیر الافراہ سید حسین علی خاں فوجدار ہندوستان و بیانہ وغیرہ۔
 یہ دونوں بھائی سید برادران“ یا ”بادشاہ گھر“ کے نام سے بھی تاریخ میں معروف
 ہیں۔ بہر حال یہ لوگ ساداتِ بارہمہ اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے اجداد کو یا تو
 بارہ گاؤں جاگیر میں عطا ہوئے تھے یا وہ بارہ بستیوں میں سکونت پذیر تھے۔
 چنانچہ ”بارہ“ کثرت استعمال کے سبب ”بارہمہ“ ہو گیا۔ ساداتِ بارہمہ سے
 اورنگ زیب بھی محتاط رہتا تھا۔ اسی بارہمہ کو تقریباً بیس جگہ ”بارہا“ لکھا ہے
 جس کی ابتداء ۱۴۱۱ھ سے ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ۱۴۴۴ھ تک جاری رہتا ہے۔
 غور طلب بات یہ ہے کہ ”بارہا“ کسی مقام سے منسوب نہ ہو کر محض تابع فعل ہے
 جو کئی بار، بہت دفعہ اور اکثر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ٹھٹھ یا ٹھٹھ
 (سندھ) کے باشندہ کو ٹھٹھوی کہا جاتا ہے۔ لیکن فاضل مترجم نے عبدالرشید
 صاحب فرنگ رشیدی کو ص ۳۴۶ پر ”ٹاڈی“ بتا دیا ہے۔ مسلمانوں کی آمد
 سے قبل ٹھٹھ خاندان سومرہ کا دار الحکومت تھا اور جلال الدین محمد خوارزم شاہ
 نے چنگیز خاں سے شکست کھا کر سنہ ۱۲۱۹ھ میں اسی ٹھٹھ میں آکر مستقل قیام کیا
 تھا نیز ملک طغی جس نے سلطان محمد تغلق سے بغاوت کی تھی، یہیں کا حاکم تھا۔
 شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فاضل معاصر مخدوم معین الدین بھی ٹھٹھوی ہی تھے۔
 مدھیہ پردیش کے شہر اجین کو ص ۱۹۹ پر ”اجین“ راجستھان کے انڈسٹریل شہر
 کوٹہ کو ص ۳۱ پر ”کوٹا“ مہاراشٹر کے شہر شول پور کو ص ۳۲ پر ”شول پور“
 پرگنہ کدوری کو ص ۱۷۲ پر ”کدوری“ واکن کھڑا کو ص ۱۷۸ پر ”واکن کھڑہ“

اور اراکان (آسام) کو صفحہ ۲۳ پر "آراکان" ارقام فرمایا ہے۔

صاحب مقالہ ڈاکٹر محمد اظہر علی صاحب نے جن تصانیف سے مراجعت فرمائی ہے فاضل ترجمہ نگار نے ان میں سے کئی نصیفات اور ان کے مصنفین کے ناموں کا اندراج درست نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر موصوف ہی کے ہمنام محمد امین الدینی خاں عالمگیری کی مشہور تصنیف "معنومات الافاق" کو جابجا "معنومات الافاق" لکھا ہے اس کی شروعات ص ۱۱ سے ہوتی ہے اور ایک دوسری تصنیف خلاصۃ السیاق کو متعدد صفحات پر خلاصۃ السیاق "اس کی ابتدا بھی ص ۱۱ سے ہی ہوئی ہے۔ میرجلہ کے فتح آسام اور کوچ بہار کے حالات پر مشتملی تاریخی تصنیف "فتحہ عبریہ" اور اس کے مؤلف شباب الدین طالش سے کم از کم اور نگ زیب پر تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرز ضرور واقف ہیں لیکن زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۳۴ پر مترجم موصوف نے طالش کو "ناشر" اور ان کی تصنیف کو "فتح عبریہ" تحریر فرمایا ہے۔ نتیجہ عبریہ کا اول حصہ تاریخ ملوک آسام کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ فاضل محکم نے اسے تاریخ ملوک آسام بنا دیا ہے۔ ورنہ آسام، خون آسام وغیرہ تراکیب تو رائج ہیں مگر ملوک آسام کی نادر ترکیب پہلی دفعہ دیکھنے میں آئی۔ آسام، آسامیدن (پینا) کا حاصل مصدر ہے۔ ہفت گلشن محمد شاہی المعروف بہ تذکرۃ السلاطین چغتائی مؤلفہ محمد ہادی کامور خاں کافی مشہور تصنیف ہے جس میں تیموریہ خاندان کے ۲۵۰ء تک کے حالات ملتے ہیں۔ اسی معروف تاریخی تصنیف کو ص ۱۱ پر تذکرۃ السلاطین جملہ "تذکرۃ السلاطین چغتائی" لکھا گیا ہے۔ اردو ادب کی مشہور و معروف ادیب محترمہ عصمت چغتائی کا نام آج کل اردو حلقوں میں نوک زبان ہے لیکن فاضل مترجم شاید انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھتے۔ امام التاخرین شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۶۲ھ) کے سیاسی مکتوبات کو محترم المقام پروفیسر فلیق احمد زنگھامی صاحب نے مرتب فرمایا ہے۔

اس وقیع کتاب کو ص ۳۳ پر "سیاست مکتوبات" اور جناب لال رام صاحب کی تالیف "تحفۃ الہند" مطبوعہ ۱۱۴۸ھ کو ص ۲۲۹ پر "تحفت الہند" نیز اثلثی زبدۃ لعز الدین کو ص ۲۲۳ پر ".... ذبذہ" تحریر کیا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی مصنف ضیاء الدین برنی سے شاید ہی کوئی طالب علم ناواقف ہو لیکن اسے ص ۳ پر تاریخ فیروز شاہی "کوئی لاج شامل داس کے ہندی زبان میں لکھے گئے مشہور اتھاس" دیرو نوڈ (بیر بنوڈ) کو ص ۱۲۴ پر "دیرو نوڈ" اور مسالک الابصار فی مالک الامصار کو مضمون خیر حد تک "مالک الامصار" فی مالک الامصار (ص ۶۵) تحریر فرمایا ہے۔ اسی طرح ص ۳۲ پر پریچات (Purchas) کو "پریکاس" اور ص ۱۶ پر "پریکاش" (روشنی) لکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ اسے "پریکاش" نہیں لکھا ص ۳۲ پر "Purchas His Pilgrimes" کا ترجمہ پریکاس کی سیاحت کیا ہے جو نہایت معنی خیز ہے۔ اب تک چینی سیاح فامیان دیوان شوان عراقی سیاح سلیمان سیرانی عرف سلیمان سوداگر، ایرانی سیاح بزرگ بن شہر یار اور مشہور سیاح ابن بطوطہ اور مارکو پولو وغیرہ کے ناموں سے تو راقم الحروف کسی قدر شناسا تھا لیکن "پریکاس کی سیاحت" فقرہ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ عہد اور بگ زیب میں "پریکاس" نام کا بھی کوئی سیاح ہو گذرا ہے۔ شاہ جہاں نامہ (عمل صالح) کے مصنف محمد صالح کنہو کو ص ۳۲ پر "پریکھو" برونٹ "شمبھو" ثبت کیا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اردو ادب کی مشہور و معروف شخصیت مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری مرحوم کو ص ۳۳ پر "عروش" بنا دیا ہے۔ مولانا نے مرحوم غالبیات کے تناور اساطیر، اربعہ میں سے ایک تھے۔ بقیہ تین بقول جناب دوار کا داس شعلہ، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور گرامی قدر مالک رام صاحب ہیں۔ دعا ہے کہ مؤخر الذکر بزرگ کو اللہ تعالیٰ اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے تادیر زندہ و سلامت رکھے۔ موصوف کا پایہ سلامیات میں بھی کافی بلند ہے۔

علم تاریخ کی بعض معروف اصطلاحات کو بھی غلط لکھا گیا ہے، مثلاً: 'اُہدی' جو اکبر کے زمانہ سے مغلوں کے یہاں ایک مخصوص فوجی عہدہ تھا، تقریباً نو دفعہ 'اُہدی' یا 'اہدیوں' اور 'اہدیوں' لکھا ہوا ملتا ہے جس کی شروعات ص ۲ سے ہوتی ہے اور ص ۲۱۳ تک جاری رہتی ہے۔ دراصل لفظ 'اُہدی' 'اُہد' اور 'یا' کے نسبت سے مرکب ہے جو آج کل بہ سکون جائے حطی کاہل اور سست آدمی کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اس کی جمع 'اہدیوں' (راہدیوں) نہ ہو کر 'آہاد' ہونا چاہیے۔ ان فوجیوں کا 'فسرا علی بخش' الٰہ آباد کہلاتا تھا۔ ایک اور اصطلاح 'چتر توغ' یا 'طوغ' کو ص ۲۰۶ پر 'چتر طوق' اور اسی صفحہ پر 'تومان توغ' یا 'طومان طوغ' کو 'طومان طوق' تسلیم فرمایا ہے جو یا مغل امراء پر بادشاہ کی طرف سے نہ صرف چتر وغیرہ ہی سایہ نگین ہوتے تھے بلکہ طوق بھی ان کی گردن کا پھندا بننے کے لئے منظر رہتا تھا۔ اصل میں طوق اس بھاری صنف کو کہتے ہیں جو مجرموں کے گلے میں ڈالا جاتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے وہ اپنی گردن نہ اٹھا سکیں۔ اسے طوغ سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

”کوئی نسبت بھی ان سے نکھول سکیاے کو“

طوغ ترکی لفظ توغ کا مفرس ہے جو فوج کے علم یا نشان کو کہتے ہیں، اسی طرح طومان بھی ترکی لفظ توران یا تمن کا بدل ہے جو گروہ خصوصاً دس ہزار آدمیوں کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور چتر مندی لفظ چتر کا مفرس ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی شہزادہ سلیم الدمان بالی بخت ساتھ بھگوان داس کی شادی کی تقریب کے سلسلہ میں اپنی ایک مشہور نظم میں فرماتے ہیں۔

ادھر راجہ کی نور دینہ گھر میں جملہ ساتھی
ادھر شہزادہ پر چتر عروسی سایہ ستر تھا

علامہ کی اس نظم کا آخری شعر تو زبان زد عوام و خواص ہے۔
 تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
 کہ عالمگیر مزد و کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

مشہور یورپین سیارہ ٹیورنیر (Taurus) جسے جہاں گرد لوگوں کا
 شہزادہ کہا جاتا ہے، ۱۹۳۰ء میں یہاں آیا تھا اور کم و بیش پچیس سال تک ہندوستان
 میں قیام کیا، بڑے بڑے اہل خاص و شائستہ خاں اور میر جملہ سے اس کے دوستانہ
 مراسم تھے، اس ٹیورنیر کو ۲۲۴ پرنیومرنیر لکھا ہے۔ فرانکو لیس پلیرٹ جو ۱۹۲۰ء
 میں ولندیزی ٹیکٹری کے گماشتہ کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔ اس کی تصنیف
 "ریمینسٹرنٹ" اس کے سات سالہ قیام ہندوستان کے تجربات کی عمدہ دستاویز ہے
 جس کے بعض بیانات نہایت دلچسپ ہیں۔ اسے ص ۲۳۰ نیز ص ۲۵۱ پر پلیرٹ
 اور ص ۲۵۲ پر پلیرٹ لکھا ہے۔ "انڈیا ابٹ دی ڈیٹھ آف اکبر کے مصنف مورلینڈ
 کو ۱۹۰۶ء پر "مورلینڈ" اور ص ۱۶۰ پر "مورلینڈ" بنا دیا ہے۔ فریر (Frere) کی تاریخی
 تصنیف "A New Account of the East India and Persia" کا ترجمہ ۱۹۳۰ء
 کے عنوان سے کیا ہے گویا مشرقی ہندوستان اور ایران کی دیوی پر ایک نئی پیشکش
 اور بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ یہاں "نذر" کی بجائے "نظر" ہونا چاہئے۔ یوں بھی
 Account کا ترجمہ نظر نہیں ہوتا۔ سرگزشت وغیرہ لکھنا مناسب تھا۔ فریر
 کو ص ۱۶۶ پر "فرامیر" اور حاشیہ ۳۷ میں "فرائر" لکھا ہے۔ بعض اداروں کے
 نام میں بھی کاتب نے تصحیف اور بے جا تصرف سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر پیش
 سے پہلے صفحہ پر "انڈین کاؤنسل آف ہٹاریکل ریسرچ" کو "انڈین کاؤنسل آف ہٹاریکل"
 انڈیا آفس کو ۳۳۹ پر "انڈیا آفس" اور انگلیش کی مشہور زمانہ یونیورسٹی "کیمبرج" کو

ص ۳۳ پر کیرج "بنادیا ہے نیز مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے "سبحان اللہ کلکشن" کو ص ۲۳۳ پر "سبحان اللہ" بناتے ہوئے قومی یکجہتی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ کاتب جناب محمد ہارون صاحب بھرتپوری سے درخواست ہے کہ وہ اس جذبہ کو اپنے وطن مالوف بھرتپور میں بھی پروان چڑھائیں تو بہتر ہے۔

برادرانِ وطن کے بہت سے نام سے بھی صحیح اطوار کے ساتھ ارقام نہیں فرمائے گئے مثلاً: شیخ الاسلام بن قاضی عبدالوہاب کے ملازم اور بعد ازاں جو دھپور کے حاکم ایسرواس ناگر صاحب فتوحاتِ عالمگیری کے نام ص ۲۸، ۱۲ نیز دوسرے کئی صفحات پر "ایشرداس" اور ص ۳۳۸ ج ۱ پر "ایشرداس" لکھا ہے۔ داس (غلام) تقریباً ایس ہی ہوتا ہے۔ بہر سو اردو کا معمولی طالب علم بھی اسے شاید ہی "ایشر" لکھنے کی غلطی کرے اور اکبری عہد کے معروف جرنیل ابنیر کے راجہ مان سنگھ کچواہہ کو ص ۱۶۶ پر "کچھاوا" اور ص ۲۷۹ پر "کچھاوا" راجہ مہا سنگھ بھدوریہ کو ص ۲۸۳ پر "ماہا سنگھ" کشن سنگھ "تنور" (तनूर) کو ص ۱۸۵ پر "تونور" تلنگ راؤ کو ص ۳۰۶ پر "تینگ راؤ" چیت سنگھ کو ص ۳۳۴ پر "چیت سنگھ" اور نگ زیب کے مشہور کروڑی رسکداس کو ص ۱۳۳ پر "سکداس" تحریر فرمایا ہے۔ یہ وہی رسکداس ہے جسے اورنگ زیب نے اپنے آٹھویں سن جلوس میں عالمین پرگنہ کو احکام شاہی پر کاربند ہونے کے لئے ایک فرمان جاری کیا تھا۔ مورخ ایس۔ آر پھڑکے اور پرماتما سرن کو علی الترتیب ایس۔ آر۔ پھڈکے اور پرماتما سرن (ص ۱۷۵، ۳۲۹) اور راج سنگھ کو ص ۱۰۰ پر "راج سنگھ" تحریر کیا ہے ط

جو چاہے آپ کا حسنِ کمرثمہ ساز کرے

ص ۲۵۷ پر لفظ "نوادیدوں" کو "نوادوں" اور ص ۲۵۹ پر "نوادروں" یعنی

نادر کی جمع جمع ثبت کیا ہے جیرت اس وقت ہوتی ہے جب ص ۲۲۲ پر پہلی ہی سطریں

”تجّار“ کو بھی جمع الجمع کے صیغہ میں تجّاروں“ لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ دیباچہ میں ص ۷۷ پر لفظ ”شکور“ کا استعمال بھی بر محل نہیں ہوا ہے۔ یہ لفظ چار دفعہ شکر گزار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی ”جناب بدرالدین طیب جی کا مشکور ہوں“۔۔۔ ڈاکٹر ستیش چندر کا بہت مشکور و ممنون ہوں،۔۔۔ ہمارا جگہ کار۔۔۔ کا بے حد مشکور ہوں۔۔۔ مسٹر سعیدہ انصاری کا اُن کے تعاون کے لئے ”شکور ہوں“۔ گورام اچرف اردو زبان و ادب کا طالب علم نہیں تاہم اس لفظ کے استعمال کے سلسلے میں اتنا عرض ہے کہ مشکور کی نسبت اُس شخص کی طرف کی جاتی ہے جس نے احسان کیا ہو نہ کہ جس نے احسان ہوا ہے چنانچہ مذکورہ فقرات میں ”شکر گزار“ استعمال ہونا چاہئے تھا نہ کہ مشکور۔ عوام الناس اسے ممنون کے معنی میں اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح راشی کو مرتشی، اور نکالیں کو خالص کے معنی میں۔ اتنا شکر ہے کہ مندرجہ بالا ایک فقرہ میں ”حد“ صحیح لکھا ہوا ہے ورنہ ص ۲۲ کے ح ۷ میں بدبندی لکھا ہوا ملتا ہے۔ متوفی کے بجائے ”توفی“ کا استعمال بھی جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے جو فصیح نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ فقرے بھی ثقلت سے پر ہیں۔ ص ۸۸ پر ”حکومت حکمت کی عملی“ لکھا ہوا ہے جسے ”حکومت کی حکمت عملی“ ہونا چاہئے تھا اور ص ۱۱۱ پر ”کار سار خزانہ“ کو ”کار سار خزانہ“ اکثر مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ سلیس و بانمنا ورنہ ہو کر محض لفظی ہے اور کئی جگہ یہ خیال بھی گذرتا ہے کہ اصل مقالہ کے بعض فقرات کا ترجمہ محذوف ہے۔ چونکہ خاکسار کے پاس ڈاکٹر محمد اظہر علی صاحب کی اصل تصنیف موجود نہیں ورنہ مقابلہ کر کے دیکھ لیا جاتا۔ بیورو کی شائع کردہ تاریخ جہانگیر اور تاریخ شاہ جہاں کے اکثر صفحات میں یہ نقص راہ پا گیا ہے جسے ممکن ہے طبع ثانی میں دور کر دیا گیا ہو۔

مندرجہ بالا امور کے علاوہ زیر نظر کتاب میں بہت سے غام اور روزمرہ

بول چال کے الفاظ بھی غلط ملا کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً ص ۲۶ اور دوسرے صفحات پر خانزادگان یا خان زادوں کو ذال نجمہ سے تحریر کیا ہے۔ محروسہ ص ۲ پر "محروسہ" بمعصر ص ۲ پر "اتم عمر" منافرت ص ۳ پر "منافرت" منہا ص ۵ پر "عنہا" اصول الاعتشاریہ ص ۶ پر "اصول الشاریہ" سوم یا سویم ص ۷ پر "صوم" مستثنیٰ ص ۸۲-۸۳ پر "مشتنی" موافقت ص ۹ پر "موافقت" تصحیح ص ۹۵ پر "تصحیح" غرار الملک ص ۱۰۵ پر "غرار الملک" جامداد ص ۱۰۵ پر "جامداد" دائرہ ص ۱۱۸ پر "دائر" اقطار ص ۱۲۳ پر "انطا" حوالگی ص ۱۲۵ پر "حوالگی" مزارع ص ۱۳۲ پر "مزارعیان" واقعہ ذیل ص ۱۳۶ پر "واقعہ ذیل" بالمقطع ص ۱۶۱ پر "بالمقطع" موروٹی ص ۱۶۳ پر "موروٹی" مشعل ص ۱۶۸ پر "مشعل" لکھا ہوا ہے۔ ص ۱۷۵ پر یہ فقرہ محنتی وکیل دسوز کی کوششوں کے باوجود "محل نظر ہے۔ ص ۱۵۹ پر تنازعات کو "تنازعات" اور قوجیہ کو ص ۱۶۲ پر "توزیع" تحریر فرمایا ہے۔ جارحانہ ص ۱۶۲ پر "جارحانہ" سپا ص ۱۶۹-۱۷۰ پر "سپہ" استفتار ص ۱۷۰ پر "استفکار" رونا ص ۱۷۵ پر "روناں" جرات ص ۱۷۴ پر "جرات" عائشہ بانو ص ۲۰۹ پر "عائشہ بانو" مصالحت ص ۱۷۹ پر "مصالحت" تشخص آب ص ۲۰۵ "تشخیص آب" میزول ص ۲۲۱ پر "میزول" تجارتی مزاج ص ۲۲۸ پر "تجارتی مزاج" تجلید ص ۲۲۶ پر "تجوید" حاجی ص ۲۳۴ پر "حاجی" قدم و حشم ص ۲۵۵ پر "قدم و حشم" لابی ص ۲۵۵ پر "لابی" مآخذ ص ۲۳۰ پر "مآخذ" ایک سند ص ۲۳۳ پر "احمد برارت" ص ۲۶۷ پر "برأت" اور اسی صفحہ کی سر ۲۳۴ پر "برأت" داروغہ ص ۲۶۷ پر "داروغہ" اسی صفحہ پر "صحیفہ" صحیفہ "آغا خور" ص ۲۳۲ پر "آغا خور" نصیبت ص ۲۳۳ پر "نصبت" ہبہ ص ۲۳۳ پر "ہبہ" سترویں ہدیٰ ص ۲۳۳ پر "سترویں ہدیٰ" ہشت ص ۲۴۰ پر "سترویں ہدیٰ" ہشت ص ۲۴۰ پر "ہشت" ماما "یزدشش ماما" کو ص ۲۴۹ پر "شمت ماما" تحریر فرمایا ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ بیسیوں اور

الفاظ بھی غلط لکھے ہوئے مثلاً ”شیعوں“ کو ص ۳۸ نیز ۱۵۸ پر ”شیعوں“ اور
۷۱ پر ”شیعہ“ ”گوشتیہ“ ص ۲۰ پر عالمگیری کو ”عالم گری“ وغیرہ لکھا ہے۔ بہر کیف
اس قسم کی اغلاط کا احاطہ دشوار ہے۔

ترقی اردو بورڈ کی شائع کردہ کتاب تاریخ شاہ جہاں کی اغلاط کی نشاندہی
کرتے ہوئے پروفیسر محمد اسلم صاحب نے فرمایا تھا کہ ”تاریخ شاہ جہاں کی طباعت
ڈاکٹر سیدنا عجاز حسین (مترجم) صاحب اور ان سے بھی بڑھ کر ترقی اردو بورڈ
کے لئے باعث بدنامی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی اردو بورڈ اردو کے
تنزل کے لئے کوشاں ہے۔“ (برہان دہلی بابت فروری ۱۹۸۱ء) راقم الحروف
اورنگ زیب کے عہد میں مغل اُمراء کی نسبت اتنا سخت ریمارک کرنے کی جرات
تو نہیں کر سکتا البتہ اتنی گذارش ضرور ہے کہ اردو بڑی نازک اور بچوتی زبان ہے
لہذا اردو داں حلقوں کا فرض ہے کہ اس کی نزاکت کو برقرار رکھنے کی سعی مشکور
کی جائے اور التماسیدھا لکھ کر اس کے خوشنما چہرہ پر لا جو ردنی نقاب (ماتمی
جامی) نہ ڈالا جائے۔ ورنہ اگر اسی طرح لا تعداد غلطی اغلاط کے ساتھ
ترقی اردو بورڈ کتابوں کی طباعت کرتا رہا تو دوح غالب سے معذرت کے
ساتھ ہمیں یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہ ہو گا کہ

یوں ہی گر لکھتا ”با غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا اس ریختہ“ کو تم کہ دیراں ”ہو گئی“

ایک خاص اعلان

محترمی سلام مسنون - مزاج گرامی!

بعض اہل تشیع نے انداز نمبر مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ ان لوگوں اور ان مخلصین و مریدین احباب کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی وفات کے بعد سے برابر شاندار نمبر نکالنے کے سلسلے میں یہ اعلان اپنے اس رسالہ برہان میں برابر آ رہا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ اب تک میں اس کے مواد کے ذخیرہ کو اکٹھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ پہلی فرصت میں مضامین بھیجیں بہت سے مضامین اور اس کے اجراء کافی تعداد میں جمع ہو چکے ہیں اور نئے سال کے آغاز میں اس کو منظر عام پر لانے کا اللہ کے فضل و کرم سے پورا قصد کر لیا ہے۔ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ اس کے اخراجات کے لئے چندہ اس انداز میں بھیجیں کہ آپ کی خریداری اور مبری میں پیشگی رقم جمع کی جاسکے اور ایک طرح سے اس کی علمی خدمت اور مدد بھی ہو جائے گی۔

استدبارک و تعالیٰ کی ذات گرامی سے میں امید رکھتا ہوں کہ آپ جلد از جلد تعاون فرمائیں گے۔

نوٹ : جن فرموں میں متفرق مساجد اور ٹرسٹوں کے جو بھی امدادی فنڈ قائم کیے گئے ہوں اس سے اس ادارہ ندوۃ المصنفین کی مدد فرمائیں۔ یہ آپ کے ثواب دارین میں داخل ہونے کا ایک اہم مقصد ثابت ہوگا۔

شکریہ

صاحبزادہ عمیر الرحمن عثمانی

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد ۹۸ سیر الاول ۱۴۲۰ھ مطابق نومبر ۱۹۸۹ء شمارہ ۵

- ۱۔ نظرات جمیل مہدی ۲
- ۲۔ صحابہ کرامؓ کی تحصیل حدیث جناب مولوی محمد رضی الاسلام ندوی
- ۳۔ امام ابو زرہ رازیؒ کی کیفیات ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ ۹
- ۴۔ عربی ادب میں ہندوستانی قضا جناب اسیر ادوی
- ۵۔ ملّا صدرا کا رسالہ "وحدت الوجود" ادبی (اعظم گڑھ) ۲۴
- ۶۔ تاریخ اسلام جناب سید محمد ضیاء الدین شمس مسلمان یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۳۲
- ۷۔ خلافت راشدہ و بنی امیہ جناب غلام یحییٰ انجم مسلمان یونیورسٹی علی گڑھ ۳۸
- ۸۔ جناب عبدالرؤف صاحب ایم اے ۵۳

عمید الرحمن عثمانی پرنٹریلشرز جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

دہلی کا راجہ جہانپور نے بے شمار انقلابات دیکھے، دنیا کی مشہور اور بے شمار
خواہ برہمنوں کے رہے ہیں۔ برہمنی کے گھارے کی حیثیت سے ریخ میں گزرتا
گزرتا پانچ چھ برسوں سے ایک بار پھر تاریخ کو دہرائے گا۔ جہانپور کا ہرگز
اور پرائیویٹ کے ان علاقوں سے لیکر ہماں ہندوستان کی مشترکہ مذہب کے
دہلی کے لوگوں، یہاں کے ہندو مسلمان، ستو اور سو فیوں نے جو سنا ہے وہ
اور کمانڈروں نے لوریاں سنائی تھیں۔ نئی دہلی کی پرتعین ہو چکی ہے۔ ایک
نے پرائیویٹ شہر کی دم گھونٹنے، اسی فضا اور بجیڑ بھاڑ سے پناہ کے لئے
کے طور پر شاہی نشان کو ٹھکیاں تعمیر کی تھیں۔ اور کہ لہیاں بسائی تھیں۔ اے
خون ریزی اور موت کے جہیز تاکہ سارے میں، ایک بار یہی مسئلہ سے خائف
نظر آ رہے ہیں۔

اسی دہلی میں تیمور کے خون آشام فوجیوں نے لوٹ مار اور بیخ سمنہ کے ذریعہ یہاں
کے ہندو مسلمانوں کے خون کو مٹر کوں پر بہا دیا۔ لیکن نہ اس کے ایک تہہ کن جھٹکے کے
چاروں طرف تاراجی، ویرانی اور ہرکسو کے آثار چھوڑ کر یہ فوج نذر گئی، یہاں تک کہ
صاحب قرآن تیمور کے جانشینوں نے اپنے ہندو امجد کے گناہوں کی تلافی کے طور پر
دہلی کے مہکتے گلستان اور عیسائی شہر میں اس طرح تبدیل کیا کہ آج تک لال قلعہ اور

جامع مسجد کی عمارتیں، پیر کے نگینوں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں تیمور کے ان جانشین منسل بادشاہوں نے اسی دہلی میں بیٹھ کر جسے ان کے دادا نے قتل عام اور لوٹ مار سے ذریعہ منہدم اور مسمار کر دیا تھا۔ ہندوستان کی تعمیر و ترقی کا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ کہ ایک ایسی سرزمین کو جو ہمیشہ رجواڑوں کی بے شمار سلطنتوں میں بیٹی رہی تھی، ایک ملک، ایک قوم اور ایک مشترکہ تہذیب کے تصور سے مانا مال کیا۔ اور قندھار سے نیکر راس کاری تک کے پورے علاقے کو یک رنگی اور اتحاد کے شیرازہ میں اس طرح باندھ دیا کہ آج بہت کم لوگوں میں یہ احساس باقی رہ گیا ہے کہ جس ملک کی سالمیت، اتحاد اور تحفظ کی وہ بات کرتے ہیں اس کا تمام تر نقشہ منسل بادشاہوں ہی کا بنایا ہوا ہے، جس میں اورنگ زیب نے سترھویں صدی کے آخر میں ۲۵ برس کی باندھائی کے بعد رنگ بھر کر مکمل کیا تھا۔

اسی اورنگ زیب کے جانشین، جس نے ۹۰ برس کی عمر میں میدان جنگ میں غداروں اور بیڑوں کی جھنکار اور توپوں کے دھماکوں کے درمیان جان دی، محمد شاہ جیسے ہوئے جنھوں نے تاریخ میں رنگیلے بادشاہ کی حیثیت سے اپنا نام لکھوایا۔ اسی محمد شاہ کے دور حکومت میں، مغلوں کی شامت اعمال نادر شاہ کے حکم پر ایسے قتل عام کی صورت میں ظاہر ہوئی کہ آٹھ پہر میں اس زمانے میں ایک لاکھ کے قریب دہلی کے باشندے ہلاک ہوئے اور پورا شہر آباد اور شاندار عمارتوں میں لگائی ہوئی آگ اور دھوئیں کے مرغولوں سے جہنم کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ نادر شاہ تو ایک لاکھ باشندوں کے، یہاں کے ہندو مسلمانوں کے خون کا دھارا، یہاں کی گلیوں اور سڑکوں پر بہا کر، تخت طاؤس اور کوہ نور پر سے سمیت مغل بادشاہوں کی پشتوں کی جمع کی ہوئی دولت کے ساتھ ایران واپس ہو گیا لیکن دہلی اس کی لگائی ہوئی مہلک ضرب سے

پھر آخر تک جان بر نہ ہو سکی، اور ایسی بد امنی، طوائف المذاہب اور شوش کا گہوارہ بن گئی کہ اس کے بادشاہ مفلوج و معطل اور بے دست و پا ہو کر رہ گئے اور اس کے مٹ ہیر اور صاحب فن افراد تلاش معاش میں سارے ملک میں سرگرداں، اور حیران و پریشان گھومتے نظر آئے۔

دہلی کی قسمت — نادر شاہ کے حملے کے بعد ایسی بگڑی کہ یہ شہر جو کبھی ساری دنیا کا سب سے بڑا آباد، پر رونق شہر تھا اور ماہرین فن کے بے مثال جمگھٹوں کے محل سے ساری دنیا کے ملکوں کے لئے قابل رشک بنا ہوا تھا، خانہ جنگیوں، آگے واپس کی بغاوتوں، اور شورشوں کی آماج گاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۱۷۵۷ء کے قتل عام کے بعد، جس کے سامنے تیمور اور نادر شاہ کے حمزوں کی دہشت ناک یاد بھی لوگوں کے حافظے سے فراموش ہو گئی، یہاں انگریز راج قائم ہو گیا مجبور و معذور تاجدار اور مغل خاندان کے آخری چشم چراغ ظالمانہ درشاہ ظفر انگریزوں کی قید میں، جلاوطن کر کے رنگین بھجھو دیے گئے۔ اور دہلی کو پوری ایک صدی کی شورشوں، بد نظمی اور بد امنی سے نجات پا کر امن و سکون کے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔

انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے ہر شعبہ زندگی میں انقلاب رونما ہوا، یہاں کا نظام سنت بدلا، پرانا جاگیر داری نظام تبدیل ہوا، یہاں کی سیاست حکمرانوں اور فوجی کمانڈروں کے بجائے عوام کے ہاتھ میں آئی اور بغاوت اور جدوجہد کی جگہ عوام کی سیاسی جدوجہد نے لے لی، تلواروں اور ہندوؤں کے بجائے سیاسی اقتدار اور حکمرانی کے فیصلے لوگوں کی رائے اور ہاتھوں کے اشارے کے ذریعہ کیے جانے لیا جمہوری نظام ابھر آیا۔ ساری پرانی دنیا دیکھتے دیکھتے بدل گئی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی دنیا سارے ملک اور راجدھانی دہلی میں پیدا ہو گئی انگریزوں

سے گزرنے پر مجبور کر دیا جو اس سے پہلے کی خوں ریزیوں کے مقابلہ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کا اتنا خون وہاں بہا، اور ان کے خانہاں برباد ہونے کے ایسے منہ سبروں سے دہلی کا سامنا ہوا کہ جامع مسجد دہلی میں دو ہفتوں تک کوئی نماز اس لئے قائم نہ ہو سکی کہ وہاں لاکھوں پناہ گزینوں کے ہجوم سے تلی دھرنے کی جگہ نہ رہ گئی تھی، اب کی بار یہ خوں ریزی، یہ بدامنی، شورش اور قتل و غارت کی یہ حالت صرف دہلی تک محدود نہ تھی بلکہ تقریباً ملک کے نفسیاتی اور اشتعال گیر رداء کی وجہ سے سراسر شمالی ہند اس طرح دھڑ دھڑا رہا تھا کہ بائیس ہزاروں کی تعداد میں پاکستان جانے والے مسلمانوں کے قافلے، آس پاس اور دور دراز کی بستیوں سے اجڑ کر دہلی میں پہنچتے اور یہاں کے پناہ گزینوں کے نیمپوں کے سمندر میں ندی نالور کی طرح مٹ جاتے۔

اس نئے انقلاب کی بدولت دہلی ایک بار پھر اس طرح آجڑی کہ نہ صرف اس کی شکل بلکہ اس کا کردار بھی تبدیل ہو کر رہ گیا۔ یہاں کے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے ساتھ، ان کی تہذیبی انفرادیت بھی اس نئے انقلاب کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہتی چلی گئی۔ اس انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صرف چار مہینے کی شورش بدامنی، بد نظمی و فتن و غارت کے دور کے بعد، بیسویں صدی کی سب سے بڑی سب سے زیادہ مہتمم رات ان اور عظیم المرتبت گاندھی جی کی جان کی بھینٹ لے کر یہاں امن و سکون کی فضا قائم ہوئی، تو دہلی کا شہر عملی طور پر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی اکثریت کے طفیل ایک پنجابی شہر ہو کر رہ گیا تھا جہاں پنجابی تہذیب کی چھاپ ہر شعبہ زندگی پر نظر آنے لگی۔

دہلی کی اس نیم غیر متوازن سماجی زندگی میں برہمن اور خلفشار کا دوسرا دور

۱۹۷۵ء میں شروع ہوا جبکہ یہاں کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کو ایک بار پھر اہم جہنمی کی سختیوں اور تباہ کاریوں کا شکار ہونا پڑا۔ اور ترکمان گیٹ اور دوسرے علاقوں میں ان کی تاراجی اور خانہ بریادیوں کے دردناک واقعات پیش آئے، پھر اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے ایک نئے سلسلہ سے انھیں دوچار ہونا پڑا۔

۱۹۸۰ء کے بعد سے پرانی دہلی کے وہ علاقے، جہاں ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے مسلمانوں کی کچی کھچی آبادی جوں توں کمر کے اپنی زندگی بسر کر رہی تھی، فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں رہے ہیں، ان فسادات کی بنیاد فراش خانہ اور دودگران محلوں میں واقع ہریجن بستی اور آس پاس کے مسلم محلوں کے نوجوانوں کے درمیان تکرار اور جھگڑوں سے پڑی، جو بلدھی ویسے ہی ہریجن مسلم فساد میں تبدیل ہو گئی، جس طرح مراد آباد، اور دوسری جگہوں میں تبدیل ہوئی تھی، پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان فسادات میں مندر مسجد کے جھگڑوں، نعروں اور جلوسوں، باجوں اور سنگھوں اور ترشولوں کے عناصر شامل ہوتے گئے، اور اب نوبت یہ آگئی ہے کہ جامع مسجد، خوض قاضی، ٹیپا محل، لال کنواں، اور فراش خانہ کے محلے ہندو مسلم فسادات کے ایسے حساس مرکز بن گئے ہیں، اور کشیدگی کی شدت سے اتنے گرم ہو گئے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے وہاں دھڑ دھڑ آگ جلنے لگتی ہے، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کرفیو، پولیس گشت، اور کاروبار کا تعطل وہاں روزانہ کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے، اور اس کا تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن نے بھی اسے زندگی کے ایک معمول کی صورت میں قبول کر لیا ہے، اس لئے وہاں تنازعہ کو مکمل طور پر ختم کر دینے کا کوئی منصوبہ اب تک زیر غور نہیں ہے۔

نئی دہلی کی وہ کالونیاں جو آدھی صدی سے زیادہ مدت تک امن و سکون کا گہوارہ اور عیش کوشی کی جنت سمجھی جا رہی تھیں، ۱۹۴۷ء کے ہندو سکھ فسادات کے بعد، جو سابق وزیراعظم اندرا گاندھی کے قتل کے رد عمل میں شروع ہوئے تھے، اب سب سے زیادہ غیر محفوظ اور غیر یقینی صورت حال کا شکار نظر آتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ دارالامن دہلی ایک بار پھر بد نظمی، فتنہ و فساد، شورش اور بد امنی کے شکنجہ میں پھنس گیا ہے، اور ہندوستان کا دلی کہلانے والی دلی ایک بار پھر خون ریزی، لوٹ مار، آتش زنی اور تشدد کے دور دورے سے بے حال نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دمشت ناک خیال یہ ہے کہ جب بھی دہلی اپنی رونق آبادی اور خوش حالی کے بام عروج پر پہنچی ہے، کسی بھی آفت ناگہانی کا شکار ہو کر بد حال اور ویران ہو گئی ہے، اس لئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس کا یہی انجام قریب نہ ہو۔

صحابہ کرامؓ کی تحصیل حدیث کی کیفیات

جناب مولوی محمد منی الاسلام صاحب ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

صحابہ کرامؓ کے تحصیل حدیث کی کیفیات

کتب حدیث کا مطالعہ کرنے سے ہمارے سامنے صحابہ کرامؓ کے تحصیل حدیث کی مختلف کیفیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات:

اگر کوئی واقعہ پیش آتا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود رہتے تو آپ اس کا حکم بتلا دیتے تھے۔ جو لوگ اس وقت موجود رہتے ان کے ذریعہ دیگر صحابہ کو بھی معلوم ہو جاتا۔ اگر حاضرین کی تعداد زیادہ ہوتی تو جلد ہی اس واقعہ کی خبر پھیل جاتی لیکن اگر لوگ کم ہوتے تو ان کو لوگوں میں منادی کرنے کے لئے بھیجتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ان کے پاس تشریف لائے وہ ایک شال اوڑھے ہوئے تھیں جس میں کچھ تصاویر تھیں۔ اسے دیکھ کر آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر آپ نے اس شال کو لیا اور پھاڑ ڈالا، پھر فرمایا:

إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ
الَّذِينَ يَشْبَهُونَ خَلْقَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ۔
قیامت میں سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو خدا کی مخلوقات کی تصاویر بناتے ہیں۔ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو غلابیچ رہا تھا آپ نے اس سے پوچھا کیسے بیچ رہے ہو؟ اس نے

بتلایا، پھر آپ نے اس سے کہا کہ اس میں ہاتھ ڈالو اس نے ہاتھ ڈال تو معلوم ہوا کہ اندر
بھی گانگہ ہے۔ آپ نے فرمایا: ایسی منامن عشتانا (جو ہمیں دعو کا رستہ وہ ہم میں
سے نہیں) (مسلم، احمد)

اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی صحابی کو غلطی کرتے ہوئے دیکھتے تھے
تو اس کو تنبیہ کر دیتے تھے اور اس کی اصلاح فرما دیتے تھے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ
روایت کرتے ہیں کہ غزوہ خیبر میں جنگ کے بعد کچھ کہنے لگے کہ فلاں شہید ہے فلاں شہید
ہے حتیٰ کہ ایک آدمی کے پاس پہنچے اور اس کے بارے میں بھی کہا فلاں شہید ہے۔
آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا:

كَلَامِي، اَيْتُهَا النَّارُ فِي بَرْدَةٍ
غَلْمًا اَوْ عِبَاءَةً۔
ہرگز نہیں اسے میں نے دوزخ میں دیکھا ہے
مال غنیمت میں سے ایک چادر چوری کر۔
کی وجہ سے۔

پھر فرمایا:

اِذْ هَبْ نَفَاثًا فِي النَّاسِ اِنَّهُمْ
لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمَوْمِنُونَ۔
جاؤ لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنت میں صرف
مومنین ہی جائیں گے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اعلان کیا (احمد)
ایک بار ایک شخص نے جلدی جلدی بغیر تعدیل ارکان کے نماز ادا کی تو آپ نے
اس کو ٹوکا اور فرمایا:

اِذْ هَبْ فَصَلِّ فَيَا نَكَتَ لِمَ تَصِلُ
بِكَ مَرْتَبَ صَحَابِي جَلْدِي وَصَوِّ كُرْبِي
جاؤ پھر سے نماز پڑھو تمہاری نماز نہیں ہوئی۔
ابک مرتبہ صحابی جلدی جلدی و صو کر رہے تھے اس طرح کہ ان کی ایڑیاں خشک
رہ گئیں آپ نے فرمایا:

اَسْبَغُوا الْمَوْمِنُونَ، فَوَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ
پورا وضو کرو۔ خشک رہنے والی ایڑیاں

من النار

پہ جہنم کا عذاب ہوگا۔

اسی طرح اگر آپ پر قرآن کی آیات نازل ہوتیں تو آپ ان کی تشریح کرتے ان نے جس کی تفصیل کرتے عام کو خاص کرتے ناسخ و منسوخ بتلاتے مبہم کو متعین کرتے مثلاً غایب المعنوب علیہم ولا الضالین کا تفسیر میں حضرت عذری بن حاتم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "یہود مغضوب علیہم والنصارى ضلال" (ترمذی) (یعنی مغضوب علیہم سے مراد یہودی اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں) حافظوا علی الصلوات والصلوة الوسطیٰ کی تفسیر میں آپ نے فرمایا: الصلوة الوسطیٰ ہی العصر (ترمذی) یعنی صلوۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ میں آپ نے فرمایا: الحمد للہ سب اب العالمین ہی السبع المثنائی (بخاری) یعنی الحمد للہ... سبع مثنائی ہے۔

۷۔ سوالات و جوابات :

تحصیل حدیث کا ایک طریقہ "سوالات و جوابات" کی شکل میں ہوتا تھا۔ اس کی تین صورتیں تھیں :

۱۔ کبھی اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو بھیجتا تا کہ وہ حضرات صحابہ کے سامنے انسانی شکل و صورت میں جا کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرے اور اس طرح صحابہ کرام کو دینی تعلیمات اور احکامات معلوم ہوں۔ حدیث جبرئیل اس سلسلے میں بہت مشہور ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب سے مروی ہے کہ ہم ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا جس کے کپڑے انتہائی سفید تھے بال انتہائی کالے تھے۔ اس پر سفر کے آثار بھی نہیں تھے اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

بیٹھ گیا اس کے بعد آپ سے اسلام، ایمان، احسان، قیامت اور علامات قیامت کے متعلق سوالات کئے اور آپ نے جوابات دینے اس کے بعد چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد آپ نے مجدد سے پوچھا جانتے ہو یہ کون تھے؟ میں نے کہا اللہ ورسولہ أعلم فرمایا: ہاں، جبرئیل اُتاکم لعلکم دینکم (یہ جبرئیل تھے جو تمہیں دین سکھانے آئے تھے) (مسلم)

۲۔ کبھی خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے سوال کر دیا کرتے تھے اور پھر خود ہی اس کا جواب دے دیا کرتے تھے چنانچہ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک گدھے پر سوار تھا میرے اور آپ کے درمیان کجاوہ کے علاوہ کوئی چیز حامل نہ تھی۔ آپ نے فرمایا: اے معاذ! جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ ورسولہ أعلم آپ نے فرمایا: اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو لوگ شرک نہ کریں انہیں عذاب نہ دے (متفق علیہ)

۳۔ البتہ بیشتر مواقع پر خود صحابہ کرامؓ اپنے مسائل اور پیش آنے والے واقعات کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سوالات کا جواب دیتے تھے۔

ابتداء میں اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو زیادہ سوالات کرنے سے منع کر دیا تھا اور خود قرآن شریف میں کثرت سوال سے بھی وارو ہے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسْأَلُكُمْ رَاے مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کرو کہ اگر وہ ظاہر ہو جائیں تو تم کو برا لگے اس لئے حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

وَنَهَيْتَانِي الْقِرَاءَتِ أَنْ نَسْأَلَ
النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ
يُجِيبُنَا أَنْ يَجِيئَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ
الْبَادِيَةِ الْعَاقِلِ فَيَسْأَلُهُ وَنَحْنُ
لَنُصْنِعَ (بخاری کتاب الایمان)

ہمیں قرآن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سے سوالات کرنے سے منع کر دیا گیا
تھا لہذا ہماری خواہش یہ ہوتی تھی کہ
کوئی عقلمند دیہاتی آئے اور آپ سے
سوالات کرے اور ہم سنیں۔

مگر ایسا دراصل بے نیکی کے سوالات پر پابندی لگانے کی غرض سے تھا ورنہ
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود صحابہ کرام کو سوالات کرنے پر اکساتے تھے۔ ایک
بار سردی کے زمانے میں ایک صحابی زخمی ہوئے پھر انھیں احتلام ہو گیا۔ لوگوں
نے انھیں نہانے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا:

قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللَّهُ أَلَمْ يَكُنْ
شَفَاءَ الْعِيِّ الْمَسْأَلِ

ان لوگوں نے اس کو مار ڈالا (خدا
انھیں غارت کرے) کیا نادانیت کا
علاج سوال نہیں تھا۔ (ابوداؤد)

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام اپنے مسائل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے سوالات میں بعض شخصی زندگی سے متعلق ہوتے
تھے۔ مگر بعض ایسے ہوتے تھے جو عام طور پر انسانوں کو پیش آتے ہیں۔ ان سوالات
میں صحابہ کرام ذرا بھی نہ شرماتے تھے اور فوراً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
معلوم کر لیتے تھے تاکہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ اگر کوئی صحابی کسی وجہ سے ہچکچاہٹ
محسوس کرتا تو وہ دوسرے صحابی کو حکم دیتا کہ وہ آپ سے دریافت کر لے۔ حضرت
علیؑ اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ مجھے مذہب بہت آتی تھی میں اس کے حکم کے متعلق
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے میں شرم محسوس کرتا تھا کیونکہ آپ کی

صاحبزادی — حضرت فاطمہ — میرے نکاح میں تھیں اس لئے میں نے حضرت مقداد بن اسودؓ کو حکم دیا کہ وہ آپ سے معلوم کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا: بیسلی ذکرہ ویتوضا۔ اگر کسی شخص کو یہ پٹیل آئے تو وہ عضو تناسل

(مسلم، احمد) کو دھوئے اور وضو کرے۔

حضرت عقبہ بن الحارثؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کر لے پھر بعد میں معلوم ہو کہ وہ اس کی رضاعی بہن ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کیف وقد قبل؟ (اب کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کہا جا چکا)۔

حضرت علی بن طلحہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے یا کسی دوسرے آدمی نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا اسی حالت میں ران کھجلانے لگا کہ اچانک میرا ہاتھ عضو تناسل سے مس ہو گیا اس کا کیا حکم ہے (کیا وضو ٹوٹ جا چکا گا؟) آپ نے فرمایا ھل ھو الا بضعتہ منی (وہ تو جسم ہی کا ایک حصہ ہے) اسی طرح صحابہ کرام کو عبادات و عقائد، معاملات اور دیگر اشیاء کے متعلق سوالات کرنے میں بھی حیا لاحق نہ ہوتی تھی بلکہ اگر کسی صحابی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث دوسرے صحابی کے واسطے سے پہنچتی تھی تو وہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کی کوشش کرتا تھا اور آپؐ ہی کی زبانی سننے کا متنی ہوتا تھا۔ حضرت نہام بن ثعلبہؓ کی وہ حدیث تو بہت مشہور ہے جس میں ہے کہ وہ اپنی قوم کے نمائندوں کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپؐ سے کئی سوالات کیے تھے (بخاری کتاب العلم)

آپؐ سے اگر کوئی صحابی سوال کرتا یا کوئی مسئلہ پوچھتا اور آپؐ کو اس کا حکم نہ معلوم ہوتا تو وحی الہی کا انتظار کرتے پھر وحی سے معلوم ہو جانے کے بعد بتلاتے۔ حضرت سہیل

بن سعد فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک انصاری آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کا کیا خیال ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو خلوت میں دیکھے تو اسے قتل کر دے یا کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ تہمت لگانے والے پر حد قذف جاری ہوگی یا وہ بیٹہ پیش کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی والذین یؤمنون انما واجہم الآیہ تب آنحضرتؐ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اور تمہاری بیویوں کے معاملہ میں فیصلہ ہو گیا (بخاری کتاب اللعان) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات پھرنے اور مسائل معلوم کرنے میں صحابیات بھی پیچھے نہ تھیں ان کو بھی اگر کوئی اشکال ہوتا تو فوراً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا کرتی تھیں حتیٰ کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمارے لئے ایک دن خاص کر دیجئے چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ اے عورتو! خوب صدقہ کیا کرو اور خوب استغفار کیا کرو کیونکہ میں نے جہنم میں تمہاری تعداد زیادہ دیکھی ہے۔ ایک صحابیہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایسا کیوں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کیونکہ تم لعن طعن بہت کرتی ہو، میں نے تم سے زیادہ کسی ناقص العقل اور ناقص الدین کو نہیں دیکھا ہے جو عقلمندوں پر غالب آجاتی ہو۔ انہوں نے پھر سوال کیا یا رسول اللہ! نقصان عقل اور نقصان دین سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نقصان عقل تو یہ کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے اور نقصان دین کہ عورت اپنے مخصوص عذر (حیض و نفاس) کی وجہ سے کئی کئی دن تمارا مددوں سے رُک رہتی ہے۔

صحابیات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مخصوص سوالات کرنے میں بھی نہ جھکتی تھیں۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: بہترین عورتیں انصاری

عورتیں ہیں کیونکہ انھیں دین کے معاملے میں سوالات کرنے سے حیا مانع نہیں ہوتی ہے۔
 حضرت ام سلمہؓ نے ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ خواب میں اگر
 عورت بھی وہی کچھ دیکھے جو مرد دیکھتا ہے تو کیا وہ غسل کرے گی۔ رسول اکرم صلی اللہ
 علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اگر تری محسوس ہو۔ حضرت عائشہؓ نے سوال کیا کیا عورت
 بھی یہ سب دیکھتی ہے؟ فرمایا کیوں نہیں پھر بچہ مشابہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟
 اسی طرح اگر کسی معاملہ میں دو صحابہ کے درمیان نزاع ہو جاتا تو وہ رسول اکرم
 صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح بات معلوم کرنے کے لئے رجوع کرتے تھے۔ حضرت
 عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام کو سورۃ فرقان میں
 کچھ ایسے حروف پڑھتے ہوئے سنا جو مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں
 بتلائے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ قرأت تم کو کس نے بتلائی ہے؟ انھوں نے
 کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، میں نے کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، رسول اکرم
 صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ایسا نہیں پڑھایا ہے۔ پھر میں ان کا ہاتھ پکڑ کر رسول اکرم
 صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور عرض کیا کہ آپؐ نے مجھ کو سورۃ فرقان
 پڑھائی ہے۔ میں نے ان سے سنا وہ اس میں کچھ حروف پڑھا رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے
 ہشام سے فرمایا پڑھو، انھوں نے پڑھا تو فرمایا: ہکذا انزلت (اسی طرح نازل
 ہوئی ہے) پھر مجھ سے کہا پڑھو میں نے پڑھا تو فرمایا: ہکذا انزلت، ان القرآن
 انزل علی سبعة احرف فاقرأ واما تیسر (احمد) (اسی طرح نازل ہوئی ہے۔
 دراصل قرآن سات طریقوں سے نازل ہوا ہے لہذا جس طرح سہولت ہو اسی
 طرح پڑھو)

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کا مشاہدہ :

تخمین حدیث کی تیسری صوبت یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے افعال و اعمال کا مشاہدہ کرتے تھے پھر ان پر عمل کرنے اور اپنی زندگیوں میں جاری ساری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت علیؑ کی روایت ہے اَوْتِرَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم مِنْ اَوَّلِ اللَّیْلِ وَاٰخِرَہٗ وَوَسَطِیْہَا فَاَتَمَّہَا وَتَرَدَّ اِلَی السَّجْدِ (احمد) رسول اکرمؐ نے ایک بار اول لیل میں وتر پڑھی ایک بار آخر لیل میں ایک بار وسط لیل میں یہاں تک کہ ایک بار سحر سے پہلے پہلے تک وتر کی نماز پڑھی)

حضرت سالم اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں: اَنَّہْ ذَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم وَاَبَا بَکْرٍ وِعُمَرُ یَمِشُوْنَ اِمَامَ الْجَنَانِۃِ (احمد) ابو داؤد) انھوں نے رسول اکرمؐ علی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر و حضرت عمرؓ کو جنازہ کے آگے آگے چلتے ہوئے دیکھا ہے) حضرت علیؑ بن ابی طالب سے روایت ہے کہ ایک بار ہم لوگ رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے ہی جا رہے تھے کہ آپؐ نے اشارہ سے ہم لوگوں کو کھڑے رہنے کا حکم دیا احد خود چلے گئے پھر جب واپس آئے تو آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ نماز پڑھانے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ نماز پڑھاتے وقت مجھے یاد آگیا تھا کہ میں منی ہوں۔ اگر تم میں سے کسی کو ریاح محسوس ہو یا میری طرح کی حالت پیش آئے تو وہ چلا جائے اور حاجت پوری کرنے کے بعد آگے نماز پڑھے (احمد، ابو داؤد)

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریرات کا مشاہدہ :

تحفیں حدیث کا ایک طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریرات کا مشاہدہ تھا۔ تقریر کی تعریف محدثین یوں کرتے ہیں کہ کوئی صحابی آنحضرتؐ کی موجودگی میں کچھ کرے یا کہے اور آنحضرتؐ اس کو منع نہ کریں اور خاموش رہیں ”وَمَعْنٰی التَّقْرِیْۃِ اَنَّہٗ فَعَلَ اَحَدٌ اَوْ قَالَتْ شَیْءًا فِی حَضْرَتِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم وَلَمْ یَنْکُرْہٗ وَلَمْ یَنْہَہٗ

عن ذلک بن سکت وقدر (مقدور مشکوٰۃ مودنا عبدالحق محدث دہلوی)

ایک بار آنحضرتؐ نے چند صحابہ کو ایک جگہ بھیجا اور فرمایا : لا یصلین احدکم العصر الا فی قریظۃ (تم لوگ عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر پڑھنا) رسول کریمؐ کے اس فرمان سے بعض صحابہ نے نہیں کو حقیقت پر محمول کیا چنانچہ انھوں نے عصر کی نماز مغرب کے بعد تکب مؤخر کی اور بنی قریظہ ہی میں جا کر ادا کی اور بعض صحابہ یہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ عصر تک بنی قریظہ پہنچ جائیں چنانچہ انھوں نے عصر کے وقت ہی نماز پڑھ لی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کے اس معاملے کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے ”تقریر“ فرمائی اور کسی کی تنکیر نہیں کی (صحیحین)

اسی طرح آپؐ کی خدمت میں ایک درتہ گوہ کا گوشت پیش کیا گیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے تو کھالیا مگر آپؐ نے نہیں کھایا صحابہ نے پوچھا کہ کیا اس کا گوشت حرام ہے ؟ آپؐ نے فرمایا : لا ولکن لیس فی اہل قومی فاجد فی اعانہ (نہیں بلکہ یہ میرے وطن میں نہیں پایا جاتا ہے اس کے لیے میری طبیعت کراہت کرتی ہے)

۵۔ دیگر صحابہ کرامؓ کا واسطہ :

صحابہ کرامؓ تحصیل سنت یوں بھی کرتے تھے کہ اگر کسی ضرورت سے کسی دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر نہ ہو سکتے تھے تو ان صحابہ سے حاصل کر لیتے تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شریک ہوتے تھے اور آپؐ کے اقوال و اقوال کا مشاہدہ کرتے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں :

لیس کل ما نحد حکم عن رسول اللہ	ہم جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت
صلی اللہ علیہ وسلم ، سمعناہ (عندہ)	کرتے ہیں وہ آپؐ سے سنا نہیں ہے بلکہ ہم
ولکن کان یحدث بعضنا بعضاً	میں سے بعض بعض کے واسطے سے حدیث

دلائلہم بعضنا بعضا

(المحدث الفاضل)

تھا۔

حضرت برادر بن العازبؓ فرماتے ہیں :

لیس کلنا کان یسمع حدیث رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم، کانت لنا
ضیعتہ واشغال ولكن الناس لم
یکونوا یکذبون یومئذ فیحدث
الشاهد الغائب

(المحدث الفاضل بین الراوی الوائی)

انہیں سے ایک دوسری روایت ہے۔ فرماتے ہیں :

ما کل المحدث سمعناہ عن رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کان یحدثننا
أصحابنا وکنا مشغولین فی رعاۃ
الابل واصحاب الرسول کانوا
یطلبون ما یفوتہم سماعہ من
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یسمعونہ من اقوانہم

(معرفۃ علوم الحدیث)

۱۔ وفود : چاروں ذریعہ

تلقی حدیث کا ایک ذریعہ وہ وفود تھے جو اپنے قبائل کے نائندے بن کر خدمت
بوی میں حاضر ہوتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب کوئی بڑی سیاسی قوت اسلام کے

بیان کرنا تھا اور کوئی کسی کو متہم نہ کرتا
تھا۔

ہم میں سے تمام لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سے احادیث نہیں سنتے تھے۔ ہماری زمینیں
تھیں اور بہت سے کام تھے لیکن لوگ
اس زمانے میں جھوٹ نہیں بولتے تھے
چنانچہ شاہد غائب کو حدیث سنا دیتا تھا۔

تمام احادیث ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سے نہیں سنی ہیں۔ ہم سے صحابہ حدیث
بیان کرتے تھے اور ہم اونٹ چرانے میں
مشغول رہتے تھے۔ ہم اصحاب رسول اگر
کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سُن پائے
تھے تو اپنے رفقاء سے حاصل کر لیتے
تھے۔

مقام نہ رہ گئی اور اسلام کا بول بالا ہو گیا تو وہ فود کا تانتا بندھ گیا حتیٰ کہ اسلامی تاریخ میں اس سال کو عام الفود سے یاد کیا جاتا ہے۔ پورے عرب اور اس کے باہر سے بھی بہت سے فود آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اسلامی احکام و تعلیمات حاصل کرتے تھے اور اس کے بعد اپنی قوم میں جا کر لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ان میں سے وفد بنی تمیم، وفد بنی سعد، وفد نجیب، وفد بنی ناعمر، وفد بنی زبید، وفد عبدالقیس، وفد اہل یمن، وفد مزینہ بہت مشہور ہیں۔ حضرت ضمام بن ثعلبہ کا واقعہ کتب حدیث میں بہت آتا ہے وہ وفد بنی سعد کے ساتھ آئے تھے۔

۷۔ ازواج مطہرات :

تخفیل حدیث کا ایک ذریعہ ازواج مطہرات کی ذات تھی ازواج مطہرات کی وجہ سے ہم کو وہ بہت سے داخلی اور گہری مسائل معلوم ہوئے کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو ہرگز نہ معلوم ہو سکتے تھے۔ حیض و نفاس، غسل و جماع کے سلسلہ میں تقریباً جملہ معلومات..... صرف ازواج مطہرات ہی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں۔

اگر صحابیات کسی مسئلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم محسوس کرتیں تو ازواج مطہرات ہی کو وسیلہ بنالیتی تھیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابہ کو بہت دم آتا تھا انھوں نے حضرت ام سلمہؓ سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا لَتَنْظُرَنَّ عَلَیَّ اللَّیَالِیَ وَالْاِیَّامَ الَّتِیْ کَانَتْ تَحِیضُ مِنْ الشَّہْرِ الْاَوَّلِ (یعنی مہینہ کے جن دنوں میں اسے پہلے حیض آتا تھا اس کا اعتبار کرے گی)

ایک صحابی نے حالت صوم میں اپنی بیوی کو بوسہ دیا پھر بعد میں بہت خوفزدہ ہوا چنانچہ اپنی بیوی کو اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا وہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس گئیں اور ان سے مسئلہ معلوم کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حالت صوم میں بوسہ دیتے ہیں۔ صحابیہ نے واپس آ کر شوہر کو بتلایا مگر وہ اور بھی خوفزدہ ہوئے، کہنے لگے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کیسے ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے بہت کچھ جائز کر رکھا ہے چنانچہ انھیں دو بارہ بھیجا وہ پھر واپس گئیں اس وقت وہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود تھے۔ آپ نے ام سلمہؓ سے ان کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے تفصیلات بتلائیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آ گیا۔ آپ نے فرمایا: واللہ انی لا اتقاکم اللہ وَاَعْلَمُکم بِحُدُودِہ (یعنی میں تم میں سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کے حدود سے واقفیت رکھنے والا ہوں پھر جب میں یہ سب کرتا ہوں تو تم لوگ کیوں نہیں کرتے)۔

اسی طرح اگر کوئی صحابیہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مسئلہ دریافت کرتیں اور اس کا جواب صراحتاً دینا آپ پسند نہ کرتے تو ازواج میں سے کسی کو حکم دیتے اور وہ ان کو سمجھا دیتیں۔ ایک صحابیہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میں حیض سے کیسے پاک ہوں جبکہ دم استحاضہ آ رہا ہو۔ آپ نے فرمایا: خذی فرصۃً تمسکۃً تتوضی بہما (یعنی خوشبو میں بسایا ہوا ایک روئی کا ٹکڑا لے لو اور اس سے طہارت حاصل کرو) انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ اس سے کیسے طہارت حاصل کروں؟ آپ نے پھر وہی فرمایا مگر وہ نہ سمجھیں تو آپ نے حضرت عائشہؓ کو اشارہ کیا کہ انھیں سمجھا دیں۔ انھوں نے ان کو سمجھا دیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روئی کا ایک صاف ٹکڑا لو اور اس سے دم کے اثر کو پوچھ دو (متفق علیہ)

۸۔ کتابت :

صحابہ کرام کے تحفیل حدیث کا ایک اہم ذریعہ کتابت تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے شروع میں کتابت حدیث سے منع کر دیا تھا مگر بعد میں اجازت دیدی۔ اس سے ہم یہاں بحث نہیں کریں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں صحابہ کرام نے حدیث کے بہت سے مجموعے تیار کر لئے تھے۔ یہ موضوع بحث سے خارج ہے۔ یہاں ہم صرف اس موضوع پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے متعدد بار تحریری شکل میں احادیث حاصل کی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طویل خطبہ دیا تھا اور اسلام کے جو اصولی احکام بیان فرمائے تھے۔ یمن کے ایک صحابی حضرت ابو شاہ کی خواہش پر آپ نے وہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالے کرنے کا حکم دیا (بخاری کتاب العلم) صلح حدیبیہ کے بعد ۳ھ میں آپ نے جزیرۃ عرب کے رؤسا و منوک اور روم و ایران کے شہنشاہوں اور سلطانین کے نام خطوط ارسال کئے تھے (طبقات ابن سعد) ایک بار آپ نے چند صحابہ کو ایک سریرہ میں بھیجا اور ان کو ایک خط بھی دیا اور فرمایا کہ اس کو فلاں جگہ پہنچ کر کھولنا، آپ نے زکوٰۃ کے احکام، مختلف چیزوں پر زکوٰۃ اور اس کی شرحیں لکھوا کر، مختلف امرار کو بھیجی تھیں اور وہ حضرت ابو بکرؓ اور کئی دیگر صحابہ کے پاس موجود تھیں (دارقطنی کتاب الزکوٰۃ) حضرت عمرو بن حزمؓ کو یمن کا گورنر مقرر کرتے وقت آپ نے صدقات ادبیات اور فرائض و سنن کے متعلق ایک تحریر لکھوا کر حوالے کی (جامع بیان العلم) آپ نے اپنی وفات سے کچھ دن قبل قبیلۃ جہینہ کی طرف یہ لکھوا کر بھیجا تھا: لا تمنعوا من المیتۃ، باہاب ولا عصب (الہیڈ) (مردار کی کھال اور پنٹے سے انتقال نہ کرو)۔ حضرت وائل بن حجرؓ جب بارگاہ نبوی سے رخصت ہو کر اپنے وطن حضرموت جانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر ان کو ایک تحریر لکھوا کر دی جس میں باز، روزہ، سود اور شراب کے متعلق احکامات تھے۔ آپ نے اب یمن کو جو مسیئے لکھ کر بھیجے تھے ان میں سورۃ قرآن

عشقِ رقبہ اور طلاق کے مسائل تھے (دامی) حضرت معاذؓ نے یمن سے سبز یوں کی زکوٰۃ کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے تحریری جواب دیا کہ سبز یوں پر زکوٰۃ نہیں (فاروقی) فتح مکہ کے بعد عام الموخود میں وفدِ عجیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف چیزوں کے متعلق سوالات کیے اور آپؐ نے ان کے سارے سوالات کے جوابات لکھوا کر دیے (زاد المعاد) ہم نے یہاں صرف چند احادیث بطور مثال ذکر کی ہیں ورنہ آپؐ نے وقتاً فوقتاً جو تحریری احکام، خطوط، صلحنامے و دعوت نامے لکھوائے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

تحصیلِ حدیث میں صحابہ کرامؓ کی جانفشانیاں :

صحابہ کرامؓ کے تحصیلِ حدیث کے یہ چند طریقے تھے ورنہ انہوں نے اور بھی متعدد طریقوں سے اور بڑی ہی جانفشانیوں اور جدوجہد سے احادیث حاصل کیں اور صرف یہی نہیں بلکہ انہیں اپنی زندگیوں پر منطبق کیا، اپنی زندگیوں کو احادیث کے سانچے میں ڈھالا اور اسی کے رنگ میں رنگ گئے۔ صحابہ کرامؓ احادیث کی زندہ اور چلتی پھرتی کتابیں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی سنا اور آپؐ کو بھیجا کرتے دیکھا سب کو اپنی زندگیوں پر جاری و ساری کیا اور اپنے مابعد کے لوگوں کے لئے احادیث کا ایک ایسا عظیم ذخیرہ ہر طرح کی تحریفات سے محفوظ صورت میں پیش کیا جو انسانی زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمان و مکان کے لئے پیش کیا جاسکتا

ہے۔

امام ابو زرہ رازیؒ

حناب اسیر اور دی۔ ادبی (اعظم گڑھ)

اسی سلسلہ کی یہ دوسری کتاب ہے

بیان خطا البخاری فی تاریخہ کتاب میں ابو زرہ نے التاریخ الکبیر میں جو

غلطیاں اور اوہام تھے یا بعض تراجم میں نقص تھا یا اسماء و کنی کے تلفظ یا روایت میں یا ان کے مقام و مرتبہ میں جو افراط و تفریط آگئی تھی ان خامیوں کو دور کیا گیا ہے خود ابو زرہ کا اس سلسلہ میں بیان ہے، ابو علی صالح بن محمد الحافظ کہتے ہیں

ابو زرہ نے مجھ سے کہا کہ میں نے امام بخاری کی

کتاب دیکھی تو مجھے اس میں بہت سی غلطیاں نظر

آئیں تو میں نے ان سے کہا کہ خود مجھے بھی اس کا

تقریباً کوئی بھی عراق وغیرہ سے آتا تو وہ ان

کی کتابوں کو دیکھتے اندر جہاں میں کوئی ایسا

نام نظر آتا جس کے بارے میں ان کو علم نہ ہوتا تو

تو اس کو لکھ لیتے جب کہ ان کی کتابوں میں غلطی

نہیں دے جاتے تھے اس لئے غلطیوں کا امکان

اور بڑھ جاتا تھا یہ بات اپنی جگہ ضرور ہے کہ اتنا

فیہ فیہ غلطیوں کوئی حیرت انگیز نہیں ہے، لیکن اس کو

قال لی ابو زرہ عۃ یا ابا علی تطرت

فی کتاب محمد بن اسماعیل هذا

اسماء الرجال فاذا فیہ خطا کثیر

فقلت لہ بلبثۃ اندرجل کل من کان

تقدما علیہ من العروق من اهل بخاری

نظیرا لمتبعہ فاذا سرائی اسماء لا یعرفہ

وہیں غلطیوں کا سبب، وہم لا یضبطون

ذکون کتبہ غیر متقوۃ فیضہ فی

اسماء خطا والافہارایب خواسانیافہم

منہ لولانی سانہ دنی ذلک الکتاب اسما

لا تعرف راہ یلین من روی عنہم وعن
ردادای شق را وافتعی بے انسان
فیہ،

کیا کیا جانے کہ اس کتاب میں بہت سے غیر معروف
نام ہیں اور ان کا صحیح تعارف نہیں کیونکہ یہ نہیں
بتایا گیا کہ کس سے اس نے روایت کی یا کس
نوگول سے اس سے روایت کی اور کیا روایت
کی ہے یہ صورت حال دیکھ قاری متحیر ہو جانا
ہے کہ راوی کی تعیین کیسے کرے۔

ابوزر نے کہا کہ خالد بن احمد ابوالہشمان
سے کہا کہ یہ اس کتاب پر ایک نظر ڈالو اور
جو غلطیاں ہیں اس کو درست کر دو تو میں
نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور جب اس
جہاں ضرورت محسوس ہوئی ترمیم کر دی
اور غلطیوں کی تصحیح کر دی میں نے خود
بخاری کو بغداد میں دیکھا کہ وہ اپنی کتاب
سنارہے تھے اور کہا ابراہیم بن شعیب
روی عنہ ابن وہب تو میں نے ان
سے کہا کہ وہ ابراہیم بن شعیب نہیں
ابراہیم بن سعید ہے۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ دوسروں
کی کتاب دیکھتے ہیں ان میں جو نام نیاملتا
ہے تو اس کو آپ لے لیتے ہیں حالانکہ ان کی
کتاب میں وہ نام غلط لکھا ہوا ہوتا ہے اس

قال، ما لنی خالد بن احمد ابوالہشمان
انظر لہ، شیئاً فی ہذا الکتاب فاصح لہ
فقطرت فغیرت اشیاء اخطأ فیہ وبحث
درایت محمد بن اسماعیل ببغداد یقرأ
علیہم ہذا الکتاب فقال، و ابراہیم بن
شعیب روی عنہ ابن وہب فقلت لہ
اسماہ و ابراہیم بن شعیث ثم قلت لہ
انت تخطو فی کتب الناس فاذا مر بک
اسم لا تعرفہ اخذتہ والخطایہ من
غیرہ لا تعرفہ کما لا یضبطون لہ

مجموعات و امتیازات و فضل و کمال
 بارے اسلاف میں ہمارو محدثین کی
 قوت و افتخار کے بیرونہاگ و امتیازات
 تاریخ میں محفوظ ہیں، یہ افسانوی داستانیں نہیں بلکہ ان حضرات کو امتحان و آزمائش
 کے دریا سے بڑی گزرتا پڑا ہے اور جب یہ واقعہ قابل ذکر شدہ دلت بن کر ہو
 تو تاریخ نے ان بیرونہاگ قوت و فضل کے مالک، افراد کو اپنے اوراق میں ثبت کر دیا۔
 حضرت دوام بخش دیا مام ابو زرعمہؓ، شریف و فضیلتی، خود را کا اپنا
 بیان ہے :

ان فی بیتہ آتیتہ عندی یہ سنتہ
 و احادیثہ منہ کتبتہ وانی اعلمہ
 فی ای کتاب ہو فی ای ورقہ ہو
 فی ای صفحہ ہو فی ای سطر ہو
 میرے گھر میں، وہ تمام منقولے یہ جو میں نے
 پچاس سال سے لکھے ہیں میں نے پھر ان کو
 دیکھا نہیں، لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ فلاں
 حدیث فلاں کتاب فلاں ورق فلاں صفحہ اور
 فلاں سطر میں ہے۔

مشہور محدث ابوبکر ابن شیبہ کا قول ہے :

ما را ایت احدا حفظ من ابی ذرعمہ
 الرازیؒ
 میں نے ابو زرعمہ رازی سے زیادہ قوت
 حفظ کا مالک کسی کو نہیں دیکھا۔

دوسرے مشہور فقیہ و محدث اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے :

کل حدیث لا یعرفہ ابو زرعمہ فلیس
 ل اصل تہ
 ابو زرعمہ جس حدیث کو نہ جانیں تو سمجھ لو کہ
 اس کی کوئی اصل نہیں

۱۔ تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) ج ۱۰ ص ۳۳۲ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۳۔

۲۔ ایضاً ج ۱۰ ص ۳۳۱۔

۳۔ ایضاً ج ۷ ص ۳۳۲۔

امام احمد بن حنبل جو ابو زرہ کے شیخ ہیں ان کا بیان ہے :

هذا الفتى البني ابا نادرة قد حفظ ابو زرہ کو چھ لاکھ حدیثیں یاد ہیں۔

ستائے الف یہ

ابو بکر محمد بن عمر الطرازی الحافظ فرماتے ہیں :

لم يكن في هذه الامة احفظ من

ابی زرہ کان يحفظ سبعائے الف حدیث

وكان يحفظ مائے دواربعین الفاتی

التفسير والقراءات یہ

اس امت میں ابو زرہ سے زیادہ قوت حدیث

کا کوئی مالک نہیں۔ سات لاکھ حدیثیں ان کے

یاد میں، ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں تو

صرف تفسیر اور قراءتوں سے متعلق ہیں۔

ابو زرہ کے علم و فضل کی شہادت کے لئے صرف ایک واقعہ کافی ہے، اس کے

راوی نیسا پور کے محدث حافظ حدیث حضرت کمی بن عبدان ہیں۔ ان کا بیان ہے :

میں نے امام مسلم سے سنا، وہ کہتے تھے کہ

میں نے صحیح مسلم کو ابو زرہ مازنی کے سامنے

پیش کیا، جس حدیث میں انھوں نے غلط

بتائی میں نے اس کو قلم زد کر دیا اور جس کے

بارے میں کہا کہ صحیح ہے اور اس میں کوئی

غلط نہیں تو میں نے اس کو اپنی جگہ باقی

رکھا۔

سمعت مسلماً يقول عرضت کتابی

هذا علی ابی زرہ الرازی فكل

ما اشاران له عليه تركته وكل

ما قال انه صحيح وليس له عليه

خرجه یہ

۱۔ تاریخ بغداد جلد ۱۰ ص ۳۲۲۔

۲۔ تہذیب الکمال ص ۳۳۲۔

۳۔ مقدمة الجرح والتعديل ص ۳۳۲۔

مشاہیر اہل علم اور جلیل القدر محدثین کی مجلسوں میں ابو زرعه کا کیا مقام و مرتبہ تھا اس کی وضاحت کے لئے حضرت امام احمد بن حنبل کا واقعہ کافی ہے۔ امام صاحب کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ حضرت ابو زرعه جب بغداد آتے تھے تو ہمارے یہاں قیام کرتے تھے اور جب تک وہ قیام کرتے والد صاحب (امام احمد بن حنبل) معمول کے مطابق جو نوافل پڑھا کرتے تھے ان کے آنے کی وجہ سے ترک کر دیتے تھے اور ان اوقات میں ان سے مذاکرہ حدیث میں مصروف رہتے تھے یعنی ابو زرعه سے مذاکرہ کو نفل نمازوں پر ترجیح دیتے تھے، ابو زرعه کے شیخ اور استاد ہوتے ہوئے بھی امام احمد کو جن حدیثوں کی صحت میں توقف تھا ابو زرعه سے استصواب کے بعد ان کی صحت کو تسلیم کیا اور ان کا تردد دور ہوا۔

امام بخاری سے بامشاذہ گفتگو کر کے ان کی کتاب "التاریخ الکبیر" میں جو غلطیاں دخل پا گئی تھیں۔ ان کی نشان دہی کی اور امام بخاری نے اس کو تسلیم کر کے ابو زرعه کے کمال علم و فضل کا اعتراف کیا۔

ابو زرعه کا مسلک فقہی مسلک کے لحاظ سے شہرے میں امام اعظم ابو حنیفہ کا مسلک رائج تھا، امام ابو زرعه الرازی بھی اپنے شہر کے اہل علم کے طریقے کے مطابق حنفی مسلک تھے، ابو زرعه کا بیان ہے :

کان اهل الری قد اقتصوا بابی حنیفۃ
وکننا احد اثنا۔۔۔ تمام اہل رے حنفی مسلک تھے یہ ہماری
نوجوانی کا زمانہ تھا۔

انھوں نے امام بوحنینہ کی کتبوں کو بڑے اہتمام سے یاد بھی کر لیا تھا اور یہ کتبیں ان کے نوک زبان تھیں۔ پھر سر میں انھوں نے امام شافعی کی کتبوں کی نقل حاصل کی، طلب حدیث کے سلسلے میں، امام احمد بن حنبل سے سہ سہ درجہ کی استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، اس طرح تین فقہی مسلک ان کی نگاہوں کے سامنے پوری تفصیل سے چلے گئے، لیکن ان کی کتابوں سے کسی خاص مسلک کی ترجیح واضح طور پر نہیں ملتی، جن لوگوں نے ان کو حنبلی ارأے ثابت کرنے کی کوششیں کی ہیں وہ صرف تیاسات پر مبنی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ابو زرعہ اور ان کے معاصرین امام بخاری امام مسلم وغیرہ فقہاء حدیث تھے، علم حدیث سے کثرت شغف کی بنا پر وہ سنت نبوی کے مزاج وال ہو چکے تھے۔ ان کے سامنے روایات و احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ ان کا اخاذ نہیں و دماغ خود سال کا استنباط کر لیت تھا اور اس کو درجہ اجتہاد حاصل تھا، ایسے تمام محدثین کی خاص فقہی مسلک کے پابند نہیں تھے بلکہ تینیت بختہ انھوں نے جس مسئلہ کو ترجیح دی وہی ان کا مسلک سمجھا ان کا کلمہ اربعہ میں سے کسی خاص فقہی مسلک کے گروہ میں شامل کرنا صحیح نہیں ہے۔

ان کے زہد و تقویٰ کے بارے میں اہل کے دوست اور شریک درس اور ہم وطن مشہور محدث امام ابو حاتم رازی بیان فرماتے ہیں:

ازھد من رأیت رجلاً دہم ہوت ہر سے چار افراد کو سب سے زیادہ زہد پایا آدمی ابی اباس و ثابت بن محمد وبراہد بن ابی یاس، ثابت بن محمد زہد اور ابو زرعہ و ابو زرعہ و احمد بن حنبل۔ اور امام احمد بن حنبل۔

وفات

حضرت ابو زرہ کی پوری زندگی تحسینِ علم حدیث اور اس کی خدمت میں صرف ہوئی کئی لاکھ حدیثیں اپنے ہاتھ سے نقل کیں، راویوں کے حالات کی جستجو کر کے ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کی اور اپنے علم و فضل کی یادگار دو درجن تصانیف

چھوڑیں اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے سلسلہ میں اپنی راویوں کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا جو تحقیق و تنقید کی راہ پر چلنے والوں کے لئے منارہ نور ہیں۔ قابلِ رشک اور پاکیزہ زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے کہ وقت موعود گیار زبان پر دگر الہی جاری تھا۔ ابو حاتم رازی کا بیان ہے کہ آخری وقت ان کی زبان پر تھا: **اللہم ای شتہا فی رویدہ فان قال لی یٰ علی اشتقت الی**۔ وقت بوجہتِ یارب علم حدیث کے ذوق، شوق اور سنت نبویہ سے وابستہ شیفگی و وارفتگی کا یہ نتیجہ تھا کہ نزع کے عالم میں بھی انھوں نے ایک حدیث ہی بیان کی، واقعہ یہ ہوا کہ آخری وقت میں علماء و محدثین موجود تھے لیکن لقنوا موتا کمالا الا اللہ کے بموجب فرقہ ادب کی وجہ سے متفقین نہیں کر رہے تھے تو محدثین نے آپس میں کہا کہ آؤ ہم لوگ حدیث کا مذاکرہ کریں لیکن اس میں بھی وہ ناکام رہے کیونکہ کوئی محدث سند سے آگے کچھ نہیں کہہ پاتا تھا، تب ابو زرعہ نے فرمایا **حدثنا ابن عبد الصم حدثنا عبد الحمید بن جعفر**۔ **لح من الی ابوب عن کثیر بن مرۃ الحضرمی عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان اخر کلامہ لا اللہ الا اللہ دخل الجنة**۔

حدیث تمام ہوئی اور ان کی روح عالمِ قدس کو پرواز کر گئی، انا اللہ وانا الیہ راجعون یہ روشنیہ کا دن تھا اور ذی الحجہ ۲۶۲ھ کی کوئی تاریخ، رحمہ اللہ۔

(ختم)

عربی ادب میں ہندوستانی فضا

مولوی سید محمد عنیاء الدین شمس طہرانی لکچرار شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں ادب کا تصور اس قدر وسیع ہے کہ اس کا تعین مشکل ہے۔ تاریخ ادب عربی کے مصنف استاذ احمد حسن زیات کے نزدیک بھی ادب کا اطلاق شعرو سخن کے علاوہ ان تمام تصانیف پر ہوتا ہے جو کسی علمی یا ادبی شعبے میں تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ عربی زبان کا ادب دنیا کی تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مالا مال ہے کیونکہ اسلام پھیلنے کے بعد عربی زبان صرف ایک ہی قوم کی زبان نہ رہی بلکہ ان تمام اقوام عالم کی زبان بھی بن گئی جو وقتاً فوقتاً اسلام کی دعوت قبول کرتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان نے یونانیوں، ایرانیوں، یہودیوں، ہندیوں اور جمشیوں کے قدیم علوم و فنون اور لطیف روایات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ عربوں کے ادب پر ہندوستان کا کس قدر اثر ہوا تھا اس کا ابھی تک کوئی معقول جائزہ نہیں لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے اپنی سہل انگاری کی بنا پر یہ رائے قائم کر لی کہ عربوں کے ادب پر علم ادب، علم نجوم اور علم طب میں یونانیوں کے علوم کی بہ نسبت ہندی علوم کا بہت کم اثر ہوا (تاریخ ادب عربی از ڈاکٹر نکلسن) اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو ہندوستانی علوم کا اثر عربوں کے ادب پر یونانی علوم سے

کسی طرح کم نہیں۔ عربی ادب میں ہندوستانی فضا کی نشاندہی کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ سرِ دست اس موضوع کے مختلف اور بے حساب گوشوں میں سے صرف ایک گوشے پر مختصر طور پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات کا سلسلہ ماقبل تاریخ کے عہد سے ملتا ہے۔ مصر اور عرب میں پائی جانے والی بہت سی اشیاء اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان ممالک میں تجارت کا سلسلہ تین ہزار سال قبل مسیح سے قائم تھا۔ ہندوستانی جہاز جو معولی بادبانوں اور بے شمار ملاحوں کے ذریعہ چلتے تھے ہندوستانی مال مثلاً گرم مسالے موٹی روئی، ریشم، لعل اور جواہرات وغیرہ لے کر عرب اور عراق جاتے تھے۔ وادی سندھ یعنی موہنجو دارو کے لوگ عربوں سے قریبی تعلقات رکھتے تھے۔

عرب تاجروں کا بھی ہندوستان میں آنا جانا تاریخی حقیقت ہے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ایک عرب ملاح ہی نے واسکو ڈی گاما کو ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے میں مدد دی تھی اور احمد بن ماجہ بھی عرب ملاح ہی تھا جس نے ۱۴۹۸ء میں مالندی (مشرقی افریقہ) سے کالی کٹ تک پہنچنے میں واسکو ڈی گاما کی رہنمائی کی تھی۔

یہ تجارتی تعلقات ہی کا نتیجہ تھا کہ عرب میں قدیم زمانے سے ہندوستان کی بہت سی چیزیں کثرت سے استعمال ہوتی تھیں اور عربوں کی زندگی میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ عرب شعراء کے کلام سے بھی ہوتا ہے جنہوں نے اشعار میں ہندوستان کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اس ذکر سے عربی ادب میں ہندوستانی فضا کا تصور ابھر نے لگتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :

ہندی تلوار

قدیم زمانے سے ہندوستان کی تلواریں عربوں کی بہادری میں چارچاند لگاتی

ہیں۔ عربی میں ہندی تلوار کے کئی نام ہیں: صیف، ہند، ہندی، مہند، ہندوانی، سندوانی اور قلعی۔ شریف اور سی نے نزہۃ المشتاق میں لکھا ہے کہ جنوبی ہند کے بلاد سفال اور بلاد زنج میں لوہے کی کانیں ہیں مگر یہاں کے باشندے کچانوں فروخت کرتے ہیں اور ہندوستان کے لوگ اس کی تلواریں بناتے ہیں۔“
(نزہۃ المشتاق ص ۲ مطبوعہ علی گڑھ) عربی شاعری میں ہندی تلوار کا ذکر اس کثرت سے آیا ہے جس کثرت سے خود ہندی تلوار استعمال ہوتی تھی۔ زہیر بن ابی سلمیٰ نے کہا ہے

كالهند وانی لا یخزیک مشہد
وسط السیوف اذا ما تضرب الہم

یعنی دوسری تلواروں کے درمیان میں ہندی تلوار تم کو میدان جنگ میں ناکام نہیں کر سکتی ہے جبکہ اسلحہ بندشکر میں جنگ ہو۔

ہندی نیزے

ہندی تلواروں کی طرح عرب میں ہندی نیزے بھی بہت مشہور تھے جو عام طور سے عمان سے بحرین تک کے علاقے میں تیار کیے جاتے تھے جسے خدا کہتے تھے۔ اس کے لئے سندھ، گجرات اور بھروچ سے بالنس اور بید آتے تھے پھر ان کو یہاں نیزے کی شکل دی جاتی تھی۔ خطی اور سمہری نیزے ہندوستان لکڑی کے ہی بنتے تھے، ابن منظور و مشقی نے لسان العرب میں لکھا ہے:

وقد کثر مجیئہا فی اشعارہا

یعنی اشعار عرب میں اس کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے۔ ابو زبید طائی نے کہا ہے

مُسْنَقَاتُ کَاخْنِ قَنَا الہند
لطول الرجیف جَدَب المروء

یعنی چارہ ڈھونڈھنے والے کے دیر کرنے کی وجہ اوستیاں اس طرح
جکڑی ہوئی تھیں جیسے ہندوستان کے بانس باندھے ہوئے ہیں۔

مشک

یہ ہندوستان کی مشہور خوشبو ہے جو یہاں سے عرب جاتی تھی۔ امر نقیب
کہتا ہے کہ

إِذَا قَامَتَا تَضَوُّعًا لِمِسْكٍ مِنْهَا

نَسِيمَ الصَّبَا جَاءَتْ بِرِيَا الْقُرْنَفَلِ

یعنی جب وہ دونوں کھڑی ہوتی ہیں تو ان سے مشک کی خوشبو اس طرح
پھیلتی ہے جیسے نسیم صبح بونگ کی خوشبو لے کر آئی ہے۔

یہاں ترنفل بھی کرن پھول کا معرب ہے اس کا ذکر بھی عربی ادبیات میں کثرت
سے آیا ہے۔

عود

عود (اگر) ہندوستان کی مشہور لکڑی اور عربوں کی مرغوب ترین خوشبو ہے۔
اس کو عود ہندی، عود صنفی، عود قناری، عود ہندی اور عود کلبی کے مختلف ناموں
سے یاد کرتے ہیں۔ نابغہ شیبانی کہتا ہے کہ

قَدْ عَبِقَ الْعَبْدُ بِهَا وَمِسْكٌ

مِخَالِطٌ مِنَ الْمَهْنَدِي عود

یعنی اس کے جسم پر زعفرانی خوشبو اور عود ہندی میں مخلوط مشک لپٹا ہوا ہے۔

کا فور

یہ ہندی لفظ کپور کا معرب ہے۔ اس کا استعمال عربی زبان میں کئی طرح سے
ہوا ہے۔ یوں تو کا فور عرب کے ہر بڑے بازار میں فروخت ہوتا تھا لیکن

دارین جس طرح مُشک کی بہت بڑی منڈی تھی اسی طرح کافور کا بازار بھی تھا۔
 نابغہ شیبانی کہتا ہے کہ

كَانَ رُضَابُ الْمِسْكِ فَوْقَ ثَائِقِهَا
 د کافور داری و راحا تصفقی

یعنی محبوبہ کے مسوڑھوں کے اوپر دارین کا کافور اور شراب دونوں
 چل رہی ہیں۔

زنجبیل

یہ ہندی لفظ جنجا بیر کا معرب ہے جس کے معنی سونٹھ کے ہیں۔ عرب کے لوگ
 اسے خشک اور نر دونوں طرح استعمال کرتے تھے اور یہ ان میں بہت ہی مشہور
 تھی۔ لسان العرب میں لکھا ہے کہ عرب سونٹھ کی خوشبو کی تعریف کرتے ہیں اور وہ
 ان کو بہت ہی مرغوب ہے (والعرب تصف الزنجبیل بالطیب وهو مستطاب
 عندہم جداً)۔ اعشی نے کہا ہے کہ

كَأَنَّ الْقِرْنَ فِلسَ وَالزَّجْبِيلَ
 باتا بیہا داریاً مشوراً

یعنی محبوبہ کے لعابِ دہن کی لطافت و نکہت کا حال یہ ہے کہ جیسے اس کے
 مُنہ کے اندر شہد کے ساتھ لونگ اور سونٹھ نے مُشک داری میں
 رات گزاری ہے۔

ایک اور شاعر نے بھی کہا ہے :

وَمَا زَجْبِيلٌ عَاتِقٌ مُطِيبٌ

یعنی سونٹھ ملی ہوئی پُرانی خوشگوار تراب۔

عجب اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں بھی جنف کی تعریف میں اس

جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں کا ذکر ضرور ہے یعنی مسک، زنجبیل اور کا فور۔

(باقی آئندہ)

اکابر دیوبند کارناموں کی مستند تاریخ

پندرہ روزہ دیوبند ٹائمز کے ”مولانا محمد عثمان نمبر“ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے غیر مطبوعہ مکاتیب، ہندوستان کے پچاس سے زائد نامور اہل قلم کی تحریریں، دیوبند اور اکابر دیوبند کی سو سالہ علمی، سیاسی، تاریخی قومی خدمات اور مذہبی تحریکات کا دل آویز مرقع، نواسہ شیخ الہند، مجاہد آزادی حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی مشعل راہ شخصیت کا عکس تقریباً تین سو صفحات کے اس عظیم الشان نمبر میں مطالعہ کیجئے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جسے صرف مبلغ 25/- روپیہ میں ہدیہ قارئین کیا جائے گا۔ ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

اس خصوصی نمبر کے ساتھ دیوبند ٹائمز کی سالانہ خریداری مبلغ 20/- روپیہ قبول کرنے والوں کے لئے رعایتی قیمت صرف 20/- روپیہ کل 40/- روپیہ ہوگا۔ صرف ڈاک بذمہ ادارہ

پتہ: منیجر دیوبند ٹائمز دیوبند ۲۴۷۵۵۴ (نیو پٹی)

ملا صدرا کا رسالہ ”وحدة الوجود“ (ایک تعارف)

جناب غلام یحییٰ انجم صاحب، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

صاحب اعیان الشیعہ کے قول کے مطابق جن چار غریبی شخصیتوں کو علوم و فنون کا ہمالہ بطور خاص فلسفہ و کلام کا ستون سمجھا جاتا ہے ان میں معلم ثانی ابو نصر فارابی (متوفی ۳۲۰ھ تقریباً) شیخ رئیس ابن سینا (۳۷۲-۴۲۷ھ) خواجہ نصیر الدین طوسی (۵۹۷-۶۷۳ھ) کے بعد چوتھے ملا صدرا محمد بن ابراہیم صدر الدین خیرازی ہیں۔ اس پر استدلال یہ کہ اگر غلو کا خوف نہ ہوتا تو یقیناً کہہ دیا جاتا کہ علمی اعتبار سے ملا صدرا کی حیثیت مذکورۃ الصدر حضرات سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے خاص کر مکاشفہ اور عرفان و وجدان کے معاملہ میں ان کا کوئی ہمسر نہیں چنانچہ ان کی عبقریت کے اعتراف میں قوم نے انہیں ”صدر المتألهین“ اور ”صدر المحققین“ کا خطاب دیا ہے۔

اس جلیل القدر شخصیت کی سن ولادت تقریباً ۴۸۰ھ ہے کیونکہ انھوں نے ۱۰۵۰ھ میں ساتویں بار حج سے واپسی میں ستر سال کی عمر پا کر وفات پائی۔
 علمی نشوونما کے متعلق اتنا طے ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار ابراہیم بن یحییٰ الشیرازی القوامی سے حاس کی جس کی تکمیل اصفہان جاکرانِ دونالغہ روزگار شخصیتوں سے کی رجن کا سکھ معقولات کی دنیا میں اب بھی رائج ہے۔ یعنی شیخ بہار الدین محمد العاطل (۹۵۳ھ - ۱۰۳۱ھ) اور میر باقر داماد (متوفی ۱۰۲۰ھ) ہیں جو نظریہ حدوث و ہر کے بانی ہیں اور جن کی شان میں اختلاف کرنے کے باوجود ملا محمود (متوفی ۱۰۶۲ھ) جیسے فلسفی اعظم ہندوستان شمس بازغہ میں فرماتے ہیں:

”خیرۃ اللہ الیقین بالمہرۃ اللہ یقین مع توغلہ فی
 سیاحتہ ۲۱ من الحقیقۃ وتوطا طہ سیاحتہ
 یم الحکمۃ ووجوۃ فی اعماق شری الملک
 باقدام انظاراۃ الغائرۃ و عروجہ عن
 اطباق سماع الملکوت بقوادیم افکارہ السافرة“

انہی مؤخر الذکر استاد کی صحبت میں ملا صدرا نے عمر کا بیشتر حصہ گزارا اور انھیں کی روش پر چل کر اہل علم و فضل میں اس طرح شہرتِ دوام حاصل کی کہ آپ کے بارے میں کہا جانے لگا:

انہ اجل فلاسفة العصر الاموی شاناداعظمہم
 خطراحتی نقد یلغ من دقة المبحث و عمق

لفکیر و طرافۃ التحقیق مبلغانی منزلۃ تالی

یعد منزلۃ کل من ارسطو و ابن سینا ؑ

خس ذر وہ نفس و کمال پر موصوف فائز تھے متاخرین میں سے کسی کی ان تک

رسائی ممکن نہ ہو سکی اور متقدمین میں سے کم ہی اس مرتبہ سے بہرہ ور ہوئے
ہیں۔ صاحب روضات لکھتے ہیں :

کان فائقاً علی سائر من تقدم من الحكماء

البازخین و العلماء الراسخین الی نہ من مولانا

الخواجه نصیر الدین منقحاً اساس الا شراق

ہمالہ مزید علیہ و مفتحا ابواب الفنیحة

علی طریقۃ المشاء الرواق ؑ

اسی قول کی روشنی میں فلاسفہ متقدمین و متاخرین دونوں کے درمیان ان کی

شخصیت روز روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے۔

اس عبقری روزگار نے اپنے وقت عزیز کا بیشتر حصہ درس و افتادہ کے علاوہ

کتب و رسائل کی تصنیف میں بھی صرف کیا جن کی تعداد بعض سوانح نگاروں کے

قول کے مطابق ۳۳ بتائی جاتی ہے ان میں شرح ہدایت الحکمة صدرائے کرام کے نام

سے مدارس عربیہ کے منتہی طلبہ کے نصاب میں مشمول ہے۔ دوسری کتاب

”اسفار اربعہ“ ہے جو شیخ کی ”شفار“ محقق طوسی کی ”تجربہ“ امام رازی کی ”محفل“

میر باقر و امام کے ”افق البین“ کے دوش بدوش فلسفہ کی منتخب ادبیات عالیہ میں

شمار ہوتی ہے چنانچہ اس کتاب کی عظمت کے بارے میں محقق شیخ محمد حسین الاصفہانی (متوفی ۱۳۶۱ھ) فرماتے ہیں :

”لو اسلم احد الفہم اسرار کتاب الاسفار لشددت
الیہ الرحاں للتلذ علیہ وان کان فی
اقصى الدیار“ ۱

تیسری اہم تصنیف شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول (۵۵۰-۵۸۶ھ) کی
”حکمت الاشراق“ جو علامہ قطب الدین شیرازی (۶۳۴-۷۱۰ھ) نے شرح لکھی تھی
اس کا حاشیہ ہے جو حکمت اشراق کے موضوع پر حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔
مذہب و تصوف جس کا خاص ادراہم موضوع ”وحدت الوجود“ ہے ملاحظہ رائے
اسی کی تعلیم دی ہے اور اسی موضوع کے تحت متعدد رسالے لکھے ہیں۔ انہی میں سے
ایک رسالہ ”وحدت الوجود“ جو خوش قسمتی سے مولانا آزاد لائبریری کے یونیورسٹی کالکشن
میں فارسیہ و مذہب و تصوف ۲۴۹ نمبر کے تحت محمد حسن عباسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا
محفوظ ہے جس پر سن کتابت ۱۲۱۸ھ مندرج ہے۔ رسالہ زیادہ طویل و ضخیم نہیں
ہے مگر اس ایجاز و اختصار میں مآقل ذاتی کی شان پیدا ہے۔ ذیل میں مطالب
مبحث کا خلاصہ دیا جا رہا ہے جس سے اس کی اہمیت ہویدا ہوگی۔ رسالہ کی ابتدا
اس حقیقت حقیقہ سے ہوتی ہے جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور
تمام علمی و حکمی سرگرمیوں کی غایت الغایات ہے یعنی صانع عالم کے وجود پر یقین
جسے زبان شرع میں ایمان باللہ کہتے ہیں۔ مصنف رسالہ فرماتے
ہیں :

”بدان و فہمك اللہ تعالیٰ كہ جمیع عقلاً اتفاق دانند براین كرام
موجودہ مبالغی ثابت و متحقق است۔“

پھر نظری وحدت الوجود كے اثبات میں مصنف نے عقلی و برہانی دلائل بھی
دیے ہیں اور اس عقیدہ كو حق بجانب ثابت كرنے كے لئے قرآنی شواہد سے
بھی استشہاد كیا ہے لیكن اس باب میں زیادہ اہم اول الذكر ہے یعنی نظریہ
وحدۃ الوجود كا عقلی و برہانی دلائل سے اثبات۔ مصنف نے توطیہ مقصد كے لئے
اس سے پہلے ایک خاص طویل تمہیدی مے جس كے دو جز ہیں۔ پہلا جز تین افادہ
پر مشتمل ہے۔

(۱) افادہ اول كا كہنا ہے كہ ایمان باللہ ایک كائناتی حقیقت ہے جس پر جملہ عقلاً
روزگار كا اتفاق ہے اور یہ عقیدہ ان كے قلوب میں اس درجہ راسخ ہے كہ
براهت كی حد تك پہنچ گیا ہے یعنی استاہی بدہی (A. PRIORI) ہے
جیسی یہ حقیقت كہ كن اپنے جڑ سے بڑا ہوتا ہے۔

(۲) افادہ دوم كا كہنا ہے كہ اس عقیدہ كی ہم گیری كے باوجود باری تعالیٰ كی كزو
حقیقت ہنوز پردہ خفا میں ہے اور

راہ ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

(۳) افادہ سوم ایک تاریخی توجہ ہے جو مفكرین عہد اسلام كی جماعت ہندی سے
متعلق ہے اس كی رو سے جموں معرفت باری كے دو طریقے ہیں استدلال
یا كشف و شہود۔ پھر طالب معرفت یا كسی بنی كا پر و ہوگا یا انبیاء مرسلین
كی اقتباع سے بے نیاز ہوگا اس كے نتیجے میں مفكرین كی چار جماعتیں
ظہور میں آئیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم كے پر و جو استدلال سے كام لیتے تھے

متکلیف کہلائے۔

۲۔ لیکن اثباتِ اصول کے باوجود جو حضرات ریاضت و مجاہدہ اور کشف و شہود پر اعتماد کرتے تھے، انہیں کرام کہلائے۔

۳۔ اتباعِ رسول سے بے نیاز ہو کر جن لوگوں نے نظر و استدلال سے کام لیا وہ حکماء مشائین کہلائے۔

۴۔ اور اگر مؤخر الذکر نے مجاہدہ و پرہیزگاری سے کام لیا وہ حکماء اشراقین کہلائے۔

ظاہر ہے یہ وہی تقسیم ہے جو حاجی خلیفہ (۱۰۶۷ھ) نے کشف الظنون میں حکمتہ الاشراق کے تحت دی ہے اس لئے یا تو مصنف اس کے لئے حاجی خلیفہ کی خوشہ چینی کی ہے یا حاجی خلیفہ نے مصنف سے استفادہ کیا۔ بھر دو توں کسی تیسرے مشترک ماخذ کے رہیں منت ہیں۔

دوسرے جز کے افادات میں مرکزی حیثیت ”وجود مطلق“ کے تصور نمین کی ہے کیونکہ نظریہ وحدت الوجود کا سنگ بنیاد یہی تصور ہے۔ وجود مطلق کے تصور کا تخزما یہ کیا ہے اور کس طرح اس نے ارتقار کی منازل طے کئے اور پھر کس طرح یہ اسلامی فکر میں داخل ہوا بالخصوص اندلس کی فکری سرگرمیوں میں جن کے گرامی منزلت نمائندے شیخ اکبر تھے جو اسلامی فکر میں اس عقیدے کے بادی یا علی الاقل مثل اعظم سمجھے جاتے ہیں۔ ان امور کی تفصیل ایک تفصیلی جائزے کی تقاضی ہے مگر چونکہ اس عاجز کی عرضداشت کا مقصد صرف اس رسالہ کا تعارف کرنا ہے اس لئے دوسری تفصیلات سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

بہر حال مصنف نے اس پوری بحث کا آغاز ”وجود“ کے مختلف مفہام و مصادیق کے ذکر سے کیا ہے انہوں نے وجود کے صرف دو مصادیق بتائے ہیں :

۱۔ معنی مصدری جس کا مفہوم ”بودن“ یا ”شدن“ ہے یعنی ہونا۔

۲۔ دوسرا مفہوم وہ امر ہے جس کی بنا پر کوئی موجود موجود ہوتا ہے۔

اس معنی کا وجود واجب کا بھی ہوتا ہے اور ممکن کا بھی۔ لیکن واجب تعالیٰ میں یہ وجود عین ذات باری ہوتا ہے مگر ممکن میں اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس طرح حسب تصریح شرح مواقف (الموقف الثانی المرصد الاول بمقصد ثالث) اس باب میں تین مذاہب ہیں، امام ابو الحسن الاشعری (۲۴۰ — ۳۳۰ھ) اور معتزلہ میں سے ابو الحسین البصری (توفی ۲۳۶ھ) کا کہنا ہے کہ وجود واجب اور ممکن دونوں میں ماہیت (یا ذات) کا عین ہوتا ہے مگر حکما رکھتے ہیں کہ واجب میں تو عین ماہیت ہوتا ہے مگر ممکن میں غیر ماہیت۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ واجب اور ممکن دونوں میں وجود و ماہیت ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہیں اور وجود ماہیت پر زائد ہوتا ہے مگر مصنف رسالہ نے ان مذاہب ثلاثہ میں سے صرف دو مذہبوں کو بیان کیا ہے۔

زاں بعد انھوں نے اسم اللہ کے معنی کو متعین کیا ہے کہ اللہ علم ہے ذات واجب الوجود کے لئے جو جمیع صفات عالیہ سے متصف اور تمام کمات نقص و حدود سے منزہ ہے۔

اس کے بعد اس ذات پاک کے باب میں جو اللہ کا معنی ہے تین مذاہب بیان کیے ہیں متکلمین کا، حکما کا، اور صوفیاء کرام کا۔ متکلمین کہتے ہیں کہ وہ ذات نمبر ۱ حقیقی جزئی ہے۔ نمبر ۲ فاسخ اور ذہن دونوں میں بسیط ہے اور نمبر ۳ اس کی صفات اس پر زائد ہیں (یہاں مصنف رسالہ وحدۃ الوجود نے جمہور علمائے کلام سے اختلاف کیا ہے کیونکہ جب کہ معتزلہ وغیرہ صفات کو غیر ذات مانتے ہیں اشاعرہ (اہلین ولا غیر) کہتے ہیں)

حکما رکابھی یہی مسلک ہے مگر وہ صفات کو عین ذات گردانتے ہیں لیکن
صوفیاء کرام کا مسلک جو تفصیل چاہتا ہے مصنف نے اس باب میں ان کے تین
فرق گردانتے ہیں اور اس تفریق کا منشاء واجب کے ساتھ ممکن کا اعتبار
ہے چنانچہ:

ایک فرق متکلمین و حکما کی طرح واجب تعالیٰ کو بھی جزئی حقیقی سمجھتا ہے اور
اس کے ساتھ جہور اہل شریعت کی طرح ممکن کو بھی حقیقی سمجھتا ہے نیز انہیں کی
طرح واجب اور ممکن کو ایک دوسرے کا مغائر و مبائن دوسرا فرق بھی واجب تعالیٰ
کو جزئی حقیقی سمجھتا ہے مگر ممکن کو موجود نفس الامری نہیں سمجھتا بلکہ سراب کی طرح
واہمہ محض گردانتا ہے یا بالفاظ دیگر:

ذات واجب نے صور متعددہ اور اشکال مختلفہ میں خود کو ظاہر کیا ہے پس
خارج ہو یا ذہن دونوں میں صرف وہی ذات موجود ہے۔ سب دوسرے موجودات
جنہیں عرف عام میں ممکنات کہا جاتا ہے سو وہ معدوم محض ہیں اور ان کی موجودیت
محض وہمی و خیالی ہے۔

لیکن اس تقدیر پر شریعت ہو یا قانون ملکی (PUBLIC LAW) دونوں
کے اور دنیاوی باطل قرار پاتے ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی موجود
نہیں تو پھر وہ کسے حکم دے رہا ہے کہ نماز پڑھ یا نیک کام کر اور کسے منع کر رہا
ہے کہ برے کام نہ کر اور کس کو قتل نہ کرے۔

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود

پھر یہ سہنگامہ اے خدا کیا ہے

اس لئے ایک تیسرا فرق کھڑا ہوا اس نے کلی و جزئی اور عینیت و غیریت کے
امتیاز ہی کو حتم کر دیا ان کے نزدیک واجب تعالیٰ شانہ جزئی حقیقی نہیں ہے

بلکہ وجود مطلق ہے لا بشرط شیئی یعنی اس میں کوئی قید و تقید نہیں ہے، رہے وہ موجودات جنہیں عرف عام میں ممکنات سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ دوسرے فریق صوفیاء کی طرح وہی و خیالی نہیں ہیں بلکہ وہ بھی واقع میں موجود ہیں مگر اسی واجب تعالیٰ کے اسی وجود (وجود مطلق) کے ساتھ۔

اسی طرح تمام موجودات (با عرف عام کے ممکنات) عین باری تعالیٰ ہیں اور اسی کے وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ وجود مطلق لا بشرط شیئی ہے۔

اس نئے مذہب کے اختراع کے ساتھ انھوں نے اس معاشرتی اشکال کو مندرج کر دیا جو دوسرے فریق کے یہاں ممکنات کو اوہام و خیالات سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے نیکی و بدی کا امتیاز ہی مٹ رہا تھا اور اباحت مطلقہ کی ترویج و اشاعت کا راستہ صاف ہو رہا تھا۔

اس لئے انھوں نے اس وجود مطلق لا بشرط شیئی کے ظہور کے لئے دو مرتبے اختراع کیے۔

۱۔ مرتبہ اطلاق جس میں وہ جملہ قیود و شرائط سے قالی اور متعالی ہے اس مرتبہ میں وہ وجود مطلق معبود ہے، اور

۲۔ مرتبہ تقیید جس میں وہ تعینات و تشخصات سے متصف ہوتا ہے یہاں وہ عابد و بندہ ہے اور معبود حقیقی کے جملہ ادا و نواہی کے بجا لانے کے لئے مکلف ہے اس طرح انبیاء و رسل کی بعثت و ارسال اور کتب مقدسہ الہیہ کے نزول و انزال کی ضرورت و افادیت بھی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔

وحدت الوجود یا PRINCIPLE کی اس توجیہ کی رو سے عابد و معبود اور آرمو نامور میں واجب تعالیٰ مرتبہ اطلاق میں وجود مطلق سے متصف ہے مگر ممکنات مرتبہ تقیید میں اس سے متصف ہیں۔

مصنف فرماتے ہیں کہ،

”مخفی نہ رہے کہ اس عینیت میں وجود کا شعور بڑے سخت مجاہدہ اور ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔“
 ”وایں عینیت مخفی می ماند و بعد مجاہدہ و ریاضت منکشف می شود۔“

اس کے بعد وہ وحدت شہود کی حقیقت بتاتے ہیں یہ ایک مخصوص کیفیت کا نام ہے جس کے نتیجے میں دل میں ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ اس نور کے بریق و لمعان میں عرش سے لے کر فرش تک جملہ ماسوائی باری تعالیٰ اس طرح چھپ جاتے ہیں جس طرح سورج کی روشنی میں دوسرے ستارے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ موجود ہوتے ہیں اسی طرح ماسوائے باری تعالیٰ جملہ ممکنات موجودہ حقیقتاً موجود ہیں مگر وحدت الوجود کی روش سے عارف کی نظر میں نابود محض ہو جاتے ہیں۔ اور اسے صرف ذات باری تعالیٰ شانہ ہی کا شعور باقی رہ جاتا ہے۔ یہ تمہید تھی جسے مصنف علام نے نظریہ وحدت الوجود کی عقلی توجیہ کے لئے قائم کیا تھا انہوں نے اس طول طویل تمہید کا خلاصہ آخر میں بدین طور دیا ہے

اللہ علم ہے ذات واجب الوجود کے لئے۔ اور اس ذات کے بارے میں اختلاف ہے۔

- ۱۔ حکماء و متکلمین کے نزدیک یہ ذات مستخرج الصفات جزئی حقیقی ہے اور جملہ موجودات حقیقہ موجود ہیں اور واجب تعالیٰ سے مبائن و مفار ہیں۔
 - ۲۔ صوفیاء کرام کے اس باب میں دو گروہ ہیں:
- (الف) ایک گروہ واجب تعالیٰ کو جزئی حقیقی قرار دیتا ہے اور موجودیت کو صرف اسی ذات واجب تعالیٰ میں منحصر گردانتا ہے رہے ممکنات تو وہ واجب محض

ہیں اور ان کا وجود اعتباری ہے۔

(ب) دوسرے گروہ کے نزدیک واجب الوجود کی حقیقت وجود مطلق ہے جو نہ عام ہے نہ خاص اور تمام شرائط و قیود سے منزہ و متعال ہے۔ رہے ممکنات (یا عالم خارجی) تو وہ بھی اسی وجود مطلق کے ساتھ موجود ہیں (مگر مرتبہ تقیید میں) اس طرح واجب و ممکن میں وجہ عین یکدیگر ہیں اور میں وجہ ایک دوسرے کے غیر مبائن۔

مصنف اس توجیہ کو اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ جامع شریعت و طریقت ہے اور سرِ موجودہ مستقیم سے متجاوز نہیں ہے۔

اس خلاصہ مقال کے بعد انھوں نے نفسِ مسئلہ یعنی نظریۂ وحدت الوجود کے اثبات کو لیا ہے مگر یہاں انھوں نے منطقی ثبوت کے بجائے تمثیل سے کام لیا ہے اور واجبِ تعالیٰ کو موجود مطلق ثابت کرنے کے لئے موجودات کے مراتب و وجود کی صف بندی (CLASSIFICATION) کی ہے اس کے لئے انھوں نے پہلے اشیاءِ منورہ کے اشراق و درخشانی کی صف بندی کی ہے کہ ان اشیاءِ منورہ کی نورانیت میں تین مرتبے ہیں:

مرتبہ اول: جبکہ درِ روشن چیز اسی نور سے منور ہو جو اپنے علاوہ کسی غیر سے حاصل کیا ہو جیسے وجود زمین کہ وہ اس نور سے روشن ہوتی ہے جسے وہ سورج سے حاصل کرتی ہے یہ حضوری کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مرتبہ میں منور سے نور کا انفکاک ذہنًا و خارجًا جائز و واقع ہے ہم یہ بھی تصور کی سکتے ہیں کہ زمین موجود ہو مگر اندھیری یعنی روشنی معدوم ہو اور واقعاً بھی ایسا ہوتا ہے رات کے وقت زمین موجود ہوتی ہے مگر اندھیری اور نور سے خالی۔

مرتبہ دوم : شے منورہ ایسے نور سے روشن ہو جو خود اس کی ذات کا مقتضی ہو، کسی غیر سے حاصل و مستفاد نہ ہو بایں ہمہ وہ شے عین نور نہیں ہوتی۔

اس کی مثال خود سورج ہے کہ اس کی روشنی خود اس کی ذات کا مقتضی ہے بایں ہمہ سورج اور شے ہے اور اس کی روشنی شے دیگر۔

اس طرح یہ نور آفتاب خارج میں آفتاب سے جدا اور منفک نہیں ہو سکتا مگر چونکہ نور آفتاب کا غیر ہے اس لئے ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن ہے یا بالفاظ دیگر ذہناً نور کا آفتاب سے انفکاک ممکن ہے اگرچہ خارج میں یہ جائز نہیں ہے۔

مرتبہ سوم : شے منورہ خود اپنے ہی نور سے روشن ہو اور اپنی نورانیت میں کسی اور چیز کی محتاج نہ ہو اس کی مثال خود نور کی ذات ہے کہ اپنی ذات ہی کی بنیاد پر منور ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں ظاہر و عیاں ہے اور اپنے ظہور کے لئے کسی دوسرے نور کا جو اس کے کسی غیر سے حاصل ہو محتاج نہیں ہے۔

اس نور کا انفکاک خود سے نہ خارجاً جائز و ممکن ہے اور نہ ذہناً کیونکہ وہ اپنی ذات سے منفک نہیں ہو سکتی۔

ان مراتب سے گانہ کا ایک مرتبہ پھر گوشوارہ دیتے ہیں۔

مرتبہ اول میں وہ روشن چیز منورہ بالغیر ہوتی ہے جیسا کہ زمین جو سورج کے نور سے منور ہے۔ یہاں تین چیزیں ہیں زمین، روشنی اور آفتاب اور تینوں باہم متغائر ہیں۔

مرتبہ دوم میں وہ روشن چیز منورہ بالذات ہوتی ہے مگر جس نور سے وہ منور ہوتی ہے وہ خود جیسا کہ آفتاب منورہ بالذات ہوتا ہے مگر وہ نور غیر سے حاصل ہوتا ہے یعنی نور سے اس مرتبہ میں دو چیزیں ہوتی ہیں آفتاب اور نور جو دونوں باہم متغائر و

مباین ہیں۔

مرتبہ سوم میں وہ روشن چیز نور بالذات ہوتی ہے مگر جس کے نور سے وہ منور ہوتی ہے وہ خود اس کی ذات میں ملتی ہے جیسے خود نور کہ روشن ہے اپنی ہی ذات سے۔ اس مرتبہ میں وہ صرف ایک ہی چیز ہوتی ہے یعنی نور۔

یہ مرتبہ افضل ترین مرتبہ نورانیت ہے۔

اس تخیل کی بنیاد پر مصنف نے موجودات کی صف بندی کی ہے۔

مرتبہ اول میں موجود اس وجود سے متصف ہوتا ہے جو اسے وجود سے نسل ہوتا ہے اس مرتبہ میں تین چیزیں ہیں موجود، وجود، اور موجود۔ اسی مرتبہ میں موجود، اپنے وجود سے خارجاً نیز ذہناً منفک اور جدا ہو سکتا ہے۔

مرتبہ اوسط میں موجود اس وجود سے متصف ہوتا ہے جو اس کی ذات کا مقتضی ہوتا ہے جس طرح متکلمین کے نزدیک واجب تعالیٰ جو بذات خود مقتضی وجود ہے۔ اس مرتبہ میں صرف دو چیزیں ہوتی ہیں موجود مقتضی اور وجود جو اس موجود حقیقی (واجب الوجود) کا مقتضی ہے ان دونوں میں خارجاً انفکاک ناممکن ہے اگرچہ ذہناً ممکن ہے۔

مرتبہ اعلیٰ میں موجود اس وجود سے متصف ہوتا ہے جو خود ذات موجود کا عین ہوتا ہے یہ وجود نہ صرف اس کا غیر ہے اور نہ اس کے غیر سے مستفاد ہے اس لئے اس مرتبہ میں نور کی طرح ایک ہی چیز ہے یعنی وجود مطلق اور اسی طرح یہاں بھی وجود مطلق کا خود اپنے وجود سے انفکاک خارج اور ذہن دونوں میں محال اور ناقابل انفکاک ہے اور یہ موجودیت کا افضل ترین مرتبہ ہے مصنف فرماتے ہیں کہ عقل حاکم ہے کہ واجب تعالیٰ اعلیٰ مراتب وجود کے ساتھ متصف ہوا اور موجودیت

کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ وہ بنفسہ بذاتہ موجود ہو یعنی اپنی ہی ذات کے ساتھ موجود ہو اور دوسری اشیا کی موجودیت اسی کی محتاج ہو۔

اور موجود بنفسہ وجود مطلق ہے جس کی تفصیل اوپر گزری۔

پس واجب تعالیٰ عین وجود مطلق ہے جو مرتبہ اطلاق میں معبود اور مرتبہ تقیید و تنزل میں عابد ہے۔

آخر میں اس تمام استدلال کا خلاصہ بدیں طور بیان کرتے ہیں :

چاہئے کہ واجب تعالیٰ اتم و افضل ترین مراتب وجود سے متصف ہو مگر وہ اتم و افضل ترین مرتبہ موجودیت عرف وہ وجود ہے جو بنفسہ بذاتہ موجود ہے جو اپنی موجودیت میں کسی دوسری شے کا محتاج نہیں ہے۔ پس حقیقت واجب نہیں ہے مگر وجود مطلق جو موجود بنفسہ ہے اور باقی جملہ اشیا اسی سے موجود ہوتی ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ واجب الوجود وجود مطلق ہے جو بنفسہ موجود ہے اور باقی دوسری اشیا اسی وجود سے موجود ہیں جیسے کہ نور جو بنفسہ روشن ہوتا ہے اور تمام دوسری اشیا اسی سے روشن ہوتی ہیں۔

اپنے موقف کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے مصنف نے رسالہ کا اختتام شواہد قرآنی سے کیا ہے مگر ان کی تفسیر و تائید میں اہل شریعت سے اختلاف ہو سکتا ہے اس لئے ان کے بیان سے صرف نظر کرنا ہی مستحسن ہوگا۔

آخر میں میں صاحب اعیان الشیعہ کے اس تبصرے کو نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے انھوں نے مصنف کی فلسفیانہ کتابوں کو دینی اور دینی کتابوں کو فلسفیانہ کہا ہے فرماتے ہیں :

”نَحْنُ اِنْ تَعَدَّ كَتَبَ الْفَلَسَفِيَّةِ كَتَبًا دِينِيَّةً

وَلَعَدَّ كَتَبَ الدِّينِيَّةِ كَتَبًا فِلَسْفِيَّةً“

اور یہ واقعہ ہے کہ اس کڑی کمان کوزہ کرنا جس میں نہ تو شریعت کا دامن
ہاتھ سے چھوٹنے پائے اور نہ حکیمانہ تحقیق میں کوئی کوتاہی رہنے پائے اپنی جگہ
ایک اہم علمی و دینی کارنامہ ہے جس کے لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔

در کف جام شریعت در کف سندان عشق

ہر موی سنا کے نداند جام و سندان بافتن

حجاز و ماورائے حجاز حجاز کی کہانی حجاج کی زبانی

جلد دوم

محمد عبد الملک عبد القیوم خان

سائز ۱۸x۲۲ یہ کتاب خوبصورت جلد میں شائع ہو کر منظر عام پر
آگئی ہے جس کو ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس
اعلیٰ معیاری کتاب کے مطالعے سے استفادہ حاصل کریں۔

قیمت مجلد عمدہ ریگزن بیس روپے ۲۵/-

اپنا آرڈر اس پتے پر بھیجیں

ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی

تاریخ اسلام

خلافت راشدہ و بنی امیہ

از جناب عبد الرؤف صاحب ایم اے

گذشتہ دنوں جناب خورشید احمد فارق پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی کی تصنیف موسوم بہ "تاریخ اسلام - خلافت راشدہ و بنی امیہ" کے مطالعہ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ مذکورہ تصنیف جو کم و بیش پچاس پچپن مؤرخین متقدمین و متاخرین کے اور *بجمل البعوض* مصادرو مراجع کو کھنگال کر نظر گاہ عام پر لائی گئی ہے کی تصریحات کے ضمن میں فاضل مصنف نے وضاحت کرتے ہوئے صراحت پر فرمایا ہے کہ "کتاب میں ہماری بعض تصریحات قاری کو روایتی ڈگر سے ہٹی ہوئی ملیں گی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے *وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ* (حق اور انصاف کی بات کہو چاہے صاحب معاملہ تمہارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو) کے حکیمانہ قول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔" مگر کتاب کا از ابتدا تا انتہا مطالعہ کرنے پر اپنی کم نظری کے باوصف محسوس ہوا کہ نہ صرف بعض بلکہ بیشتر تصریحات کے سلسلہ میں اس حکیمانہ قول سے صرف نظر کرتے ہوئے تصویر کے صرف ایک ہی رخ کو نمایاں کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ سطور ذیل کے پڑھنے سے قارئین پر خاکسار کا یہ تاثر واضح ہو جائے گا۔

فائنل پروفیسر صاحب مذکورہ تصنیف کے صفحہ ۳ پر خلیفہ اوس سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے وظیفہ کی بابت فرماتے ہیں: خلیفہ ہو کر ابوبکر صدیقؓ کی ذمہ داریاں اتنی بڑھیں کہ انھیں تجارت چھوڑنا پڑی۔ اس کی تلافی انھوں نے بیت المال سے کی جس طرح رسول اللہؐ خالصہ الملک سے اپنے متعلقین کی ضروریات رفع کرتے تھے اسی طرح ابوبکر صدیقؓ نقد، جنس، کپڑا، اونٹ، غلام غرضیکہ جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی بیت المال سے لے لیتے تھے..... یہی تاثر ۱۰۳ نیز دیگر صفحات پر بھی یہ اندک تغیر دیا گیا ہے۔ مگر اس بات کا کہیں شائبہ و کنایت بھی ذکر نہیں فرمایا کہ انھوں نے اپنی سواد و سالہ مدت خلافت (۱۱-۱۳ھ) میں جو کچھ حق خدمت بیت المال سے وصول کیا تھا اسے حساب لگوا کر اپنی حالت احتضار کے قریب واپس بیت المال میں جمع کروانے کی وصیت فرمادی تھی۔ جسے حسب وصیت واپس کر دیا گیا۔ یہ مال جب خلیفہ ثانی حضرت فاروقؓ اعظم کی خدمت میں پہنچا تو بے ساختہ اُن کا دل بھر آیا وہ روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے اے ابوبکر! تم نے اپنے جانشینوں کا کام بہت دشوار کر دیا۔

حضرت علیؓ کے تخلف عن البیعتہ کے بارے میں مصنف محترم نے فرمایا ہے "علی حیدرؓ کی بیوی فاطمہ بنت رسول اللہؐ ابوبکر صدیقؓ سے سخت ناراض تھیں اور علی حیدرؓ کی بیعت کی راہ میں سنگ گراں، ان کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابوبکر صدیقؓ اُس عظیم منصب پر فائز ہو گئے تھے جو اُن کی رائے میں اُن کے شوہر

سہ برائے تفصیل ملاحظہ ہو صدیق اکبر مرتبہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے طبع سوم سنہ ۳۰۲۔ تاریخ الخلفاء مترجم اقبال الدین احمد ص ۱۲۱۔ خلافت و ملوکیت ص ۸۵ طبع سوم از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

کو ملنا چاہئے تھا۔ دوسرے یہ کہ ابوبکر صدیقؓ نے انھیں رسول اللہؐ کی خالصہ جائیداد دینے سے انکار کر دیا تھا جو مخیر بنی یہودی کے سات نخلستانوں، خیبر، فدک کے فارموں اور باغوں پر مشتمل تھی اور جس کا فاطمہؓ خود کو قدرتی وارث تصور کرتی تھیں، ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے چند ماہ بعد جب اُن (حضرت فاطمہؓ) کا انتقال ہو گیا۔۔۔۔۔ تو علیؓ حیدرؓ نے بُرے دل سے اُن کی بیعت کر لی۔۔۔۔۔ علیؓ حیدرؓ نے بیعت تو کر لی لیکن اُن کا دل صاف نہیں ہوا (ص ۷) علیؓ حیدرؓ نے بی بی فاطمہؓ کی حین حیات ابوبکر صدیقؓ کی بیعت نہیں کی تھی (ص ۹۲) خلافت سے محرومی کے بعد اس دوسری ناکامی (خالصہ جائیداد سے محرومی) نے علیؓ حیدرؓ کی طبیعت سخت منقص کر دی، حکومت کے خلاف اُن کے تیور چڑھ گئے اور زبانِ طعن کھل گئی (ص ۲۱-۲۲) لیکن حضرت علیؓ کے بیعت حضرت ابوبکر صدیقؓ سے تخلف (پیچھے رہنا) کے بارے میں اگر ہم عصر حاضر کے محقق شہیر مولانا پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی (المتوفی مئی ۱۹۸۵ء) کی تحقیق پر سرسری نگاہ بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت علیؓ نے خلیفہ اول سے بیعت کرنے میں ایک دن کا بھی توقف نہیں فرمایا۔ مولانا یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جب ابوبکرؓ منبر پر بیٹھ گئے تو انھوں نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور جب علیؓ کو نہیں دیکھا تو ان کی نسبت پوچھا اس پر کچھ انصاری کھڑے ہوئے اور جا کر علیؓ کو لے آئے۔ ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد بھی ہیں، کیا آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ علیؓ نے کہا اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملامت نہ کیجئے، اس کے بعد علیؓ نے ابوبکرؓ سے بیعت کر لی۔“ حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت سے ظاہر ہے کہ

حضرت علیؓ کی بیعت میں کسی طرح کا تخلف و انکراہ نہ تھا۔ یہ حدیث صیہبیؒ مذکور کے علاوہ دوسرے صیہبیہ کرامؓ سے بھی منقول ہے۔ لیکن چونکہ زیر تبصرہ تصنیف کے فاضل مصنف نے تقدیم و تاخیر زمانی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کتب حدیث سے قدیم تر کتابوں کے حوالے دینا زیادہ مناسب نہ سمجھا (ملاحظہ ہو پرہان دہلی ص ۹۸ بابت ماہ فروری ۱۹۹۱ء) چنانچہ موصوف نے (خواہ طبقہ جمہور کے نزدیک احادیث شریفہ کا دہم استناداً و درایتاً سیرت و مغازی کی روایات سے کہیں بڑھ کر ہے) احادیث سے ارادۂ صرف نظر کرتے ہوئے تاریخی مواد پر ہی اکتفا کیا۔ مگر مندرجہ بالا حدیث شریف کو محدثین کے علاوہ ابن سعد نے بھی روایت کیا ہے جسے پروفیسر صاحب قدیم تر مورخ سمجھتے ہیں (پرہان ایضاً) جبکہ انہی ابن سعد سے موصوف نے کم و بیش ۱۲۵ مقامات پر مراجعت فرمائی ہے۔ بیعت کے سلسلہ میں غیر ان وشواہد بھی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ حضرت علیؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرح خلافت کا اہل اور مستحق سمجھتے تھے اور یہ کہ بیعت کرتے وقت (اول روزی) نہ تو ان کی طبیعت میں کسی قسم کی تنگی ہی تھی اور نہ دل میں کسی قسم کا تکبر و انقباض ہی جیسا کہ اس ضمن میں حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے مابین مکالمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ فاضل مصنف کی محولہ بالا عبارت کے اس فقرہ ”علی حیدر کی بیوی فاطمہ بنت رسول اللہ ابو بکر صدیقؓ سے سخت ناراض تھیں اور علی حیدرؓ کی بیعت کی راہ میں شگ گراں“ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی پاکیزہ سرشت میں خلیفہ اول کی طرف سے کسی طرح کا غبار نہ تھا اور وہ ہر صفا و رغبت بیعت کرنے پر آمادہ تھے مگر حضرت فاطمہؓ ان کی

بیعت کی راہ میں سنگ گراں تھیں اس لئے ان کی دل جوئی کی خاطر انھوں نے بیعت سے ممکن ہے کچھ توقف فرمایا ہو چنانچہ انھیں مجمع عام میں بلوانا پڑا۔ رہا حضرت فاطمہؓ کی کبیدگی خاطر کا دوسرا سبب کہ انھیں رسول اللہؐ کی خالصہ جائیداد سے محروم کر دیا گیا تھا تو اسے حضرت علیؓ کی بیعت سے علیحدگی کے تناظر میں پیش کرنا قیاس مع الفارق پر ہی منتج ہوگا کیونکہ خالصہ جائیداد سے محروم کرنے کا مسئلہ بیعت عامہ کے وقت معرض وجود ہی میں نہیں آیا ہوگا۔ اس کا تعلق نظم مملکت سے ہے جس کی طرف توجہ یقیناً بعد ہی میں مبذول کی گئی ہوگی۔

یہ تسلیم کرنا کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ارتحال کے بعد ہی بادلِ خواستہ بیعت کی تھی، شواہد و دلائل کے منافی ہوگا کیونکہ اولاً حضرت علیؓ کا بیعت نہ کرنا مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے سب سے بڑا حادثہ ہو سکتا تھا تو کیا اس وقت جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی فوراً اسلام کی مخالفت کا طوفان امنڈ پڑا تھا۔ حضرت علیؓ جیسی عظیم المرتبت شخصیت یہ کبھی گوارا کر سکتی تھی کہ ان کے کسی فعل سے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت میں کسی قسم کا کوئی رخنہ پیدا ہو؟ ثانیاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اسلام میں جو مرتبہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر جو اعتماد تھا جس کے باعث آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی طرف قولاً و عملاً اپنا رجحان ظاہر فرمایا تھا، حضرت علیؓ سے زیادہ ان سب سے زیادہ اور کون واقف ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر کیا حضرت علیؓ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ بایں ہمہ وہ بیعت عامہ کے وقت سب مسلمانوں سے الگ رہیں۔ حضرت ابوبکرؓ تو ابوبکرؓ! حضرت علیؓ کا کیرنٹر تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعت خلافت کے وقت بھی عام مسلمانوں سے الگ نہیں رہے اور اپنے لئے کوئی دعویٰ یا مطالبہ نہیں کیا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ مثالاً یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس

امت میں جواہم واقعات و حوادث پیش آئے اور جو درحقیقت اسلام کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھے۔ حضرت علیؑ ان سب سے بے تعلق رہے اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ رابعا اچھا اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علیؑ نے بیعت نہیں کی تو کیا حضرت ابوبکرؓ اس گناہ کی صورت کو برداشت کر کے اسلامی وحدت کی دیوار میں یہ ایک رخنہ کھلا رہنے دے سکتے تھے؟ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علیؑ کا بیعت نہ کرنا ان کو کم از کم بنو ہاشم کی حمایت و نصرت سے محروم کر دیتا ہے۔ "علاوہ ازیں" بعض معتدل خیال شیعہ حضرات بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگرچہ رسول اللہؐ کے بعد سیدنا علیؑ افضل الناس اور خلافت کے سب سے زیادہ مستحق تھے لیکن انہوں نے حضرات شیخیہؓ کی خلافت کو قبول کر لیا تھا اور ان کے ساتھ اشتراکِ عمل اور تعاون کو ملحوظ رکھا نیز یہ کہ امت کو اپنے والی اور حاکم کے انتخاب کا حق تھا۔ اور ان کا انتخاب رشد و ہدایت کے لئے کافی ہے۔"

حضرت سعد بن عبادہؓ کی بیعت سے علیہ السلام کی دعا کا واقعہ بھی محل نظر ہے۔ آپ کے بارے میں موصوف ص ۳۱ پر فرماتے ہیں کہ جب وہ ڈرانے و ہمکانے کے باوجود اپنے موقف سے نہیں ہٹے تو بڑے پیالے پر خون خرابہ ہونے کے اندیشہ کے سبب ان سے مزید تعرض نہیں کیا گیا تاہم انہیں مدینہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور وہ جلد وطن ہو کر شام چلے گئے۔ عبارت کے خط کشیدہ فقرہ سے ثابت ہوتا ہے

۱۔ حدیث کبریٰ (مستدرک) ۲۱-۲۲۔

۲۔ مدد سب اور بالظنی تعبیر از مرتبہ محمد سعید دہلوی۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ او۔ ایس۔

۳۔ ۱۱۳-۱۱۴ مطبعہ علم و روزگار لاہور۔

کہ انھیں مدینۃ الرسول سے زبردستی نکال دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ میں موصوف اپنے
 مضمون ”اعتراضات کے جواب“ ماہنامہ برہان دہلی بابت فروری ۱۹۴۷ء ص ۹۹ پر
 یوں رقمطراز ہیں: ”جب ابو بکر صدیقؓ اور ان کے حامی قریشی صحابہ انصار کو خلافت
 دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب ہو گیا تو پڑے انصاری
 لیڈر اور امیدوار خلافت سعد بن عبادہؓ نے نئے خلیفہ کی بیعت نہیں کی اور ان کے
 پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دی اور بطور احتجاج گھر بار چھوڑ کر شام کے شہر حوران چلے
 گئے۔“ برہان میں مندرج عبارت کے اس آخری فقرہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا
 ہے کہ صحابی مذکور خلیفہ وقت پر جمہوری طرز کا دباؤ ڈالنے کی غرض سے بطور احتجاج از خود
 شام کے شہر حوران تشریف لے گئے تھے۔ اور ہمارے ناقص خیال کے مطابق ان کا
 یہ احتجاج بالکل ایسا ہی ہو گا جیسا کہ آج کل جمہوری ممالک میں ممبران حزب مخالف
 سرکار کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے پارلیمنٹ سے واک آؤٹ
 کر جاتے ہیں۔ بہر حال محولہ بالا دونوں عبارتوں میں تناقض ہے جس سے صرف نظر
 کرتے ہوئے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے بھی حضرت صدیق اکبرؓ
 سے پہلے دن ہی بطیب خاطر بیعت کر لی تھی۔ رہا سوال حضرت سعدؓ کا بعد صدیق مدینہ
 میں اقامت گزینی کا تو صحیح یہ ہے کہ وہ بعد خلیفہ ثانی شام کے شہر حوران تشریف لے گئے
 ہیں جہاں اپنی رحلت کے وقت تک مقیم رہے۔ حتیٰ خروج الی الشام فی اول
 خلافتہ عمر فمات بجر دان)

۱۔ صدیق اکبر ص ۸۵-۸۶، سیرۃ الصدیق ص ۳۰۹، تاریخ ابن خلدون جلد اول
 قسط دوم ص ۲۴۰ مطبوعہ ادارہ دین قرآن دیوبند۔ کنز العمال ۳/۱۳۴
 مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

در اصل واقعات کی اکثر تصریحات اپنے صحیح تناظر سے اس لئے ہٹی ہوئی ہیں کہ لائق مصنف نے اپنے مصادر و مراجع سے کتب احادیث یعنی صحاح ستہ کو خارج از رجوع رکھا ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک کتب سیر و معازی کے مصنفین کو تقدم زمانی حاصل تھا اور انھوں نے مکہ مدینہ میں اخبار و آثار کے معتبر معاشرے کے مقبول و معزز لوگوں سے رسول اللہ کے صحابہ کے حالات اخذ کیے تھے۔ یہ مصنف خود بھی ثقہ تھے، ان میں سے کوئی ممتاز فقیہ تھا، کوئی مفتی، کوئی قاضی، کوئی عالم حدیث (ایضاً برہان ص ۹۸-۱۰۱) گویا نفوذ باللہ محدثین کرام نے 'مستند ترین احادیث' کا تمام تر ذخیرہ غیر معتبر معاشرے کے مجہول و مردود اور اراذل لوگوں سے اخذ کیا تھا جو خدا نخواستہ خود بھی غیر ثقہ تھے اور ان میں نہ کوئی فقیہ تھا، نہ مفتی اور نہ قاضی۔ یہیں تفاوت رہ اذ کجاست تا بکجا۔

فاضل پروفیسر صاحب نے اس بارے میں جو چند نام گنوائے ہیں ان کی تقدیم و تاخیر زمانی اور ثقاہت و نقاہت کے سلسلہ میں عرض کرنے سے پیشتر یہ گوش گزار کرنا چاہیں گے کہ موصوف کے مصنفین و مؤلفین کو خواہ تقدم زمانی کی فوقیت حاصل ہو مگر انھیں صحت روایت و درایت میں وہ فوقیت اور برتری ہرگز حاصل نہیں جو محدثین عظام کو حاصل رہی ہے اور پھر کلیہ کے طور پر یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اگلے پچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں اور لبیا اوقات علم کے پہلے حاملین سے بعد کے سیکھنے والے بدرجہا فائق ہو جاتے ہیں اور اگرچہ وہ زمانے کے لحاظ سے اخیر میں ہوتے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کے علاوہ علمی میدان میں بھی ایسے کام ہائے نمایاں انجام دے جاتے ہیں جو متقدمین سے نہیں ہو سکے تھے۔ یہ بات محدثین کرام کی محنت و کاوش پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ بہر حال اگر موصوف صرف طبقہ قدام کے مؤلفین

ہی پر انحصار فرماتے تب تک بھی بجا اور درست تھا مگر پوری تصنیف میں جن پچاس ساٹھ مصنفین سے استفادہ و استناد فرمایا ہے، کیا وہ تمام طبقہ قدامت میں شمار ہوتے ہیں ؟ موصوف نے جن مؤلفین کو قدیم ترین خیال فرمایا ہے ان میں سے چند کے سنین و وفات نذر ناظرین کیے جاتے ہیں :

موسیٰ بن عقبہ (۱۴۱ھ) محمد بن اسحق (۱۵۰-۱۵۱ھ) ابواسمعیل ازدی بصری (۱۵۲ھ) ولید بن مسلم القرشی (۱۹۵ھ) محمد بن سعد صاحب طبقات (۲۳۰ھ) مصعب بن عبداللہ زبیری (۲۴۰ھ) محمد بن عمر الواقدی (۲۰۷ھ) سجستانی (۲۶۱ھ) ابن قتیبہ (۲۱۳ھ) بلاذری (۲۴۹ھ) دینوری (۲۸۱ھ) یعقوبی (۳۰۰ھ) وغیرہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے تقریباً ۳۰۰ تک فوت ہونے والے مصنفین کو طبقہ قدامت میں شمار فرمایا ہے۔ بعد ازاں متاخرین کا دور ہے۔ ساتھ ہی اگر ہم محدثین کرام کے سنین و وفات پر بھی ایک نظر ڈالیں تو علامہ شبلی نعمانیؒ کے بقول وہ بھی طبقہ قدامت ہی میں شمار ہوں گے۔ امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) امام مسلمؒ (۲۶۱ھ) امام ابن ماجہؒ (۲۴۳ھ) امام ابوداؤد (۲۴۵ھ) امام ترمذی (۲۴۹ھ) اور امام نسائی (۳۰۳ھ)۔ مگر مستزاد یہ کہ صاحب تاریخ اسلام۔ خلافت راشدہ و بنی امیہ نے متاخرین سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے مثلاً ابوالحسن علی بن حسین مسعودی المتوفی ۳۸۶ھ، ابولتیم اصیبہانی (۴۳۰ھ) حافظ ابوریح سلیمان بن موسیٰ الکطاعی صاحب اکتفاء (۶۳۲ھ) ابن ابی الحدید (۶۵۵ھ) ابن ابی اصیبعہ (۶۶۸ھ) ابن کثیر صاحب البدایہ والنہایہ (۷۷۴ھ) وغیرہم۔ پھر ایسی صورت میں صحاح ستہ سے مراجعت نہ فرمانے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر مراجعت فرماتے

تو کوئی وجہ نہ تھی کہ موصوف خلیفہ اول کی ازواج کی تعداد صرف چار ہی بتلاتے (ص ۱) جبکہ بخاری شریف میں بروایت حضرت عائشہ صدیقہ معظورہ سے کہ حضرت ابو بکرؓ نے بنو کلب کی ایک عورت سے بھی، جس کا نام ام بکر تھا شادی کی تھی۔ اور ہجرت کے وقت اُن کو طلاق دیدی تھی۔ اس طرح کی دیگر متعدد مثالیں سیرۃ النبی جلد اول میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ محققین یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث صحیحہ تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، نیز یہ کہ سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی (علامہ شبلیؒ) لیکن تقدم زمانی ہی اگر معیار ثقاہت ہے تو اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر محمد نسیم مظہر صدیقی فرماتے ہیں کہ ابتداً تاریخ نگاری اسلام میں تو راویوں کی شخصیت، دینیت اور ثقاہت وغیرہ کو بھی نہیں پرکھا جاتا تھا۔

سیرت نبوی کے اولین مؤلف محمد بن اسحق کی شخصیت متنازعہ فیہ ہے، اگر ایک گروہ اُن کو ثقہ سمجھتا ہے تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو یہ اعتبار قرار دیتا ہے کہ معاذی نگاروں کے سرخیلی و اقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اس کی لغوی بیانی مسلمان ہو چکی ہے۔ ایک صاحب نے تو اُس کے بارے میں بڑی طرافت آمیز بات کہی ہے کہ اگر اقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اُس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے

۱۔ صدیق اکبرؓ ص ۲۵۲۔

۲۔ ماہنامہ برہان دہلی ص ۳۵ بابت دسمبر ۱۹۸۲ء۔

۳۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ص ۲۴۶-۲۴۷ بابت اپریل ۱۹۸۴ء۔

۴۔ ایضاً۔

تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ ”دنیا جانتی ہے کہ واقعی کی حیثیت ایک داستانِ گو کی ہے جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا۔ تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے آپؐ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں۔“ بہر کیف واقعی... جس کے متعلق تمام دنیا جانتی ہے۔ کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جمجھوٹے قصے کہانیوں اور بے سند باتوں کی وجہ سے اُسے تمام علماء اسلام نے جھوٹا اور نامعتبر قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ شیعیت سے بھی متہم تھا اور تقیہ کیے رہتا تھا گو معتدل شیعہ تھا۔ بہر حال باعثِ تسوید یہ کہ زیر بحث تصنیف کے مصنف نے کم و بیش بارہ مقامات پر واقعی سے رجوع کیا ہے۔ فاضل پروفیسر صاحب نے اپنی تفسیر کے صفحہ ۱۱ پر مؤرخ ابن ابی الحدید کو معتزلی عالم قرار دیا ہے۔ جبکہ راقم الحروف کی محدود و ناقص معلومات کی حد تک وہ نہ صرف معتزلی بلکہ مسلک تشیع کا بھی پیرو اور متبع تھا۔ مسلک اعتزال کے بانی واصل بن عطاء متوفی ۱۳۱ھ کے بعد اس گروہ کے بعض مشاہیر شیعہ عقائد کی طرف میلان رکھنے لگے تھے چنانچہ اعتزال اور تشیع کی یکجائی کی تاریخ میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات امام عمر بن بحر الجاحظ اور ماہر زبان دان ابن ابی الحدید شیعہ مسلک اعتزال سے متاثر ہونے والے عرب علماء کی بہترین مثال ہیں۔ چنانچہ ابی الحدید کے شیعہ ہونے کی بنا پر ہی مولانا

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۳۳ نیز ملاحظہ ہوں صفحات ۱۸، ۱۹، ۲۳، ۲۵، ۲۸ اور ۴۸۔

۲۔ مقالات سلیمان جلد ۲ ص ۱۱۸۔

۳۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ص ۲۲۲ بابت ماہ ستمبر ۱۹۸۲ نیز ماہ نومبر ۱۹۸۲ ص ۳۳۴۔

۴۔ سیرت نبویؐ کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی ص ۱۸۔

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی تصنیف ”خلافت و ملوکیت“ میں ۱۳۱ سے مراد ایک ذرا لی ہے کہ سیدنا علیؑ نے بیت المال میں سے اپنے بھائی عقیلؓ بن ابی طالب کو بہت زیادہ ازاستحقاق کچھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔“ اور وہ بھی اس لئے کہ از روایت کی دوسرے مورخین مثلاً ابن قتیبہ اور حافظ ابن حجر تائید کرتے ہیں۔ جبکہ پروانیسر صاحب نے اپنی تصنیف میں تقریباً ۲۷ مقامات میں سے ۱۳ مقامات پر تنہا ابن ابی الحدید کی روایات پر انحصار کیا ہے۔ مذکورۃ الصدر دونوں مشاہیر کے علاوہ صاحب مرون الذہب سعودی بھی معتزلی ہونے کے ساتھ شیعہ بھی تھے۔ مصادر و مراجع کے سلسلے میں اثر نمائی قدرے طویل ضرور ہو گئی ہے مگر دراصل کسی بھی تصنیف کا معیار مآخذ پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ لہذا مندرجہ بالا چند مثالوں کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا نامناسب نہ ہوگا کہ زیر تبصرہ تصنیف کے دیگر مصادر بھی مشکوک ہوں گے۔ سیرت کی بیشتر کتابوں کا پایہ نہایت بلند اور برتر ہے جیسا کہ سیرت ابن ہشام کے بارے میں ایک مستشرق کہتا ہے کہ ”سیرت نبوی کی عربی تصنیفات جیسے سیرت ابن ہشام کا پایہ تاریخی حیثیت سے انجیل سے بڑھ کر ہے“۔ دیگر معاندین و مستشرقین نے بھی کتب سیر و مغازی کی وقعت و صحت کا اعتراف کیا ہے۔

۱۔ خلافت و ملوکیت۔

۲۔ دیکھئے زیر بحث کتاب کے صفحات ۷، ۱۳، ۱۰۲، ۱۳۸، ۱۳۸، ۱۴۵، ۱۶۷

۱۸۳، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۲۲ نیز ۲۲۵ وغیرہ۔

۳۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مابت مارچ ۸۳ء ص ۱۴۳۔

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد ۹۸ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۶ء شمارہ ۶

- | | | |
|--------------------------------------|------------------------------|----|
| ۱۔ نظرات | ۲۔ جمیل مہدی | ۲ |
| ۲۔ اسلام اور سائنس | مولانا عبدالرؤف رحمانی | ۴ |
| ۳۔ عربی ادب میں ہندوستانی قضا | جناب سید محمد ضیاء الدین شمس | |
| ۴۔ تنبیہ العقول | مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ | ۲۳ |
| ۵۔ منطق و فلسفہ | جناب محمد صلاح الدین عمری | |
| ۶۔ ایک علمی و تحقیقی جائزہ | مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ | ۳۰ |
| ۷۔ سرسید احمد خاں کی | جناب محمد اطہر حسین قاسمی | |
| ۸۔ ایک ناوردت | بستوی | ۳۷ |
| ۹۔ جناب حکیم نعلی الرحمن کے اعتراضات | حکیم محمد حسین خاں شفا | |
| | رام پور | ۵۷ |
| | جناب محمد ثناء اللہ عمری | ۶۱ |

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی شائع کیا

نظرات

آج کا انسان اب یا تو سپارڈول پر جا کر خوبصورتی دیکھ سکتا ہے، یا غلام لیبیڈ میں جا کر دنیا پر ایک نظر ڈالنے سے اس کی خوبصورتی کا احساس کر سکتا ہے، لیکن جو اصل دنیا ہے، اس میں سکون اور خوبصورتی اب کسی کے لئے نہیں رہ گئی ہے، سیاست جب تک اصولی حکمرانی کا تھا، اس دنیا میں ہزار جنگوں کے باوجود نسبتاً امن قائم رہا، لیکن جب سے سیاست ایک پیرستہ بن گئی ہے، اس وقت سے یہ حال ہو گیا ہے کہ جنگ نہ بھی ہو تو اس کی دہشت اور خوف سے انسان پیچھا نہیں چھوڑ سکتا، اتنی آوازیں، اتنے بلاوے، اتنے نظریات، اور اتنے فلسفے کسی زمانے کی بھی دنیا میں جمع نہیں ہوئے جتنے کہ آج نظر آتے ہیں لیکن ہر فلسفہ کا خول اترتا ہے تو اس میں انسان کے خواہ وہ فرد کی صورت میں یا قوم کی۔ استحصال کرنے والی تنگی قوت برآمد ہو جاتی۔ ان ملکوں میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے حالت اور زیادہ خراب ہے، جہاں سماجی مکمل نہیں ہوا ہے اور انھیں، ناپختگی کی حالت میں ایک دور سے دوسرے دور میں پھلانگ لگانی پڑ رہی ہے۔ اس طرح کے ملک اور ان میں ہندوستان بھی شامل ہے ذہنی طور پر دو تخت ہو گئے ہیں، اور اس کی ایسی مضحکہ خیز صورت حال کا شکار ہو گئے ہیں کہ ان کے ذہن کا ایک حصہ پرانے دور میں لگا ہوا ہے اور دوسرا نئے دور سے وابستہ ہو گیا، نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ تو پورے طور پر قدیم رہ سکے ہیں، نہ نئے طور پر جدید بن سکے ہیں۔

ترقی یافتہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ اپنی دولت کے سہارے پر ایک ایرکنڈیشٹ کیٹیلانگ خرید کر اس میں سونے کے پتروں کا جڑاؤ ہر قسم کا آسائشی سامان فراہم کر لیں، لیکن آپ کا دماغ اٹھارہویں صدی کا ہی رہے، ایسی صورت میں چاہے آپ غلام میں چکر لگا رہے ہوں، ذہنی اعتبار سے قدیم ہی رہیں گے۔ جدید اور ترقی یافتہ ہرگز نہیں بن سکتے۔ اس

بس آپ بیسویں صدی کے جدید ذہن کے ساتھ پیٹے پرانے کپڑوں میں دوپہر کے وقت شام کی
وٹی کی فکر میں پیدل دوڑتے نظر آئیں تو اس بے سرو سامانی، اور اسباب تعیش سے یکسر محرومی
حالت میں بھی جدید اور ترقی یافتہ ہی بنے رہیں گے قدیم اور رجعت پسند ہرگز نہیں
ہو سکتے۔

ایسے سبھی ملکوں میں۔ جن میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ اور جن کی تعداد اس وقت
و سے بھی زیادہ ہوگی، ایسے ہی جدید اور ترقی یافتہ لوگ نظر آتے ہیں جو اٹھارویں صدی کا
مارغ کندھے پر رکھے ہوئے، ایرکنڈلشنڈ مخلوں اور کوٹھیوں میں سکونت پذیر ہیں، اور جدید
اسوں میں ایرکنڈلشنڈ کاروں کی ڈرامیونگ سیٹ پر بیٹھے ہیں، ان لوگوں نے جاگیردارانہ
رسمراجی نظام کے دور میں مشینوں کی شکل تو دیکھ لی تھی، لیکن ان مشینوں کی کھٹ کھٹ سے
برنے والے اس صنعتی دور کی جھلک بھی نہیں پائی جس نے حقیقی ترقی یافتہ اور جدید ملکوں
، اس ذہنی انقلاب کو جنم دیا تھا، جو آج ایٹمی اور خلائی دور سے مناسبت پیدا کرنے
لئے ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔

اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ صرف دو چار ملک پورے طور پر جدید اور ترقی یافتہ ہیں
ساتھ خلائی اور ایٹمی دور کے ہر تقاضے کا ساتھ دینے پر قادر ہیں، اور دس بیس
تیزی کے ساتھ قدم مار کر ان کے برابر آنے اور قدم سے قدم ملانے کی تگ و دو
جہد و جہد میں لگے ہوئے ہیں، باقی ملک وہ ہیں، جو خلائی اور ایٹمی دور کی برکتوں پر رشک
کی نظر سے ڈالنے اور اس کے تباہ کن اثرات اور خوفناک عمل سے لرزہ بر اندام ہونے
سوا کوئی سکت اپنے اندر نہیں پاتے، وہ معاشی ترقی، فوجی قوت اور سیاسی استحکام
لئے عملی طور پر بڑی قوتوں کی مدد پر انحصار کرنے اور بعض اوقات ان کے دست نگر
پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن سماجی اور معاشرتی شعبوں میں ان کی ہمسری کی کوشش
باز نہیں آتے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناپختہ سیاسی اور ذہنی کیفیتوں کے سبب وہ تمام کمزوریاں، خرابیاں

اور وہ تمام نقائص اور تضادات ان ملکوں کے اندر بھی داخل ہو جاتے ہیں، جن کے یہاں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں ایک تاریخی عمل کے بجائے محض روایت اور تقلید کے ذریعہ واقع ہوتی ہیں مثال کے طور پر جمہوری نظام۔ جو مشرقی ملکوں میں صرف اس لئے ناکام رہا کہ وہ کرپشن پر قابو نہیں پاسکے، جو خالص جاگیردارانہ اور سماجی ددر کی دین تھا۔ انھوں نے جمہوری نظام تو ان ترقی یافتہ ملکوں کی تقلید میں اپنے یہاں قائم کر لیا، جو اس کے قیام کے تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد اس کی برکتوں سے مالا مال ہونے کے فی الواقع مستحق بن گئے تھے۔ لیکن ان خرابیوں اور ان محرکات کو ختم کرنے میں ناکام رہے، جن کی موجودگی میں جمہوریت دو قدم بھی آگے کی طرف نہیں چل سکتی۔ اس لئے انگریزوں اور ایشیاء کے بیشتر ملکوں میں جمہوری نظاموں کا جو انجام ہوا، وہ سب پر ظاہر ہے، ایک ہندوستان میں جمہوریت ابھی تک چل رہی ہے لیکن اس کا دامن بھی بڑھتے ہوئے کرپشن نے جس طرح تار تار کر دکھا ہے، اسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے اس لئے اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

جیسا ہم نے کہا کہ ان ملکوں میں جہاں جاگیردارانہ دور کے خاتمہ کا عمل قدرتی طور پر مکمل نہیں ہو سکا۔ جتنے بھی سیاسی نظام قائم ہوئے، وہ خود اپنے اندرونی تضادات کے بوجھ سے ختم کھا کر اور چک کر کچھ کے کچھ ہو گئے، ان ملکوں میں طبقہ داری کشمکش بھی ابتدائی درجوں میں رہ گئی ہے، سوشلزم اور جمہوریت اور آمریت کے تجربے بھی عملی طور پر ناکام ثابت ہوئے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ آدمی سے زیادہ دنیا میں جس چیز کا راج نظر آتا ہے وہ بے یقینی کی حالت ہے، جہاں آمریت اور ڈکٹیٹر شپ قائم ہے، وہاں بھی لوگ پریشان ہیں، جہاں فوجی حکومتیں ہیں، وہاں بھی امن و سکون کے کوئی آثار نہیں۔ ناچختہ ذہنی کیفیتوں سے ٹکرا کر ہر نظریہ پکنا چور نظر آتا ہے اور ہر نظام کی روح اس کے قالب سے باہر دکھائی دیتی ہے۔ اسی بے سکونی، اسی پریشانی اور شورش جیسی حالت کا قدرتی رد عمل اس غیر منطقی اور مصنوعی تضاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جس میں حیائیت کی طرف لوٹ جانے کی خواہش غالب نظر آنے لگتی ہے۔ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ نئے طریق علاج اور نئے مرتبوں سے تو چارہ زخم نہیں ہو سکا تو آؤ

پرانا ہی طریقہ استعمال کر دیکھیں، لیکن نصیبت جب آتی ہے کہ اس خلفشار، پارہ پارہ سیاسی اور معاشی نظریوں کے گورکھ دھندے اور سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کی ایک لمبی زنجیر کے ساتھ جس پر آنے دور میں لوٹنا بھی مشکل اور ناممکن دکھائی دینے لگتا ہے۔ اور نجات کے اس راستہ کو بھی بند دیکھ کر جھلاہٹ میں اور اضافہ ہونے لگتا ہے جو پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی۔

مثال کے طور پر جو لوگ مذہبی تعصب اور منافرت سے مجبور ہو کر ہندوستان پر ہندو راج قائم کرنے کا تصور پیش کرتے ہیں، ان کے جمہوریت سے غیر مطمئن ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں، البتہ ان کی بے اطمینانی اور مایوسی کی وجوہات پر بحث کی جاسکتی ہے، اور اس کا قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جمہوری نظام سے اس درجہ مایوس ہو گئے ہیں کہ آگے بڑھنے کے بجائے انہیں پیچھے ہٹنے میں غایت نظر آتی ہے، لیکن ان کی ذہنی کیفیت اس وقت پوری طرح مشتبہ اور غیر معتبر ثابت ہوتی ہے، جبکہ وہ ان سوالات کا جواب دینے میں بے بس ٹھہرتے ہیں کہ وہ ایک پورے ملک کو اس کی صدیوں کی تبدیلیوں، نیم بچت اور پختہ رسوم و رواج اور معاشرتی اور سیاسی روایتوں کے ساتھ ہزاروں برس پہلے کی فضا میں کیسے لے جا کر ٹپک دیں گے اور یہ کیسے ممکن ہوگا کہ وہ نظام جو گاؤں اور دیہات کی بنیادوں اور مسائل آمدورفت سے محروم آبادیوں میں مروج تھا، ایسے عظیم اور گنبد شہروں پر منطبق کر دیا جائے، جن کی آبادی اب لاکھوں کی حد سے گذر کر وڑکی حدوں تک پہنچ رہی ہے۔ اور ان متضاد عناصر میں مناسبت کی کیا شکل ہوگی، جو ایک طرف ذاتوں کے مستقل نظام اور دوسری طرف پچھڑی ہوئی جاتیوں کو مساوی درجہ دینے کے اصول، بینکوں کے ملکی اور غیر ملکی روابط، اور تجارت کے نئے اور بین الاقوامی ضابطوں کی پابندی اور اسی طرح کے صدامسائل کی صورت میں پرانے ہندو راج کے لئے ایک چیلنج کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ جب تک مسلمان، عیسائی، اور اب — کہنا چاہئے کہ سکھ قومیتیں، ایک ناگوار اور ناقابل برداشت بوجھ کی صورت میں سامنے ہیں، اس وقت تک تو ہندو راج کا تصور یقیناً دلکش اور دلفریب نظر آسکتا ہے

کیونکہ اس میں ان مذکورہ تمام قومیتوں کو ختم کر کے، اقتدار اور اس کے تمام لوازمات کو صرف ہندو قوم کے لئے مخصوص کر لینے کے تمام خواب آگئیں اور سحر انگیز عناصر موجود ہیں لیکن ایک لمحہ کے لئے یہ مان کر چلنے کے بعد کہ ہندوؤں کے علاوہ کوئی دوسری قومیت اور کوئی دوسرا فرقہ ملک میں موجود نہیں رہا۔ خود ہندو راج کا نظریہ کس درجہ ناقابل عمل اور بے معنی نظر آنے لگتا ہے اس کے بارے میں سوچنے تک کی ضرورت غالباً کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو راج کے نظریہ کی ساری دلکشی اور آب و رنگ، غیر ہندو قومیتوں اور غیر ہندو مذاہب کی وجہ سے قائم ہے۔ یہ قومیتیں درمیان سے نکل جائیں تو یہ ہی مسئلہ بڑھنے نہ ہو پائے گا کہ ہندو راج سناتن دھرمیوں کے اقتدار میں قائم ہو گا، یا آریہ سماجیوں کے۔ اور اس اقتدار میں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں کے معتقدات کا غلبہ ہو گا یا جنوبی ہندوؤں کے فکرو خیالات کا۔ اور یہ کہ اس راج کی سرکاری زبان ہندی ہوگی یا انگریزی بولنے والے ہندوؤں کے نظریات اس مسئلہ پر قطعی اور آخری ثابت ہوں گے۔ اور یہ کہ اس راج میں سرکاری مذہب مورتی پوجنے والوں کا مذہب ہو گا یا مورتی کھنڈن کرنے والوں کا۔ اس کا ایک نمونہ تو پاکستان میں دنیا دیکھ ہی رہی ہے، جہاں اسلام کے سرکاری مذہب پر سب کا اتفاق ہے لیکن اس کی تعبیر و تعریف مختلف طبقوں اور مختلف پارٹیوں کی طرف سے اتنے مختلف انداز میں کی جاتی ہے کہ صاف طور پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ پیوپلز پارٹی کا اسلام اور ہے، مسلم لیگ کا اور ہے، جماعت اسلامی کا اسلام اور ہے، اور حکمران مسلم لیگ کا اسلام اور دیوبندی عقائد کے لوگوں کا اسلام اور ہے، بریلوی جماعت سے متعلق لوگوں کا اور۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک پر اسلامی نظام کے نفاذ سے زیادہ متنازعہ وہاں کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔

جن قوموں کے سیاسی نظاموں کو کامیاب اور مستحکم سمجھا جاتا ہے وہ بھی نظریاتی تضاد کا اس درجہ شکار ہیں کہ ان کے دعووں اور نظریاتی اعتبار

کا سارا معاملہ مشکوک دکھائی دینے لگتا ہے، مثال کے طور پر روس کے کمیونسٹ نظام میں جس کی بنیاد ہی مزدوروں کی پروتاریت اور اقتدار کے نظریہ پر قائم ہے اور جو مزدوروں کے ہڑتال اور زیادہ بہتر زندگی کے حق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، اس کے اپنے اور حلقہ اقتدار میں آنے والے ملکوں میں مزدوروں کو ہڑتال کا حق حاصل نہیں ہے، وہ ساری دنیا میں مزدور تنظیموں کی جدوجہد اور ان کے ہڑتال کے حق کی حمایت کرتے ہیں، لیکن لیخ والیسا کے ہڑتال کے حق کے مطالبہ کا جواب، وارسا میں نوچی کارروائیوں اور ٹینکوں کے استعمال کے ذریعہ دیتے ہیں، ساری دنیا میں قوموں کے حق خود ارادیت کی تائید کرتے ہیں لیکن ہنگری، پولینڈ، چیکوسلاویکیہ اور افغانستان کے لوگوں کو حق خود ارادیت دینے پر کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔ ان کے مقابلہ میں مغربی ملکوں میں جہاں مسادات، جمہوریت اور قوموں کو آمریت سے آزاد کرانے کا موقف اتنا مستحکم ہے کہ وہ اس کو جمہوری اور آزاد نظام کی کامیابی کا ثبوت اور اس کی ضمانت قرار دیتے ہیں، کمزور ملکوں کو ڈپومیسی، تجارت اور قرضوں کے جال میں پھنسا کر بے بس اور محکوم بنانے کے منصوبے دھڑلے کے ساتھ روبہ عمل لائے جاتے ہیں، اور ان ملکوں کی حقیقی نمائندہ حکومتوں کو گرا کر اپنی آلہ کار حکومتیں قائم کرنے کی سازش دن رات چلتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں جہاں سب طبقوں، تمام مذاہب اور تمام فرقوں کے لئے مساوی سلوک اور مساوی مواقع کے اصول پر جمہوریت قائم ہوئی تھی، تھوڑی دور آگے چل کر ہی، سیکولر ازم اور جمہوریت کا تصور اس لئے دھندلا پڑ گیا کہ لوگ پرانے جاگیردارانہ نظام سے اپنا ذہنی رشتہ توڑنے کے لئے تیار نہ تھے، اور حکومت کو بدستور، ایک ایسی چیز سمجھتے تھے، جو راجاؤں اور بادشاہوں کی طرح ہر اختیار اور ہر طرح کے وسائل کی بلا شرکت غیرے مالک ہو۔ اس جاگیرداری اور شہنشاہی ذہنیت

کالزمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو خود اپنی ملکیت سمجھنے کا تصور عوام سے مفقود ہو گیا، اور وہ حکومت میں شرکت کے جذبہ کے بجائے، حکومت کو اپنے سے الگ، بلکہ اپنے اوپر حاکمیت قائم کرنے والا ایک ادارہ سمجھنے لگے، اور اس طرح وہ ایک ایسے ذہنی کیفیت کا شکار ہو گئے جس میں حقوق کے مطالبہ اور مراعات کے حصول کا جذبہ غالب اور فرائض کا احساس اور ذمہ داریوں کا خیال اس طرح مغلوب و معدوم ہو کر رہ گیا کہ آج اس کا نشان تک بھی عوامی نقل و حرکت اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ کہنے کو تو ہندوستان میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قائم ہے لیکن عملی طور پر، اور ذہنی طور پر یہاں کے عوام اٹھارہویں صدی کے ماحول میں رہ رہے ہیں، اس ذہنی انتشار کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں عام انسانی زندگی، بے اطمینانی، بد نظمی اور ایسی مشکلات کا شکار ہو گئی ہے کہ کسی جگہ سکون اور دل جمعی کا نشان نہیں رہا۔

اسلام و سائنس

مولانا عبدالرؤف جھنڈا نگر (لاہور)

حق تعالیٰ نے انسان کو دماغ دے کر سیدھے اوکھچنے کی ضرورت نہیں۔ مگر تنہا دماغ کافی نہیں ہے کیونکہ اس کو علم کی ضرورت ہے۔ عینیت آنکھوں میں دیکھنے کی ندامت دی گئی ہے۔ مگر تنہا آنکھ کافی نہیں ہے کیونکہ اس کو خارجی روشنی کی ضرورت ہے۔ روشنی کے بغیر کوئی آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی۔ چنانچہ رات کے وقت ایک تاریک کمرہ میں آنکھ رکھتے ہوئے بھی کچھ بکائی نہیں دیتا۔ اگر بچوں کا بلب روشن کر دیا جائے تو ہر چیز صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح وحی الہی دماغ اور عقائد سے رہنمائی ہے، اس روشنی کے بغیر ہم تنہا دماغ سے اسرار کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ مناسبات کیسے ہیں؟ یہ کائناتی و ربی کون ہے؟ اور اس کائناتی نظام کا سلسلہ کب تک رہے گا؟ اس کا پیرائے کثیر کا مقصد کیا ہے؟ انسان کا فائدہ کس چیز میں ہے؟ نقصان کس چیز میں ہے؟ یہ سب باتیں وحی الہی سے معلوم ہوتی ہیں۔ علم الہی کے بغیر جو وہ حقائق اشیا معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ سب بھٹکتے رہتے ہیں۔

اس علم الہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا شناس بناتی ہے۔ ایک مثال پر غور کیجئے کہ ایک آدمی کو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود ہے لیکن وہاں روشنی نہ

لاٹ کا گزر نہیں ہے تو تاریکی میں اس کو اپنے چچا، استاذ، والد نظر نہیں آتے ہیں۔
 ہمارے اتفاق سے وہ لوگ بھی پلیٹ فارم پر موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اگر روشنی ہوتی
 تو سبھی لوگ نظر آتے اور وہ شخص ان کی مناسب تکریم و خدمت بجالاتا۔ اسی طرح
 دماغ کی روشنی علم الہی ہے اس علم و معرفت کے بغیر آدمی اپنے رب کی اطاعت و
 عبادت کو بجا نہیں لا سکتا کیونکہ وہ اپنے رب کو پہچانتا ہی نہیں تو احسانت و
 خدمت کیسے بجالا سکے گا اس لئے علم کی تحصیل ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی
 دعاؤں میں پڑھتے تھے: ”رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا“ (سورہ طہ) یعنی اے میرے رب میرے
 فہم و بصیرت میں علم کے ذریعہ زیادتی پیدا کر۔

اس قرآنی دعا کو ہم بھی اپنا وظیفہ بنائیں تاکہ صحیح علم حاصل ہو اور ہم خدا شناس بن سکیں۔ شیخ سعدی شیرازی نے کیا ہی خوب لکھا ہے کہ

چمے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتوان خدا را شناخت

علم کی فضیلت۔۔۔ وجدانی ہے | حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ علم کے محمود و مستحسن ہونے کا بیز خود وجدان سے ہو جاتا ہے چنانچہ دیکھئے کہ آپ جاہل مطلق ہوں لیکن آپ کو حسب واقعہ کوئی جاہل کہہ کر خطب کرے تو آپ کو برا لگے گا کہ دیکھو! میں شخص مجہد کو جاہل کہتا ہے۔ لیکن آپ کی جاہلیت کے باوجود کوئی آپ سے کہے کہ آپ بڑا اچھا علم رکھتے ہیں آپ کے علم و علم کا کیا ہونا۔ تو اگرچہ آپ جاہل مطلق ہوں پھر بھی اس کا یہ کہنا آپ کو اچھا معلوم ہوگا۔ کیونکہ اس نے علم کی طرف آپ کی نسبت کر دی اس لئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم کے انتساب کو ہر انسان اپنے لئے وجہ عظمت اور باعث فضیلت جانتا ہے۔

خدا شناسی | بغور دیکھئے! زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے اور ہوا، بارش وغیرہ کے فوائد و منفعت ہمیں حاصل ہو رہے ہیں، دنیا کی ایک معمولی سی چیز حتیٰ کہ ایک سوئی تک بھی ہمیں مفت نہیں مل سکتی مگر یہ ہماری عظیم الشان خدمت کرنے والے، سورج، چاند، ستارے ہمارے غلہ پکانے والے، اور اس میں دودھ، خوشبو، مزہ، رنگ وغیرہ ڈالنے والے سارے عملے ہماری مفت خدمت انجام دے رہے ہیں۔ شیخ سعدیؒ اسی حقیقت کی طرف توجہ دہانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کارند
تا تو نمانی یکف آری و بغفلت نہ خوری
ایں ہمہ از بہر تو سرگشته و فرمانبردا
شہ طر انصاف نہ باشد کہ تو فرمانبری

دنیا کا قاعدہ ہے کہ احتیاج طرین سے ہوتا ہے ہم دھوبی کے محتاج ہیں کہ وہ ہمارے کپڑے صاف کرے، دھوبی ہمارا محتاج ہے کہ ہم سے پیسے لے۔ ہم معمار کے محتاج ہیں کہ وہ مکان تعمیر کرے وہ ہمارا محتاج کہ ہم سے پیسے حاصل کرے۔ ہم ڈاکٹر کے محتاج کہ وہ ہمارا علاج کرے اور وہ ہمارا محتاج ہے کہ ہم سے پیسے حاصل کرے اس طرح کی صد ہا مثالیں ہیں۔ یہاں قاعدہ الٹ گیا۔ یہاں احتیاج! صرف ایک طرف سے ہے ہم ان تمام چیزوں، آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش وغیرہ کے محتاج ہیں۔ مگر یہ چیزیں ہماری ذرہ بھر محتاج نہیں ہیں۔ ہم نہ ہوں گے جب بھی یہ ساری چیزیں اپنے فیوض کو جاری رکھیں گی۔

دریغاکہ بے مایہ روزگار
برویدگان و باشگفتہ لالہ زار

یہاں انصاف کیجئے کہ جب ہم ایک سوئی اور ایک قلم بلا دام نہیں پاسکتے تو اتنی
 عظیم الشان اور ضروریات زندگی کی اتنی اہم چیزیں ہمیں مفت اس نیامنی اور پوری
 طرح کے نظم کے ساتھ بلا ناغہ کون دے رہا ہے ؟ حکومت سڑک بناتی ہے تو ٹیکس لیتی
 ہے۔ پانی کا انتظام کرتی ہے تو ٹیکس لیتی ہے۔ بجلی و روشنی فراہم کرتی ہے تو ٹیکس لیتی
 ہے۔ الیکٹرک پنکھوں کی سپلائی پر ٹیکس لیتی ہے۔ مگر چاند، سورج اور گھروں ستاروں
 کی روشنی اور فیوض پر اور آسمان کے مسلسل پانی اور باران رحمت کے نزول پر ہوا و
 کے سرد و خشک جھونکوں پر کسی قسم کا آج تک کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا تو جس ذات نے
 بلا عوض بلا ٹیکس یہ فیض جاری کر رکھا ہے۔ ہم اسی کو خالق کائنات رب العالمین اور
 خدائے برحق سمجھتے ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہتے ہیں۔ اور صرف وہی اطا
 کے لائق ہے ارشاد ہے : لَا تَسْجُدْ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدْ لِلَّهِ الَّذِي
 خَلَقَهُنَّ، ان کنتما ایماہ تعبدون (سورہ حم سجدہ) یعنی چاند سورج کی پرستش
 نہ کرو۔ بلکہ اس ذات کی پرستش کرو جس نے ان کو پیدا کیا۔ اگر تم اطاعت کرنا چاہتے
 ہو۔

مطلب یہ ہے کہ چاند سورج کے فوائد و فیوض کو دیکھ کر تم یہ نہ سمجھو کہ ان کے
 یہ ذاتی فیوض ہیں۔ بلکہ یہ فیوض و فوائد ان چیزوں میں ان کے خالق و مالک نے رکھا
 ہے اس لئے مستحق عبادت صرف ان کو خالق ہی ہے۔ کسی نے کیا ہی خوب
 لکھا ہے یہ ۔

خرد اور ادراک رنجور ہیں واں
 مہر و مہر ادنیٰ سے مزدور ہیں واں
 جہاں دار مغلوب و مقہور ہیں واں
 نبی اور صدیق مجبور ہیں واں

نہ پرستش ہے رہبان و اجبار کی اداں
نہ پرواہ ہے اختیارِ ابرار کی اداں

چاند و سورج کائنات میں خدا کے احکام کے تابع ہیں اور پھر کسی طرح بھی کوئی ذاتی اختیار نہیں رکھتے۔ خدا جب چاہتا ہے انہیں کہیں میں ڈال دیتا ہے۔ ان کی روشنی مدھم پڑھاتی ہے۔ یہ ان کے مخلوق و مملوک ہونے اور خالق کائنات کی عظمت و جلالت اور قدرت مطلقہ پر ایک واضح دلیل ہے۔

زمین کے فوائد پر غور | ارشاد باری ہے: وَاللّٰہُ صٰی فَرَشْنَا لَہَا فَنعٰمَ
الْمٰہِدٰوْنَ۔ یعنی ہم نے ہی زمین کو بچھایا ہے۔
اچھے ہموار کرنے والے ہیں۔

دیکھئے زمین نہ ہوتی تو رہائش و آسائش کے لئے ہمارے مکانات اور گومیاں اور ہلڈنگیں کس چیز پر کھڑی ہوتیں، زمین نہ ہوتی تو کہاں ہمارے کاروبار کے لئے ٹیکڑیاں، ملیں اور کارخانے قائم ہوتے۔ زمین نہ ہوتی تو کہاں ہمارے آسم کے مافوق ہوتے۔ انار، سیب، انگور، اخروٹ اور بادام وغیرہ فروٹ دیکھل کہاں ہوتے۔ ہوتے۔ زمین نہ ہوتی تو گلاب، چڑیل، جوہی وغیرہ کے درخت کہاں لگتے اور ہم وہ طرح طرح کے خوشبو، عطریات و زعفران کہاں سے حاصل کرتے۔ زمین نہ ہوتی تو ہمارے ٹھیکیاں کہاں ہوتیں۔ چاول، گندوں، مٹر، چنا وغیرہ اناج ہم کس طرح حاصل کر سکتے۔ زمین نہ ہوتی تو ہمارے کنویں، پوکھرا، تالاب، آبشار کہاں ہوتے؟ ہم کو اور ہمارے جانوروں کو پانی کہاں سے میسر آتا؟ پھر اس سے حاصل کردہ بجلی کیسے مل سکتی؟ جس سے سارے کارخانوں اور ملیوں میں رونق ہے۔ زمین نہ ہوتی تو مریضوں کے اسپتال، شفاخانے کہاں ہوتے؟ اور دوائیں کہاں رکھی جاتیں، آپریشن روم کہاں ہوتا؟ مریضوں کے بستر کہاں لگتے؟ اور پھر یہ زمین نہ ہوتی تو ہماری دواؤں کے لئے جڑی بوٹیاں

کہا۔ یہ ہوتی ہے اور دواؤں پر کام آنے والے پھل، پھول، پتے، پتیاں، سنبلیلی، شیب
برگ، سنار، شامبہرہ وغیرہ کس طرح حاصل ہوتے۔ یہ زمین نہ ہوتی، تو علمی کارخانے،
سائنسی لیبرٹری، اور یہ یونیورسٹیاں، دارالعلوم اور کالجز، اور اسکول کہاں قائم
ہوتے؟ زمین نہ ہوتی تو ڈاک خانے کہاں قائم ہوتے اور اخبارات و رسائل
دنیا بھر میں کیسے بھیجے جاتے؟ زمین نہ ہوتی تو اسٹیشن کہاں اور کس پر قائم ہوتے
اور پورے ملک میں ہم سفر کسے ثابت کرتے؟

یہ زمین نہ ہوتی تو ہوائی جہازوں، ٹرکوں، ٹرینوں، پہلی کو پٹریوں کے لئے ہوائی
کے لئے باتے؟ اور ہم بین الاقوامی سفر اور ملک غیر کی سیاحت کیسے کرتے؟
یہ زمین نہ ہوتی تو ہمارے عدل و انصاف کے لئے عدالت گاہیں، اور سرکاری عمارت
کہاں قائم ہوتی؟ زمین نہ ہوتی تو ہمارے اکتفا فات و ایجادات، تحقیقات اور ریسرچ
کے لئے محفوظ کمرے اور محل کہاں قائم ہوتے؟ اور یہ زمین نہ ہوتی تو گائے، بھینس
اور مویشیوں کے لئے چراگاہ کہاں ہوتیں؟ اور گھاس و چارہ کی چیزیں کہاں میسر
ہوتیں؟ پھر دودھ، کھویا، بالائی، مکھن اور گھنٹی جیسی نعمتوں سے ہم محروم ہی رہ جاتے۔
زمین نہ ہوتی تو ٹکڑی وغیرہ کے درخت کہاں لگتے؟ اور پھر ہماری عمارتیں کیسے بنیں؟
اور ہل چلانے کے لئے ہم ٹکڑی کہاں سے لاتے؟ زمین نہ ہوتی تو ہم بوا کہاں
سے حاصل کرتے؟ کھیتی کے لئے آلات ٹریکٹر وغیرہ کس سے بنتے؟ ہماری عمارت
کے لئے گارٹر وغیرہ کس چیز سے بنتے؟ اگر یہ زمین نہ ہوتی تو ہم ربڑ کہاں سے حاصل
کرتے اور ربڑ کی یہ ساری مصنوعات، ٹائر، ٹیوب وغیرہ کیسے میسر آتیں؟ اگر یہ زمین
نہ ہوتی تو ہم تیل، پٹرول وغیرہ کیسے پاتے؟ یہ سارے خزانے تو زمین کے پیٹ میں
دفن ہیں ان کے بغیر ہمارے گھر کیسے ہوتا؟ اگر یہ زمین نہ ہوتی تو یہ پیاز کس پر قائم
ہوتے ہوتے اور طرح طرح کے پتھر سنگ موسیٰ و سنگ مرمر وغیرہ ہم کہاں سے

حاصل کرتے ہیں جن پر آج اچھی اچھی عمارتوں کی رونق و قوت ہے۔ اگر زمین نہ ہوتی تو ہم دنیا بھر کے انجنوں، کارخانوں اور مشینوں کے لئے کوئلہ کہاں سے پاتے؟ جبکہ کوئلہ کا سارا خزانہ زمین کے بطن میں دفن ہے۔ زمین نہ ہوتی تو ہم روٹی کہاں سے حاصل کرتے اور ہمارے کپڑے کیسے بنتے؟ زمین نہ ہوتی تو ہمارے بھیڑ و دنبے کہاں پرورش پاتے؟ اور ان کے بغیر ہم ادنیٰ کپڑے کیسے تیار کر سکتے؟ زمین نہ ہوتی تو ریشم کے کپڑے کہاں پیدا ہوتے؟ اور ان کے بغیر ہم ریشمی کپڑوں کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اگر زمین نہ ہوتی تو سونا و چاندی کی کان اور یلی و گہر کے معدن کہاں ہوتے؟ اور سارے عالم میں جو کاروبار روپیوں اور اشرفیوں کے ذریعہ چلتے ہیں وہ کس طرح انجام پاتے؟ اگر زمین نہ ہوتی تو یہ کانغذ کے درخت اور اس کے کچے سامان کہاں بنتے؟ اور پھر کانغذ کے بغیر ساری دنیا میں علمی و تصنیفی کاموں کا کس طرح کال ہوتا؟ اور آج ہزاروں لاکھوں اوراق جو طرح طرح کے کانغذوں پر چھپتے ہیں ان کا کس قدر فقدان ہوتا؟

الغرض زمین نہ ہوتی تو سارے عالم کی رونق ہی یکدم کا فور ہو جاتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس زمین کو کس نے بنایا۔ کس نے اس کا فرش بچھایا؟ کس نے اس کو ڈانواڑوں اور اضطراب سے محفوظ رکھا اور پرسکون بنایا؟ ہم اس بنانے والے فاطر السموات والارض کا نام خدا رکھتے ہیں۔ سچ فرمایا ہے خدا تعالیٰ نے وَفِي الْأَمْثَانِ آيَاتٌ لِّلْمُؤْتِنِينَ۔ یعنی اصحاب علم و یقین کے لئے زمین ہی میں معرفت رب کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ آج کے سائنس دانوں میں بایں ہمہ اکتشافات و ایجادات یہ طاقت نہیں ہے کہ خدائی کائنات سے کچھ لئے بغیر صرف ایک چٹکی دھول بنا دیں۔ یا ایک گز زمین ہی بنا کر دکھا دیں۔ ہرگز نہ کبھی بنا سکے ہیں اور نہ بنا سکیں گے۔ اس کا خالق صرف خداوند کریم ہے اور وہ رب العالمین بھی ہے۔

لیکن زمین میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ انار، سیب،
علت موثرہ زمین نہیں | گلاب اور موتیا پیدا کرے۔ رنگ برنگ کی چیزوں
 اور مختلف خواص کی دواؤں کو پیدا کرے۔ ان تمام پیداواروں کے لئے زمین علت و
 سبب موثر نہیں ہے بلکہ زمین تو صرف ایک معدن و مخزن ہے اور منبع و مخرج ہے
 نہ کہ علت و سبب، اصل سبب موثر تو خدا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ شکر
 بنانے والی مشین سے صرف شکر برآمد ہوگی۔ اور بسکٹ والی مشین سے صرف
 بسکٹ اور کانڈ ساز مشین سے صرف کانڈ برآمد ہوگا ہے۔ لیکن یہ زمین تو مختلف
 اجناس، مختلف پھول، مختلف پھل، مختلف رنگ اور مختلف خواص کی چیزوں کو
 جنم دیتی ہے۔ کسی عارفِ خدا نے زمین کے اس خاصہ کے متعلق کیا ہی خوب
 لکھا ہے یہ

چرا در یک زمین چندین نبات مختلف بنم
 ز نخل و انار و سیب و بید و چوں آبی و چوں زوئی
 اگر علت طبائع شد وجود حلقہ را چوں شد؟
 یکے تمسک یکے نہیں یکے دارو یکے طاعون

معلوم ہوا کہ ان مختلف پیداواری کے لئے زمین علت موثرہ نہیں ہے بلکہ ایک
 اور ہی طاقت ہے جو زمین کے لپٹن سے مختلف اجناس اور مختلف ذائقوں مختلف
 قابلیتوں اور مختلف منافع کی چیزوں کو پیدا کرتی ہے۔ اسی کا نام ہم خدا رکھتے ہیں۔
 سائنس کی بنائی ہوئی مشینوں میں ایک من گیہوں یا چنا
قدرت کا کمال | یا میٹر ڈال دیجئے تو ایک من آٹا نکال کر دے گی۔ لیکن
 خداوندِ کریم کی ایک زبردست و پر حکمت مشین ہے اس کا نام زمین ہے اس میں
 ایک دانہ ڈال دیجئے تو سینکڑوں دانے باہر نکال دیتی ہے۔ ایک من دانہ

ڈال دیجئے تو سینکڑوں من دانہ پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے :

مثل الذين ينفقون اموالهم في سبيل الله كمثل حبة

انبتت بطلع سنابل في كل سفينة مائة حبة والله

يُضَاعَفْ لِمَنِ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (سورة بقره)

یعنی ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے راہ میں خیر کرتے ہیں اس واسطے کہ

طرح ہے جس کے اس دانہ سے اتارے یوں کہ، گویا: اور ہر بالی میں سودا نہ ہے

اور کمال تک پہنچتا ہے اس سے بھی بڑھا دیتا ہے اور اللہ بڑی

وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

پوری خلق خدا اس کی زمین سے ہمیشہ برا فائدہ اٹھا رہی ہے اور ساری

مخلوقات کی زندگی اور شاہ و گدا کے غیش کا ہر زمین اس بے نیاز پیداوار

اور بے حد و بے حساب خیر و برکت پر ہے اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

کون لایا کھینچ کر پتھیم سے یاد سازگار ہوا۔

یہ زمیں کس کئی چوکس کا ہے : آفتاب ؟

یالتا ہے بیچ کوٹھی کی تاری می تیرے خون ۶

کہیں دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے خواب؟

موتیوں سے کس نے بھر دی خوشہ گندم کی جیب؟

یہ سب کچھ کس نے سکھایا ہے خوں انقلاب؟

وہ خدا، یا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آباؤ کی ماہی تیری نہیں میری نہیں

پھاڑوں کے بطن سے زور و شور کے ساتھ دن رات بہنے والے چشمے

یہ ناپید کنار سمندر، یہ فلک بوس اور عظیم المنافع سپار اور قدرت کے

خزانوں سے یہ مال مال جنگلات، یہ پٹرول کے چھتے، یہ سونے، چاندی کے دفائن ارض
سب خدا کی بے پناہ بخشش اور انعام اور بے حد و بے حساب فیاضی کو یاد دلانے کے لئے
کافی دانی ہیں ان فی ذالک بعبرة لا یؤی الا بصار۔

تخلیق انسانی پر غور | ارشاد ہوتا ہے: **وَفِیْ نَفْسِکُمْ اَفْلاٰ تَبْصِرُوْنَ** یعنی
اپنے نفسوں میں غور کیوں نہیں یعنی آدم کو خدا نے مٹی سے
پیدا کیا اور اپنی قدرت سے اس میں روح ڈالی اور حضرت حوا کو پیدا فرما کر پھر ماں باپ
لے لطف سے انسان کا سلسلہ قائم کیا۔ مقام غور ہے۔ اور خاص طور پر جدید دنیا کے
لئے بھی ۔۔۔۔۔ جو موٹر، ہوائی جہاز، ٹر، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ ایج ڈکڑا ہے
کہ یہ سب چیزیں انسان کی پیدائش اور اس کی کاریگری کے مقابلہ میں سچ ہیں۔ موٹر یا
ہوائی جہاز یا دوسری مشینوں اور انجنوں وغیرہ میں نوہے وغیرہ کے ہزاروں پیرزوں
کو پیٹ پاٹ کر، ڈھال ڈھول کر اور مختلف مقامات میں جوڑ جاڑ کر پٹرول اور ڈیزل
اور کروڈائل وغیرہ اس کی نالیوں میں پھونکا اس کو دوڑایا، چلایا اور اڑایا کرتے
ہیں۔ یہ سب انسانی صنعت ہے۔ تیار ہوتی ہیں اور ان کے پائلٹ پیرزوں کے خراب
ہونے پر دوسرے پیرزے برا کر کام نکالا کرتے ہیں۔ مگر مٹی کے ایک ٹولہ اپنے ٹولہ
پانی پر اس طرح کاریگری کرتا اور اس کے تمام اعضاء و لوازمات کے ساتھ جیتا جاگتا
انسان بنانا قدرت کا شاہکار ہے۔ ذرا دیکھئے کہ مٹی کے لطف میں سے سر کی کھوپڑی
بناؤ۔ کتنی سخت ہڈی ہے اور اسی لطف سے سر کا بیجہ اور دماغ کی گودی بنائی جو کتنی
نرم و لکڑی ہے۔ پیر دماغ میں سمیڑواں تاروں کا کنکشن ڈالا اور اس میں چمکتی ہوئی
آگ بناؤ پھر اسی لطف سے بونے والے ہلبل ہلبل ہزار داستان زبان بنائی۔ حرکت و افق
کے زیر و زبر پہنچانے کے لئے دو ہونٹ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم ارشاد
کاریجوں کو یاد دلانے ہوئے فرمایا: **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی عِیْنِہِیْنَ وَ اَمْسَانِہِیْنَ وَ شَفَقَتِہِیْنَ**

یعنی کیا ہم نے اُن کے لئے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے ایک اور جگہ ارشاد ہے: انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج فیتلیہ فنجعلناہ سمیعاً بصیراً (دھر)

یعنی ہم نے انسان کو مرکب القوی نطفہ سے پیدا کیا کہ اس کی آزمائش کریں پس ہم نے اس کو دکھینے والا اور سننے والا بنایا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس نطفہ سے خدا نے دل، جگر، گردہ، مثانہ بنایا۔ اس نطفہ سے معدہ کے دیگر تمام اعضاء و احشاء بنائے اور اس میں اتنی رگ اور باریک نسیں اور ریشے بنائے جن میں روزانہ خون جذب ہوتا ہے اگر ان تمام رگ و ریشوں کو ایک قطار میں کر دیا جائے تو بقول ایک فرنگی محقق کے نو سو اسی مین لمبی لائن تک یہ پہونچ جائے گی۔ پھر اسی نطفہ سے اعضاء ریشہ بنائے۔ وہ دل بنایا کہ اگر وہ بگڑ جائے تو دوسرا دل نہ بنایا جاسکے اور اگر اس کی حرکت بند ہو جائے تو پھر اس میں حرکت نہ پیدا کی جاسکے۔ اعضاء ریشہ کے علاوہ دوسرے اعضاء کا بھی یہی حال ہے اگر آنکھ ضائع ہو جائے تو دوسری آنکھ نہ مل سکے۔ اگر زبان گونگی ہو جائے تو دوسری زبان نہ بن سکے۔

الغرض ایک تولہ ڈیڑھ تولہ منی کے نطفہ میں خالق اکبر نے تمام ضروری طاقتوں اور صلاحیتوں کو پیدا فرمایا پھر خدا نے چاہا تو نہ بنایا اور چاہا تو مادہ بنایا چنانچہ ارشاد ہے: السمیٹ نطفات من منی یمنی ثم کاد، علقۃ فخلق فسوی فنجعل منہ الزوجین الذکر والانشی الیس ذالک بقادراً علی ان یحیی الموتی (سورہ یس) یعنی کیا انسان کو منی کے نطفہ سے نہیں بنایا جو پہلے گوشت کا ٹوٹھرا بنا پھر اس میں تمام اعضاء کو پیدا کیا پھر اس کو سیدھے قد کا بنایا پھر اس سے نرم مادہ کے جوڑا حسب منشاء بنایا۔ پھر ایسا زبردست کاریگر اور قادر مطلق کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے کے بعد پھر انسان کو زندہ کرے۔ شیخ سعدی نے: الخلق انسانی پر

کیا خوب لکھا ہے ۔

دید نطفہ را صورتے چوں پری

کہ کردہ است بر آب صورت گری؟

ازاں قطرہ لولو لالہ کند

وزیں صورتے سرو بالہ کند

پانی پر یہ بے مثال کاریگری خدائے مطلق کے علاوہ کیا کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟
حاشا وکلا۔

نطفہ تخلیق انسانی کے لئے علت مؤثرہ نہیں | اس نطفہ سے انسان ضرور ہی پیدا ہو جائے ایسا ضروری

نہیں ہے کیونکہ اصل سبب مؤثر خود اللہ تعالیٰ اور اس کی مشیت ہے ایسا دیکھا گیا ہے کہ باہم نطفہ ملتا ہے مگر نہ لڑکا پیدا ہوتا ہے اور نہ لڑکی اور کبھی دونوں پیدا ہوتے ہیں اور کبھی صرف لڑکا اور کبھی صرف لڑکی۔ چنانچہ ارشاد ہے :

لله ملك السموات والارض يخلق ما يشاء ويهب لمن يشاء

انث ويهب لمن يشاء الذكور او يزوجهم ذكرا نثا وانثا نثا

ويجعل من يشاء عقيماً (سورہ شوری)

یعنی خدا ہی کے لئے زمین و آسمان کی بادشاہت ہے اور جو چاہتا ہے پیدا

کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکا

ہی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا کرتا

ہے اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔

پھر یہ نطفہ تمام اغضار کی سلامتی کا نفاذ بھی نہیں ہے کیونکہ انسان کبھی اندھا اور کبھی بہرا اور کبھی ٹولا، سنگڑا، بھی پیدا ہوتا ہے اور کبھی کبھی کچا لوتھڑا بن کر ساقط

ہو جاتا ہے اور کبھی بے جان اور مردہ پیدا ہوتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ لطفہ روت کے لئے یا جسمانی اعضاء کی صحت و سلامتی کے لئے موثر نہیں ہے بلکہ موثر اس کی مشیت ہے۔

کائنات عالم کے لئے انسان کی ضرورت | میٹر، ہوائی جہاز، تار، ٹیلیفون، ٹرین، سب بے کار اور ایک قائم معطل ہو جائیں۔ اگر ان کا بنانے والا انسان امدان کو حرکت میں لانے والا انسان درمیان سے حذف ہو جائے۔

انسان جس روز صفحہ ہستی سے ختم ہو جائے گا تو یہ تمام مصنوعات، ایجادات اور کارخانے، مشینیں، نیکٹریاں، سب لغو محض ہو جائیں گی۔ اور غور کیجئے ایک مثال کو سامنے رکھئے۔ ٹیلیفون سے آپ بات کرتے ہیں۔ اور مدراس میں بیٹھ کر کلکتہ بمبئی سے گفتگو کر لیتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں کہ سائنس کے کمال سے آپ کو کس قدر فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن قدرت کے عطیہ کو بالائے طاقت رکھ کر قدرت کی اس عظیم کاری گری کو بھول جاتے ہیں۔ سوچئے کہ اگر طرزیں سے بولنے والی زبان اور سننے والے وہ کان نہ ہوں تو وہ ٹیلیفون بے کس کام کا۔ ٹیلیفون آپ کی میز پر رکھا ہوگا اور کسی کام کا نہ ہوگا۔ مگر جب آپ ہاتھ سے اٹھاتے ہیں اور ہیلو، ہیلو اپنی زبان سے پکار کر اپنے کان سے اس کی بات سنتے ہیں تو یہ ٹیلیفون کا رآمد بن جاتا ہے اور دونوں طرف سے زبان کان اور ہاتھ اور دل کا ارادہ اور دماغ کی سلامتی کام کر رہی ہے جو قدرت کے ان شاہکاروں پر غور کرے گا اُسے یہ ایجادات عام متحیر نہیں کر سکتیں۔ اکبرانہ آبادی مرحوم نے کیا ہی خوب لکھا ہے۔

جو ہے محوتاروں کی چال کا اسے انجنوں کا خیال کیا
وہ نظر زمین پہ کیوں جھکے، کہ جو آسماں سے قریب ہے

معلوم ہوا کہ کائناتِ عالم کے لئے خود حضرت انسان بھی بیکر ضروری مخلوق ہے۔
 دراصل انسان نہ ہو تو ایک ذرا سا کام بھی موجودہ صنعتی و مشینی دور میں
ایک تمثیل انجام نہ پاسکے۔ ان اگر درمیان سے اکٹھا جائے تو دنیا و مافیہا کے
 سارے کارخانے بیکار، فلائی راکٹوں کی اڑان ختم، چاند تک رسائی بے معنی۔
 کسی نے یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ شاہجہاں کے پاس دو کنیزیں تھیں ایک کا
 نام ”جہاں“ تھا دوسرے کا نام ”حیات“ تھا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم دونوں میں
 سے میرے لئے زیادہ کارآمد کون ہے۔ جس کا نام ”جہاں“ تھا اس نے بر محل عرض کیا اے
 تو بادشاہ جہانی جہاں بکار آید۔

دوسری کنیز نے جس کا نام ”حیات“ تھا فی الفور کہا ع
 اگر حیات نہ باشد جہاں چہ کار آید
 بظاہر یہ ایک لطیفہ ہے مگر اس میں حقیقت کا ایک خزانہ پنہاں ہے۔ دنیا میں
 سب کچھ ہو مگر انسان نہ ہو تو ان چیزوں کو برتنے والا ان کو استعمال کرنے والا ان سے
 فائدہ اٹھانے والا اور ان کو کارآمد بنانے والا کون ہوگا؟

سائنس نے کوئی بنیادی چیز پیدا نہیں کی | اب اس پر بھی غور کیجئے کہ خداداد کریم
 نے غلہ، اناج، گیہوں، مٹر، چنا، چاول
 دال، تیرہ پیرا کیا، مگر سائنس والے اب تک کوئی غلہ نہ بنا سکے، خداداد کریم نے انار،
 سیب، موسمی، کیلا، اخروٹ اور بادام لپتہ، فروٹ وغیرہ بنایا ہے۔ طرح طرح کے
 مغزیات دنیا کو عطا فرمائے ہیں۔ سائنس دانوں نے اس قسم کا کوئی نیا پھل اور مقویات
 مغزیات میں سے کوئی نئی چیز تیار نہیں کی۔

دنیا کے یہ معروف غلے اور یہ فروٹ چھوڑ کر سائنس والے اپنے ایوانِ زبردہ کسی پھل
 اور کسی بنائے ہوئے غلے کی نشاندہی تو فرمائیں۔ یہ نہ ان کے دائرہ اختیار کی چیز ہے

اور نہ کسی ایسی چیز کی تخلیق کے لئے ان کا دعویٰ ہے۔ خالق کائنات نے ایسا دعویٰ کیا ہے اس کو اس کا حق بھی ہے: فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ، اَنَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا، ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا، فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعُشْبًا وَقَضْبًا وَرَنَاتِيمُونَ وَخَلَقْنَا لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعَ كَثِيرًا وَلَعَلَّكُمْ تُسْمِعُونَ (یعنی آدمی کو اپنے کھانے کی طرف دیکھنا چاہیے کہ ہم نے زمین پر پانی ڈالا اور پھر زمین کو پھاڑ دیا پھر ہم نے اناج کے دانے اگائے اور انگور، ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اگائے اور گھنے بانگات، میوہ جات اور چارے پیدا کئے جس میں تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے لئے فائدہ ہے۔)

پھر جب قدرت کے عطا کردہ غلوں اور اس کے پیدا کردہ پھلوں اور مقویات فواکھات کو ہم کھاتے اور انھیں سے فائدہ اٹھاتے ہیں پھر تو ہم کو اس کے سامنے سر نہیلا سر عبودیت خم کرنا چاہیے اور صاف صاف شکریہ ادا کرنا چاہیے اور اس کی آقائی کا دم بھرنا چاہیے۔

تیرا دیا کھاتا ہوں میں تیری ثنا گاتا ہوں

تیرا ہی کہلاتا ہوں میں تجھ پر نہیں کوئی ہرا

دنیا میں کبوتر، مرغ، تیر، بٹیر اور دوسری چڑیوں کے علاوہ ختی و دینے وغیرہ کے گوشت مردج ہیں، پھلی وغیرہ بھی میسر ہے۔ کیا کسی سائنس دان نے بھی کوئی گوشت ایجاد کیا ہے۔؟

(باقی)

عربی ادب میں ہندوستانی فضا

(۲)

مولوی سید محمد ضیاء الدین شمس طہرانی لکچرار شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نویں صدی ہجری کے مجدد امام جلال الدین سیوطی نے ہندوستان کے کئی لفظوں کا استعمال قرآن میں ثابت کیا ہے۔ ان میں یہ تین لفظ خصوصی اہمیت کے مالک ہیں:

یہ پیپل کا معرب ہے۔ عربی میں اس سے نعیض بھی بنائے گئے ہیں۔ مثلاً فِلْفَل۔ مفضل اس چیز کو کہتے ہیں جس میں فلفل کی خوشبو ملائی گئی ہو۔ عربی ادب میں اس لفظ کا استعمال بہت کثرت سے ہوا ہے۔ امر القیس کہتا ہے:

كَأَنَّ مُكَابِي الْجَوَائِدِ عَدِيَّتًا
صَبَحَنَ سُرًا فَا مِنْ رَجِيحٍ مُفَضَّلٍ

یعنی مقام جوار کی مرغابیاں ایسی حواس باختہ تھیں گویا ان کو کالی مرچ ملی ہوئی بہترین صبو جی پلائی گئی ہے۔

یہ ساگوں کا معرب ہے جو ہندوستان کی بہترین عمارتی لکڑی سمجھی جاتی ہے۔ اس کا استعمال قدیم زمانے سے عرب میں ہوتا تھا۔ احادیث سے

اس کا ثبوت ملتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اس لکڑی سے بنا ہوا سامان استعمال فرمایا ہے۔
تابعہ شیبائی کہتا ہے نہ

وَقَبَّةٌ لَا تَكَادُ الطَّيْرُ تَبْلُغُهَا

اعلیٰ محاربہا بالساج مسقوف

یعنی اس قبہ کی بلندی کو پرندے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے اونچی محراب پر ساگونان کی چھت بنی ہے۔

یہ لفظ کٹھ کا مغرب ہے اسے کُسط اور کشت بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی مشہور **قسط** دوا ہے جو عرب میں بھی مشہور تھی اور بکثرت استعمال کی جاتی تھی۔ احادیث میں اس کے بہت سے نفع نائل و فوائد درج ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس کے استعمال کو تاکید کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے تجارتی کشتی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ

فَقَدْ اَوْفَرْنَا مِنْ قِطْطٍ وَمِثْلِهَا

وَمِنْ مِثْلِهَا مِنْ سِلَاحٍ

یعنی یہ کشتیاں بھاری مقدار میں قسط، عود، مشک اور اسلحہ لائیں۔

یہ تاڑی کا عرب ہے۔ یہ تاڑی عرب میں بھی ہوتی تھی مگر بن خرداذبہ کی **داڑی** تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند سے بھی تاڑی عرب میں جاتی تھی۔ ایک عرب شاعر نے اس کا ذکر یوں کیا ہے کہ

شَرِبْنَا مِنَ الدَّانِي كَانَتْ

مَلُوكُ لَدَى الْعِرَاقِيْنَ وَالْبَحْرِ

یعنی ہم نے یوں تاڑی پی کر نشہ میں بادشاہ بن گئے اور عراق عرب اور عراق عجم اور سمندر ہمارے قبضے میں آ گئے۔

ان افغان کے اشغال کے علاوہ عرب شعراء نے ہندوستان کے مقامات و احوال پر شعراء کہے ہیں اور اس ملک کی ہمہ گیر فضا کی بڑے ہی دلکشر انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ اس سلسلے میں غالباً سب سے پہلا شاعر فرزدق ہے جس نے حاکم سندھ تیم بن زید ثنی کے پاس ایک سپاہی کے بارے میں منظوم سفر نامہ لکھی تھی۔ جب اس دور کے مشہور شاعر ابو اعتابہؒ نے بھی اپنے دو شعراء ہیں سندن ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ابو عبادہ بختریؒ (۲۸۴ھ) نے سندن بیاس اور بجا سوں کا تذکرہ کیا ہے۔ حکم بن عمرو تغلبی اور اعشی بھرائی نے مران اور بندہ سندرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابوالفتح سندھی جس نے بغداد میں زندگی گزاری اور وہیں انتقال کیا، ایک نظم لکھی ہے جس میں سرزمین ہند کا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ابو الفتح کی عنایت کی دلیل یہ ہے کہ وہیں اس کو ہند کے بزرگ و عترت کا اعتراف کیا ہے۔ ابن الجراح نے کتاب الوردہ میں ۶۹۸ھ منسوب و ممتاز عربی کے شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں ابو الضلع کا چالیسواں ہے۔ قزوینی نے ہندوستان سے متعلق اس کے مندرجہ ذیل اشعار آثار البلاء میں درج کئے ہیں (ص ۸۵) سے

انکرا عجبانی وما ذالک بالامثل
انما مباح انہند و سیم الہند فی المقتل
تموز الف من اذ انقطر بھارینزل
بیمیر الائم والیا قوت والذائم من یعطل
نیر المسک والکافور والعنبر والسنبل
واصف من الطیب یتعطل من نبطل
ومہر العجاج والساج ومنہر الوداد
والنور والیافیہ کمثل الجبین لا یصل

وفیه الداء صینی و فیہ نبت الفلفل
ومنها الببر والنمر ومنہا الفیل والداء قتل
ومنها الکوک والبغاف والطاوس والحجوزل
ومنها شجر الرائح والتاسم والفلفل
سیوف ماہما مثل قد استغنت عن الصیقل
اس ماح اذا ماہزت اهتز لہ والنجف

فہل ینکر ہذا الفضل

الا الرجل الا خطل

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ جب میدان جنگ میں ہندوستان کی او
اور اس کے سامان کی تعریف کی گئی تو ہمارے دوستوں نے اسے ناپسند
کیا لیکن ان لوگوں کی ناپسندیدگی بالکل نامناسب تھی۔

زندگی کی قسم یہ تو ایک ایسی سرزمین ہے کہ یہاں کی بارش کا ہر قطرہ
زیور سے محروم انسانوں کے لئے یاقوت، موتی اور شیریں دودھ کی
شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہندوستان مشک، کافور اور صندل کا خزان
ہے۔ یہاں عذرا اور عود پیدا ہوتا ہے اور طرح طرح کی خوشبودار
چیزیں یہاں پیدا ہوتی ہیں اور ان لوگوں کے کام آتی ہیں جنہیں
ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ہاتھی دانت، جائے پھل، غود، صندل
اور توتیا کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہاں سنیر، بہر، جھتیا، ہاکھی،
بھالو، سارکس، طوطا، مور، اور کبوتر بھی (کثرت سے) ہوتے ہیں
یہاں ناریل اور آبنوس کے درخت اور سیاہ مچوں کے پودوں
کی فراوانی ہے اس ملک کی تلواریں بے نظیر ہیں جنہیں صیقل نگر کے

ضرورت نہیں ہوتی اور یہاں ایسے نیزے بنے ہیں جن کے استعمال سے بڑی بڑی فوجیں بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔“

عربی کے مشہور شاعر ابوالعلا معری سے متعلق ڈاکٹر طرہ حسین مصری نے ایک محققانہ کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ وہ بھارت کے اکھنڈ امنسا وادی اصولوں سے بہت متاثر تھا۔ وہ گوشت مطلقاً نہ کھاتا اور اکثر برت رکھا کرتا تھا۔ اس نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ اسے مرنے کے بعد دفن نہ کیا جائے بلکہ ہندوؤں کی طرح جلایا جائے۔ عربی ادب کے امام جاحظ نے ایک رسالہ گوروں اور کاؤں کے متعلق لکھا ہے اس میں اس نے اہل ہند کے خصائل و شمائل، ان کے علوم و فنون اور ان کی صنعت و حرفت کا تذکرہ نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے :

”میں جانتا ہوں کہ اہل ہند نے ظلم، یاہنی و ہبت و نجوم میں بہت ترقی کی ہے۔ علم طب میں بھی ان کو گور کر کر حاصل ہے اور اس علم کے مخفی رازوں سے وہ، چھٹی طرح واقف ہیں۔ مشکل امراض کے علاج میں وہ بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ سنگ تراشی، معماری، مصوری اور دوسرے فنون میں انہیں آخری درجہ کا کمال حاصل ہے۔ ان کی بنائی ہوئی رنگین تصویریں مہراب اور دوسری عمارتوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں شطرنج کا اعلیٰ درجہ کا کھیل رائج ہے۔ اس کے لئے دوسرے کھیلوں کی بہ نسبت عقل و فہم کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ یہ رنگ نہایت عمدہ چمکدار تلواریں بناتے ہیں۔ وہ بہترین مشیر باز ہیں اور اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ انہیں ایسے منتر معلوم ہیں جن سے جسم سے زہر کے آثار دفع کئے جاسکتے ہیں اور جسمانی درد اور رکھ بکا علاج کیا جاتا ہے۔ ان کا فن موسیقی بہت ہی دلنریب ہے۔“

ان کے ایک باجے کا نام کنکولا ہے۔ یہ باجا کدو پر صرف ایک تار لگا کر بنایا جاتا ہے اور ستار اور جھانجھ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں مختلف قسم کے ناچ مروج ہیں۔ نیزہ بازی میں خاص کمال حاصل ہے۔ یہ لوگ فن سے بھی واقف ہیں۔ ان کا ایک خاص رسم خط ہے، جو مختلف زبانوں کے حروف سہمی پر مشتمل ہے۔ اس رسم خط کے علاوہ دوسرے متعدد رسم خط بھی رائج ہیں۔ ان کے ادب میں طویل نظموں اور خطبوں کی کثرت ہے۔ فلسفہ اور ادب سے انھیں خاص ذوق ہے۔ کتاب کلید و دمنہ (جو دراصل پنج تنتر کا ترجمہ ہے) ان ہی سے ہم لوگوں کو ملی ہے۔ غرض یہ لوگ نہایت طبائع اور مستعد ہوتے ہیں۔

(رسائل الجاحظ ص ۱ طبع مصر ۱۳۲۲ھ)

جاحظ کے اس اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عربی ادب میں ہندوستانی فضا کی رنگارنگی کا تصور کس قدر وسیع دہمہ گیر ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں کی فضا عربی ادب پر براہ راست اثر انداز ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے رسم و رواج، فلسفہ، تہذیب و تمدن، ادب پر اور اہم شخصیتوں پر عربی میں مضامین کتابیں اور نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ یہاں کی اکثریت مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، رابندر ناتھ ٹیگور، اقبال اور اندرا گاندھی کا احترام کرتی ہے اور ان کے افکار و تاثرات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔

تنبیہ الغفول ایک تعارف

جناب محمد امین مدنی، ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی، اسلام یونیورسٹی علی گڑھ

مؤلفہ "تنبیہ الغفول فی اثبات اسلام آب و المرسل" کے مصنف، قاضی ارغٹا علی خاں خورشید، انیسویں صدی کے ایک متحرک عالم اور باذوق فرد و شاعر ہیں۔

قاضی صاحب کی پیدائش قصبہ گوپا، موہن پور ضلع، ہریانہ، ہوتی، اور وہ اسے ایک علم گھرانے کا نام لے سکتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء مطابق ۱۳۰۷ھ میں ہوئی۔ علوم دینیہ کے علاوہ قاضی صاحب کو بنیادی علوم پر بھی عبور حاصل تھا۔ نیز آپ ایک صاحبِ نثر، ادیب اور اچھے عربی و فارسی شاعر بھی تھے۔ آپ کی متعدد علمی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے جس موضوع پر لکھا اس میں اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ علوم ظاہری و باطنی کی تمیز کے بعد آپ اپنے والد قاضی مصطفیٰ علی خاں بہادر فاروقی کے پاس مدرس چلے گئے تھے، جہاں ایک عرصہ تک درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ آپ کی لیاقت کو سراہتے ہوئے وہاں کے نواب عظیم الدولہ بہادر

نے آپ کو دارالافتار کی ذمہ داریوں سونپ دیں۔ پانچ سال کے بعد چٹوڑ میں حکومت کی جانب سے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مفتی صدر عدالت کے منصب پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر آپ کی بے پناہ علمی قابلیت سے ان کرتے ہوئے حکومت نے آپ کو تمام مالک محروسہ متعلقہ حکومت مدراس کے عہدہ قضاۃ کی عظیم خدمت سپرد کر دی۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

وكان ما حمد الله من كبار العلماء و انتفعت اليه ماسته بعلم
والتمس اليه مدراس . انتفع به جمع كثير من العلماء و اول
مصنفات مفيدة متعق

(یعنی آپ کا شمار عظیم علماء میں ہوتا تھا، مدراس میں درس و تدریس کی سربراہی آپ ہی پر شتم ہو گئی۔ آپ سے علماء کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ کیا ہے۔ آپ کی مفید اور نفع بخش تصنیفات بھی ہیں)۔

قاضی صاحب کی مستقل علمی تصانیف میں نفائس ارتضیہ، نقد الحساب، فرائض ارتضیہ، فوائد سعیدیہ، مواہب سعیدیہ، صلوة ارتضیہ، تنبیہ الغفول، رسالہ در امام ہدۃ اور تفریح المنطق کے علاوہ بہت سی کتابوں کی شرحیں اور حاشیے بھی آپ نے لکھے ہیں۔ جن میں قصیدہ بردہ کی فارسی شرح مراۃ ارتضیہ فی کواکب المضیئہ، منجۃ السراۃ فی شرح الدعار المسد، کاشف الغرار، حاشیہ صدر، حاشیہ میرزا بہر، حاشیہ ہدایۃ الحکماء، حاشیہ جلالیہ، شرح چہن کاف، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ بر نفائس ارتضیہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ آپ کی یہ سب تصانیف کتب خانہ فاروقی، گوپاموہلی محفوظ ہیں۔ چند کتابوں کے علاوہ آپ کی بیشتر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ قاضی صاحب فارسی، عربی اور ہندی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ خوشنود تخلص تھا۔ ایک فارسی دیوان بھی کتب خانہ فاروقی میں محفوظ ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ کی اور بھی علمی تصانیف مدراس کے

کسی کتب خانہ میں موجود ہوں۔

زیر بحث کتاب تنبیہ الغفول بھی مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ فاروقی میں موجود ہے۔ اس کا اصل نسخہ تو فارسی زبان میں ہے لیکن اس کا ایک عربی ترجمہ بھی اسی نام سے کتب خانہ میں ہے۔ اگرچہ تصریح الانساب (مصنفہ مولانا یار حسین صاحب نقشبندی) میں قاضی صاحب کے تذکرہ کے تحت ان کی اس کتاب کو مطبوعہ لکھا گیا ہے لیکن کوئی تفصیل نہیں کہ کب کہاں اور کتنی تعداد میں طبع ہوئی۔ اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ کتب خانہ فاروقی میں بھی موجود نہیں۔ کتاب میں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے۔ آباء رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کے بارے میں مدنی بحث کی گئی ہے۔ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ نسب بھی حضرت آدمؑ تک مرتب کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد کتاب کو اس سجع عبارت سے شروع کیا گیا ہے :

”جائیکہ تاجدار لولک ، و شہر یار سریر افلاک ، زبان فصاحت بیان بکلمہ
لا اوصی کشاید ، از دست و زبان کہ بر آید کز عہدہ شکرش بدر آید ،
جل جلالہ علم نوالہ و در مقامیکہ عرفان و عارج معارج ایقان لغز ما
عرفناک سر آید الخ“

تقریباً دو صفحوں کی اس تہذیبی عبارت کے بعد مصنف اپنا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہاں اے عزیز و فقیہ اللہ بالمقوی و اتیدک بالتباع سنن الہدی کہ باجماع اہل ایمان ایذا آں سرور انس و جان ، موجب نکال دنیا و خسران عقبی است ، و اذیتے بالا تر ازین نمواند بود کہ در حق آباد آں رسول اکرم کہ شریف ترین مخلوقات حبیب و نسباً از دے ظہور نیامدہ نسبت خلو و عذاب و استحقاق جہیم کردہ شود۔“

وہ مشرک نہیں ہے۔ اپنے اس موقف کو مدلل انداز میں ثابت کرتے ہوئے اس ضمن میں بارہ مختلف راویوں کی احادیث بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پہلی حدیث میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے ابو نعیم نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمؑ کے وقت سے ہی اللہ تعالیٰ مجھے پاک اصحاب سے، صاف، عیوب سے مبرا اور آراستہ ارحام میں منتقل کرتا رہا اور کسی نسب میں اگر دو فرقے ہوئے تو میں ان میں سے بہتر فرقہ میں تھا۔ اسی طرح دیگر احادیث بھی تقریباً اسی مضمون کی شامل کی گئی ہیں۔

(۲) دوسرے مسلک کی تفصیل میں وہ لکھتے ہیں کہ آدمؑ سے کنانہ تک سب ہی موجد تھے۔ پھر آدمؑ سے نوحؑ بن مک بن متوشلح بن اخنوخ یعنی ادریسؑ بن بیارد بن ہامیل بن قینان بن انوش بن شیت بن آدمؑ سب ہی شریعت حق پر تھے اور بت پرستی نوحؑ کے زمانہ میں رائج ہوئی۔ چنانچہ مستدرک، تفسیر ابن جریر اور ابن منذر وغیرہ میں آیت ”کان الناس اُمة واحدة“ (لوگ ایک ہی قوم تھے) کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ”آدمؑ و نوحؑ کے درمیان دس صدیاں گزریں ان ایام میں سب لوگ شریعت حق پر تھے پھر جب ان میں اختلافات ہونے لگے تو اللہ نے نبیوں کو مبعوث کیا۔“ اس ضمن میں بھی مصنف نے تین روایتیں نقل کی ہیں پھر وہ لکھتے ہیں کہ اسی طرح نوحؑ کے عہد سے لے کر ابراہیمؑ بن تارخ بن ناخور بن شاروح بن ارانور بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوحؑ علیہ السلام تک کوئی بھی مشرک نہیں ہے۔ اس کو بھی وہ طبقات ابن سعد کی روایت سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”ان الناس من عہد نوحؑ لم یزلوا ببابل وھم علی الاسلام“ ان طوفان نوحؑ کے زمانہ سے لوگ ہمیشہ بابل میں اقامت گز رہے اور سب کے سب شریعت اسلامیہ کے پیرو تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بادشاہ نمرود بن کوکش بن کنعان نے ان کو عبادت اصنام کی دعوت دی۔ اس مسلک میں بھی وہ بہت دھڑا

اور دلائل و براہین کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آبار و اجداد کے اسلام کو ثابت کرتے ہیں۔

پھر حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے احیاء کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ اور دیگر محدثین کی روایتیں نقل کرتے ہیں کہ جب ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں جا رہے تھے کہ آپ کا گزر عقبۃ الجحون سے ہوا۔ اس وقت آپ پر رقت طاری ہو گئی اور آپ رنجیدہ ہو گئے۔ آپ کو دیکھ کر ہم بھی ابدیدہ ہو گئے۔ پھر آپ کو کامیابی حاصل ہوئی اور آپ اتر کر بولے اے حمیرا (عائشہ) تو یہیں ٹھہر، میں اونٹ کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر کے بعد تشریف لائے تو آپ کے چہرہ سے خوشی و مسرت جھلک رہی تھی۔ میں بولی آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں! آپ جب گئے تھے تو بہت غمزدہ اور ابدیدہ تھے، میں بھی آپ کے رونے سے رو دی تھی۔ کیا بات ہے اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا۔ میں اپنی ماں کی قبر کے پاس گیا اور خدا سے دعا کی کہ ان کو زندہ کر دے۔ چنانچہ خدا نے ان کو زندہ کر دیا اور وہ مجھ پر ایمان لے آئیں۔ پھر اللہ نے ان کو اسی حالت پر واپس کر دیا یعنی وہ فوت ہو گئیں۔ مصنف نے اس طرح کی پانچ روایتیں نقل کر کے دلائل پیش کئے ہیں۔

آخر میں مصنف نے اس سلسلہ میں دس اعتراضات کے جوابات بالترتیب بڑے تفصیلی اور مدلل انداز میں دیئے ہیں۔

اختلم کے طور پر وہ لکھتے ہیں کہ فافهموا استقموا لاتتبع خطوات الشیطن فان الشیطان للانسان عدو مبین، الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید الخلق محمد و آلہ وصحبہ اجمعین۔

خاتمہ میں جو کاتب کا تحریر کردہ ہے اس طرح کی عبارت ہے :

تمت و الفائدۃ نعمت ، الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ
 محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم۔ رسالہ تنبیہ الغفور
 فی اثبات اسلام آباء رسول تصنیف جناب زبدۃ العلماء والعارفین وافتخار العلماء
 المراسخین حضرت قاضی مولانا محمد ارتضیٰ علی خاں صاحب وقبلہ قدس ظلان افنا لہم
 وفضائلہم موافق حکم جہاں مطاع صاحب علو، مکر وارانہ نسب صاحبزادہ بند نسبت
 تاریخ سبقت شہ جمادی ثانی ۱۲۴۲ھ از خط کمرین بدر لدین بتکلمہ رسیدہ۔ تمت۔

اس کے بعد نیچے سرخ روشنائی سے یہ شعر لکھا ہوا ہے

اہل بیامرز این سہ را

مصنف، نویسنده، خوانندہ را

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب اس طرح دیا ہوا ہے :
 محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ بن عبد المطلب ، بن ہاشم بن عبد مناف
 بن قصی بن کلاب بن مہر بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نصر بن کنانہ بن خزیمہ
 بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن آد بن آذر بن الہمیسع بن سلامان
 بن ثابت بن جہل بن قدار بن اسماعیل بن ابراہیم بن آذر بن ناخور بن شایع بن اراغوس فالغ
 بن خمار بن یحییٰ بن شایع بن ارفخشذ بن سام بن نوح بن مک بن متوشلح بن اخنوخ بن
 یارد بن مہلکیں بن قبتان بن افوش بن شیت بن آدم صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

ان سب اسناد کی تحصیل حاشیہ پردی گئی ہے جس میں ہر فرد کی اولاد ذکر و
 ناث ، اس کے ماں باپ کے نام کے ساتھ کنیت ، بھائی بہنوں کا تذکرہ ، دیگر حالات اور
 کموت نیز اخلاقات کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

منطق و فلسفہ

ایک علمی و تحقیقی جائزہ

جناب محمد اظہار حسین قاسمی بستوی

مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ معقولی کتابوں سے
مولانا اسماعیل شہید کی رائے متنفر رہتے تھے اور ان کو اشرافیہ و مشائین کا
 جمع کیا ہوا گروہ موت کہتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ
 جب حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلویؒ کے قافلہ کا ریاست رامپور جانے کا ارادہ ہوا
 تو وہ زمانہ نواب احمد علی خاں کا تھا، جب علمائے رامپور (جو معقولات کے شیدائی تھے)
 کو اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن
 ہو سید صاحب کے لوگوں کو بالخصوص مولوی اسماعیل صاحب کو نیچا دکھایا جائے
 اور مشورہ سے ایک عالم صاحب کو گفتگو کے لئے منتخب بھی کر لیا گیا۔ اس زمانہ
 میں رامپور میں ایک صاحب شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے جو رامپور
 ہی کے رہنے والے تھے، جب ان کو اس مشورہ کی اطلاع ہوئی تو وہ رامپور سے
 پیدل روانہ ہوئے اور دو تین منزل چل کر سید صاحب کے قافلہ سے ملاقات کی

اور ان لوگوں سے کہا کہ آپ صاحبوں کا رامپور تشریف لے جانا مصلحت نہیں ہے کیونکہ وہاں کے علمائے آپ لوگوں سے مناظرہ کا مشورہ کیا ہے اور وہ مناظرہ پرتلے ہوئے ہیں اور اگر جانا ہی ہے تو اور لوگ جائیں مگر مولانا اسماعیل صاحب کا جانا کسی طرح مصلحت نہیں ہے کیونکہ وہاں کے علماء ان کے خاص طور پر درپے ہیں، اس کے بعد وہ مولانا اسماعیل صاحب کے پاس گئے اور ان سے خصوصیت سے اس واقعہ کو بیان کیا اور درخواست کی کہ آپ سرگز رامپور تشریف نہ لے جاویں۔ مولانا نے فرمایا کہ :

”یہ آپ کا احسان ہے کہ آپ نے ہم لوگوں کی وجہ سے اس قدر تکلیف گواہ کی اور ہم آپ کے ممنون ہیں لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے اتنی پریشانی ہو کیونکہ وہ لوگ یا معقول میں گفتگو کریں گے یا منقول میں گفتگو کریں گے، توجہ بات یہیں معلوم ہوگی ہم اس کا جواب دیں گے اور جو نہ معلوم ہوگی ہم صاف کہہ دیں گے کہ ہم نہیں جانتے اور اگر وہ معقول میں گفتگو کریں گے تو خدا نے عقل ہمیں بھی دی ہے، وہ اخراقیہ اور مشائخہ کا جمع کیا ہوا گوہ اچھالیں گے، اس کے جواب میں ہم بھی اپنی عقل سے گوہ اچھالیں گے، دیکھیں وہ کہاں تک چلتے ہیں۔“

غرض مولانا نے اپنا ارادہ فصیح نہیں کیا اور قافلہ کے ہمراہ رامپور پہنچے، جب رامپور پہنچے ہیں تو حسب قرار داد باہمی علمائے رامپور نے اپنے منتخب عالم کو مناظرہ کے لئے بھیجا، اس نے پہنچ کر مولانا سے سوالات شروع کئے اور مولانا نے تمام سوالات کا جواب دیا، یہ گفتگو تین روز تک رہی، جب سائل کے سوالات کا سلسلہ ختم ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ آپ کے سوالات تو ختم ہوئے، اب مجھے اجازت ہو تو چند سوالات میں بھی کروں، انہوں نے اجازت دی مولانا نے صرف چار سوالات کئے دو معقول کے اور دو منقول کے، مگر ان کو جواب نہ بن آیا، اس لئے انہوں نے ہمت چاہی

کہ میں کل جواب دوں گا، آپ نے اجازت دے دی، اگلے دن صبح کی نماز کے وقت اُن کا حجرہ نہیں کھلا، لوگوں نے نماز کے لئے اٹھانا چاہا مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا، تب لوگوں کو شبہ ہوا تو لوگ کواڑ اتار کر اندر داخل ہوئے، دیکھا تو عالم صاحب مرے پڑے ہوئے ہیں اور انھوں نے سر میں پتھر مار کر خودکشی کر لی ہے۔

(ارواحِ ثلاثہ ص ۸۵)

قاسمی ثناء اللہ پانی پتی کا ارشاد | بیہقی وقت حضرت مولانا قاسمی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ حکمت و فلسفہ کو لاشیٰ محض فرماتے تھے اور اس میں کمال پیدا کرنا گویوں کا کمال قرار دیتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں :

دخواندن حکمت فلاسفہ لاشیٰ محض است	اور فلسفیوں کی حکمت پڑھنا لاشیٰ
کمال درآں مثل کمالِ مطربان است	محض ہے، اس میں کمال پیدا کرنا
در علم موسیقی کہ موسیقی ہم فن است	ایسا ہی ہے جیسے فن موسیقی میں گویوں
از فنون حکمت ریاضی۔	کا کمال کہ وہ بھی حکمت ریاضی کے

(مالا بد منہ ص ۱۶۲) فنون میں سے ایک فن ہے۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی کا فرمان | علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنی زندگی ارسطو اور افلاطون کے وسوسوں اور ان کے پرگندہ خیالات میں گزارتے ہیں وہ کبھی قرآن کریم کے حقائق و دقائق اور اس کے رموز و اسرار سے واقف نہیں ہو سکتے اور انھیں اس کے علوم عجیبہ کی ہرگز ہوا نہیں لگ سکتی، چنانچہ لکھتے ہیں :

واما من صرف عمرہ بوساوس	جو عمر اپنی ارسطو کے وسوسوں اور
ارسطا طاليس واختار	خیالات میں بسر کرے اور مورد

شك القائل علی ریش
الطوائس فهو بمنزل
من فهم غوامض الكتاب
وادراك ما تضمنه من
العجب العجائب

کے پردوں پر ٹیلوں کے کانٹوں کو ترجیح دے
وہ نہ تو کتاب اللہ کے غوامض و
اسرار کا ادراک کر سکتا ہے اور
نہ اس کے عجائبات کو
پاسکتا ہے۔

(تفسیر روح المعانی جلد اول ص ۱۷۱)

دیکھئے کتنے فصیح و بلیغ انداز میں علامہ ہندادیؒ نے بندگان خدا کو قرآن کریم کر
ترغیب اور معقولات سے ترہیب کا سبق دیا ہے۔

مفتی خیر صدق جو نیوریؒ کا ارشاد | متونی سنہ ۱۰۶۲ھ کے شاگرد مفتی محمد صادق

جو نیوریؒ متونی سنہ ۱۰۶۲ھ ایک عابد و زاہد اور متقی انسان تھے، طبیعت میں توکل اور
فقر و استغنا زیادہ تھا، دنیا و اہل دنیا سے کوسوں دور رہتے تھے اور اس کے ساتھ
بڑے صاحب کشف و کرامت تھے، ان کی بہت سی کرامتیں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری
نے دیار پورب میں علم اور علمائے میں لکھی ہیں، بایں ہمہ مفتی محمد صادق صاحب جو نیوریؒ
رحمۃ اللہ علیہ معقولیوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، ایک دن ان کے استاذ
مشہور فلسفی ملا محمود جو نیوریؒ نماز کے وقت تشریف لائے اور امامت کے لئے آگے
بڑھے مگر استاذ ہونے کے باوجود مفتی صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا اور
خود آگے بڑھ کر امامت کی، نماز پڑھنے کے بعد مفتی صاحب نے دست بستہ اپنے ستار
سے غرض کیا کہ:

”حضرت! میں حتی الامکان نماز نہیں پڑھتا ہوں مگر مجھے حکماء و فلاسفہ
کے کلام میں ایمان مشتبہ معلوم ہوتا ہے اس لئے میں نے نماز ضائع نہیں

ہو نے دی جگہ خود ہی امامت کر دی۔“

علامہ محمود جو نیوزی اپنے عزیز شاگرد کی یہ بات سن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنے شاگردوں میں ایک کو عالم بد و زائد اور عالم باعمل پایا۔

(ذیاب پورب میں علم اور علماء ص ۳۳)

شاہ اسحق دہلوی کی رائے | شاہ اسحق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ کو لغو اور بھل سمجھتے تھے اور اس کو لایعنی و بیکار

قررو دیتے تھے، اسی لئے اس کو کبھی نہیں پڑھایا، ہمیشہ حدیث و تفسیر ہی پڑھاتے رہے، ایک مرتبہ انھوں نے ایک طالب علم کو بے چین دیکھا، اس سے وجہ پوچھی تو اولا اس نے کبرانہ طور پر اغواش کیا کہ کچھ نہیں، پھر اسرار کہنے پر بتایا کہ شمس و زمرہ (فلسفہ) کا ایک مقام حل نہیں ہوا اور استاذ سے اس کے بارے میں اختلاف ہو گیا، میں تین روز سے اس میں الجھا ہوا ہوں، شاہ اسحق صاحب نے از روئے شفقت فرمایا کہ ذرا ہمیں تو دکھاؤ، اس نے یہ سمجھ کر کہ یہ ایک محدث علم حدیث کے ماہر ہوں گے، فلسفہ کی کتابوں سے کیا واسطہ، بڑے استغناء سے کتاب ان کے آگے رکھ دی، شاہ اسحق نے اس مقام کا مطالعہ کر کے اس کی ایک ایسی واضح تقریر کر دی کہ اس کے سب شبہات جاتے رہے، اب تو یہ طالب علم قدموں میں گر پڑا، شاہ صاحب نے فرمایا ”میاں ہم نے پڑھا سب کچھ ہے مگر اس کو لغو سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے۔“

(مجالس حکیم الامت ص ۲۳۶)

فلسفہ اور اس کے معانی میں غور و خوض عقلا کے لئے تحقیق صرفیہ کا ارشاد | جناب ابن جات اور رسول حق ص ۱۰۱

اس لئے اس سے ضرور بچنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ”تحقیق اہل کشف و صوفیاء نے فرمایا ہے کہ لفظ قلب کے ہر ہر لطیفہ میں

دس دس ہزار حجابات ظلماتی و نورانی ہیں اور لطیفہ قابلہ کو مل کر سات لطیفہ ہیں تو ستر ہزار حجاب ہوئے، ذکر سے ظلمت دفع ہوتی ہے اور نور لطیفہ کا سناٹا کو نظر آتا ہے، یہ علامت ان حجابات کے اٹھ جانے کی ہے مثلاً :

جب نفس کا شہوت و لذت ہے، اور حجاب دل کا نظر کرنا ہے غیر حق پر اور عجب با عقل کا معانی نفسہ میں غیرو و غرض کرنا اور حجاب روح کا مکاشفہ نام مثال کے ہیں و علیٰ ہذا، ان میں سے کسی کی طرف مستفت نہ ہو، مقصود حقیقی کی طرف متوجہ رہے اور غیر مقصود کی نفی کرتا رہے۔“

(تعلیم الدین ص ۱۲۴)

حکمرالاست حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت تھانویؒ کے ارشادات
 معقولات کو مذہب و عادات میں شمار فرماتے تھے اور اس میں توغل و استہاک کو واجب المنع قرار دیتے تھے، چنانچہ اس کے مفاسد کو بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

”بجملہ ان رسوم کے طائب سموں کا بڑے بڑے عہدوں کو صل کرنے کے لئے باوجود فساد ہونے دین کے، انگریزی پڑھنا یا معقولات و فلسفہ میں دینیات سے زیادہ توغل و استہاک ہے، چونکہ ان دونوں چیزوں کا مضر رسا ہونا تجربہ و متبدلہ سے ثابت ہو چکا ہے، سوئے داخل و عید قرآنی ہو کر واجب المنع ٹھہرے کے ہی تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے : وَیَذَرُکُمْ فَاَیُّکُمْ زَاهِقٌ وَلَا یَنْفَعُکُمْ“
 یعنی یہ لوگ ایسی چیز سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دیتی ہے نفع نہیں دیتی۔“

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دوسری جگہ فساد کو خطاب کر کے فرماتے ہیں :

”نہ رانہ نے کیا ہے کہ پڑھتے دماغ خراب کیا اور آخر میں نتیجہ کیا، کہیہ بھی نہیں، سوئے اس کے کہ اشتراقیہ کی رائے یہ ہے اور

مشائین کی رائے یہ ہے، معلوم نہیں کہ کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے اور ہمارا علم یہ ہے کہ اول ہی دن ہم نے پڑھا کہ رضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کر دیا، اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا، پر ثواب کی امید ہوئی اور تمہیں کیا ملا؟ کونسا ثواب مشائین اور اشرافیہ کی رائے پر ملنے کی امید ہے، بس یہی فرق ہے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں، فلسفہ تو وہ گم ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مذاکرے ہیں، ایک ذرا سی بات ہی طے نہیں ہو پاتی، خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دئے اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں مگر اس وقت کا حال کیا ہے؟ اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نتیجہ معتد بہ حاصل ہو گا تب بھی مضائقہ نہیں لیکن یہاں حاصل کا نام صفر ہے۔“

(اشرف المجواب لشفاہ المرتاب جلد چہارم ص ۱۴۶)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فلاسفہ کو شیطان
مجدد الف ثانی کا ارشاد | گردہ قرار دیتے تھے اور ان کے لئے ناکام و نامریدی لازم گردانتے تھے اور فرماتے تھے کہ فلاسفہ کی تریق انبیاء کی تکذیب ہے اور ان کے علوم کی تکذیب ہے، چنانچہ ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

”خلاصہ یہ ہے کہ فلاسفہ کی تصدیق اور ان کے علوم کی تصدیق انبیاء کی تکذیب اور ان کے علوم کی تکذیب ہے اس لئے کہ ان دونوں کے علوم ایک دوسرے سے بالکل مقابل سرے پر واقع ہوئے ہیں، ایک کی تصدیق دوسرے کی تکذیب کو مستلزم ہے، اب جو چاہے انبیاء کے دین کا پابند ہو اور اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے ہو اور اہل نجات میں سے ہو اور جو چاہے

فلسفی ہو جائے گا اور شیطان کے گروہ میں سے ہو اور نامکام و نامراد ہو،
 مَنْ شَاءَ مِنْهُمْ يَرْفَعْ يَدَهُ إِلَىٰ آتِنَا إِلَهَ الْإِسْلَامِ يَتَنَبَّأُ بِمَا فِي
 الْأَحَادِيثِ سَرَادِقُهَا وَإِنْ يَسْخَرُ مِنْهَا يَغَاوَرُ بِمَا آتَىٰ كَالْمُهْلِ يَتَوَلَّى
 الْكُفْرَ بِشَيْءٍ الشَّرَابِ وَسَاعَرَتْ مُنْفَقَاتُهَا (جس کا جی چاہے یاں
 لائے اور جس کو جی چاہے کافر ہو جائے، بیشک ہم نے ظالموں کے لئے
 ایسی آگ تیار کی ہے جن کی مثالوں نے ان کو گمراہ کیا ہے اور اگر وہ پیاس سے
 فریاد کریں گے تو ان کی داد دے گی ایسے پانی سے کہ جائے گی جو گھٹلے سیسہ کی طرح
 ہو گا جو منہ کو زبردست دے گا اور وہ بری چیز ہو گی) اور سلامتی ہو اس پر جس نے
 ہدایت کی پیروی کی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی پابندی کی، ان پر
 اور اس کے بعد ان انبیائے کرام اور ان کے عظام پر کھلی ترین اور اعلیٰ ترین
 درود و سلام ہوگا

(مکتوب مسطور ۳۰ ہندو خیر و ابراہیم تبار دیا دارا)

مولانا گیسو داس کی ایشاد
 مولانا سید منیر الحسن ایلانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی
 کے شوال ۱۲۰۱ھ اور اس کے پڑھے پڑھنے نے واعدت وقت قرار دیتے تھے چنانچہ
 نہایت درود کرب کے ساتھ فرماتے ہیں :

”نفس کا نفس ہے حق و واقعات سے نہیں ہوتا بلکہ وہ سرور سے زیادہ
 اور کمپیوٹر سے ہوتا ہے اس لئے مقبول ہونے کے بعد تھوڑے دنوں پر مہر زمانہ
 کا شمار اس سرور ہوتا رہا ہے، پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے،
 یہ کہ وہ ہیں ہمہ ہا ہے، آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے زمانہ میں
 یہ فلسفہ سچا ہے، یہ پروردہ ہرچیز ہے لیکن ہمارے غم و غمش موروثی زیادت

کے زیر اثر مرحوم و مدفون فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے جا رہے ہیں، آپ ہی بتائیے کہ طلباء کا قیمتی وقت اور خرچہ کتنا بیکار ہو رہا ہے، یہاں شغل میں برباد ہو رہا ہے۔“

(سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۹۷)

مولانا دوسری جگہ لکھتے ہیں :

”میرا خیال تو یہ ہے کہ واقعی غور و فکر اور محنت و کاوش کی جو مقدار اور جو وقت معقولات کی کتابوں کی عبارتوں کو سمجھنے میں خرچ کیا جاتا ہے اور اب بھی خرچ کرنے والے بیدردی کے ساتھ اسی مشغلہ میں صرف کرتے ہیں، اگر ان کے بجائے اللہ کی کتاب کے ساتھ یہی تعلق پیدا کر لیا جائے تو علم کا نیا باب لوگوں پر کھل جائے گا اور حضرت نانوتویؒ کا یہ ارشاد بجا طور پر صادق آئے گا کہ قرآن مجید کے الفاظ ہی میں غور کرنا چاہئے۔“

(سوانح قاسمی جلد اول ص ۳۷۶)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاسلام کی تنقید

ستونی ۱۳۷۷ء میں بھی معقولات کی کثرت سے بیزار تھے اور موقع

بموقع نصاب تعلیم میں ان کی زیادتی پر تنقید فرماتے تھے، ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس ہوئی جس میں نہرو رپورٹ پیش کی گئی، شب کی نشست میں مرحوم تصدق حسین شیروانی نے کسی تجویز پر تقریر فرمائی، اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ میں تشریف لے گئے، وہاں طلباء کے درس قرآن کے متعلق ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا جس میں آپ نے تقریر فرمائی، دوران تقریر قرآن کریم کے فضائل و آداب بیان کئے اور قدیم نصاب درس میں معقولات کی زیادتی اور قرآن مجید کے درس و مطالعہ کی کمی اور اس کی حق تلفی پر تنقید فرمائی۔

(شیخ الاسلام معاصرین، اور تنقیدات مندوں کا نظریہ ص ۱۶۱)

حضرت شیخ کا ارشاد | حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۴۸ھ معقولات کو کافروں کی زبان قرار دیتے تھے

اور اس کے مضر اثرات سے بچنے کی تدبیر فرماتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ :
 قرآن و حدیث میں جو اثرات ہوں گے وہ ظاہر ہے اور کافروں کی زبان
 میں جو اثر ہوگا وہ بھی ظاہر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس دن میں نے میبذی
 (فلسفہ) شروع کی تھی اس رات کو میں نے خواب دیکھا تھا کہ میں ہاتھی پر سوار
 ہوں، بڑی خوشی سے خواب اباجون کو سنایا، انہوں نے کہا کہ ہاتھی اور سُور
 کی صورت ایک سی ہوتی ہے (صرف بڑے اور چھوٹے ہونے کا فرق ہے)
 میبذی شروع کرنا ظاہر میں تو ہاتھی پر بیٹھنا ہے لیکن حقیقت میں سُور پر
 بیٹھنا ہے۔“

(فضائل زبان عربی ص ۳۱)

حضرت رائے پوریؒ کی نفی | حضرت مولانا شاہ عبد نقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۸۲ھ معقولیوں سے سخت نفرت کرتے

تھے اور ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے اکثر احتراز فرماتے تھے، چنانچہ ان کا سوانح نگار
 لکھتا ہے :

”آپ علمائے معقولات کے پاس ٹھنے بیٹھنے اور ان کے حالات سے واقف ہونے
 کی بنا پر ان سے زیادہ متاثر اور ان کے عقیدت مند نہیں رہے تھے، ان کی
 آزار دہی اور ان میں بعض کے مدد تو راع اور بلند بانگ دعاوی سے آپ کی
 طبیعت متنفر ہو گئی تھی، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان منطقیوں اور ادیبوں میں
 تہجہ اور حُجُبِ جاہ دیکھا، وہ کسی عالم کو خاطر میں نہیں لاتے اور سمجھ میں دیگرے نیست
 ان کا قول ہوتا ہے۔“

(سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری ص ۴۶)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ بھی معقولاً
 حضرت شیخ الہند کا طریقہ کار سے کچھ زیادہ باتوں میں نہیں تھے بلکہ ایک گونہ اس سے متنفذ
 اور ہزار تھے، چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کبھی حدیث کی چوکی پر سنیق و فلسفہ کی کتاب
 نہیں رکھی جیسا کہ ان کے شاگرد مولانا ثناء اللہ امرتسری بیان کرتے ہیں کہ:

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ بڑے پایہ کے عالم تھے،
 ہر فن کی تعلیم دیتے تھے مگر حدیث کے ساتھ آپ کو خاص انس تھا، میرا چشمہ
 واقعہ بلکہ روزانہ کے واقعات ہیں کہ آپ جس چوکی پر حدیث کی کتابیں رکھ کر
 پڑھاتے تھے معقولات کی کتابیں اس پر نہیں رکھتے تھے، یہ واقعہ میں

ساری مدت تعلیم میں دیکھتا رہا، بحق حدیث آپ کے حسن عقیدہ کا
 ان اشعار میں کردی تو بجا ہے، آپ گریز زبان حال سے فرماتے تھے:

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے اُردو ائمہ درج معطف ہے

صوفی عالم حکیم دینی کرتے رہے اسی کی خوشہ چینی

بابا کے ہاں سے کون آیا جس نے پایا یہ ہیں سے پایا

(اخبار المحدثات، ۲۶ محرم ۱۳۸۱ھ)

مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کا نزدیکی رحمۃ اللہ علیہ بھی معقول تھے
 مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کا ارشاد ہے کہ مداح نہیں تھے بلکہ اس کو پڑھنے کی ترغیب بھی

نہ دیتے تھے، ان کے صاحبزادے مولانا محمد زکریا کاندھلوی لکھتے ہیں کہ مدرسہ نظام العلوم
 میں مشکوٰۃ اور حدیث کی کتابیں لمبی لمبی تقریروں سے ہوتی تھیں تو میں نے اپنے والد ماجد
 مولانا محمد یحییٰ صاحب سے کئی دفعہ اجازت چاہی کہ حدیث کی فلاں کتاب کی سماعت
 کر لوں مگر انھوں نے بڑی شدت سے من فرمایا اور یہ فرمایا کہ:

”حدیث کی کتاب اپنے حضرت قدس سرہ (مولانا خلیل احمد سہارنپوری) کے

کسی سے نہیں پڑھنی، البتہ منطق و منطق کو کتاب کسی اور سے پڑھے تو
 ، متعلقہ نہیں اور توجہ کے لئے ادب درگستاخ ہے، منطق اور فلسفہ وغیرہ
 کے اساتذہ میں سے کسی کی کمتاخنی کوئے گا فوریہ کتابیں جاتی رہیں
 گی، بلا سے جاتی رہیں لیکن حدیث کے اساتذہ میں سے اگر کسی سے
 تفرگستہ تو کو توبہ گوارہ نہیں ہے کہ تیری حدیث ضائع ہو۔“

(اولی کامل ص ۳۲)

سید الطائف حضرت حاجی صاحب کا موقف

واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سید الطائف

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

بھی عقول سے نائنس اور بر فرختہ ہوتے تھے، اور ان کی آمد پر عقولات کا درس
 بند کر دیا جاتا تھا پھر مولانا سیدنا محمد حسن گیلانی لکھتے ہیں :

مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجت الاسلام مولانا ملک علی

خانوتوی سے دین کی کوئی کتاب نہیں بلکہ منطق کا مشہور متن سلم العلوم پڑھتے

تھے، اسی عرصہ میں سید الطائف حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا ملک علی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے، ابھی قریب بھی

نہیں پہنچے تھے کہ مولانا ملک علی صاحب کی نظر سید الطائف حضرت حاجی

صاحب پر پڑی، دیکھنے کے ساتھ ہی مولانا ملک علی صاحب نے پڑھنے والے

طالب کو خطاب کر کے فرمایا کہ ”لو بیانی کتاب اٹھاؤ حاجی صاحب آ رہے

ہیں“ مولانا گنگوہی نے جھنجھک کر حضرت خانوتوی سے کہا ”بھئی یہ اچھا حاجی آیا

ہمارا سبق ہی کیا، حضرت خانوتوی نے فرمایا بابا ایسا مت کہہ یہ بزرگ ہیں،

اور ایسے ایسے ہیں۔ مولانا گنگوہی نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرماتے تھے

کہ ہمیں کیا خبر تھی کہ بھی حاجی ہمیں مونڈیں گے۔“

مولانا محمد تقی امینی کا ارشاد | مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ بھی فلسفہ سے خوش نہیں ہیں، بلکہ وہ اس کو

روح انسانی کے لئے سخت جہک اور مضر سمجھتے ہیں اور اس کو جسم بے جان اور درخت بے پھل
گروا دیتے ہیں، چنانچہ اپنی فصیح و بلیغ زبان میں رقمطراز ہیں :

”فلسفہ کسی دور میں بھی انسانی دکھ درد کا علاج کرنے اور نیز روح انسانی کو
مظہن کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے اور دنیا بالآخر مذہب ہی کے دامن میں
پناہ لینے پر مجبور ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہر جدید فلسفہ مذہب کے انحطاط کے
دور میں بروئے کار آتا ہے لیکن روح انسانی کو اس سے تشفی نہ ہونے کی
وجہ سے بعد میں مذہب کے ساتھ سمجھوتہ کی صورتیں نکالی جاتی ہیں اور مذہب
کو تاویل و تزویر کے ذریعہ اس کے مطابق بنانے کی کوشش ہوتی ہے، یہ
صورت حال فلسفہ کے لئے یقیناً مفید ہوتی ہے کہ مذہب کے ذریعہ وہ اپنے
پائے چوبیس کو مضبوط کرتا ہے لیکن مذہب کے لئے سخت مضر ہوتی ہے، اس سے
اس کا اصلی کردار ختم ہو جاتا ہے، اس کی جذب و انجذاب کی حالت بوجھتی
ہے اور بالآخر وہ فلسفہ کی صف میں اپنی اقدامی حیثیت کو ختم کر کے اپنے افغانہ
صورت میں باقی رہتا ہے۔“

(امام مذہبی دور کا تاریخی پس منظر ص ۱۲۳)

مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے | مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فلسفہ کے شیدائی و ذرائی
تھے مگر خود اس کے حق میں نہیں ہوئے بلکہ اس

کو کلیہ و دمنہ کی کہانی اور الف لیلیٰ کی داستان کہتے تھے اور اس کے مفاسد و مضر اثرات
کو بر ملا ظاہر کرتے تھے، چنانچہ ”غبارِ خاطر“ میں فرماتے ہیں :

”طالب علمی کے زمانہ سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے، مگر کے

ساتھ ساتھ یہ وحشی برابر بڑھتی گئی لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ علیٰ زندگی کی
 تلخیاں گوارہ کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہ
 طبیعت میں ایک طرح کی رواقی بے پروائی پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے
 حادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس سے
 زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں، یہ ہمیں ایک طرح کی
 تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی ہوتی ہے۔
 ایجاب تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی، یہ فقدان کا احساس کم کرے
 گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا، اگر راحتیں ہم سے چھن گئی ہیں
 تو فلسفہ ہمیں کلیہ و دمنہ کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحتیں کرے گا لیکن
 کیا اس کھونے کے ساتھ پانا بھی ہے اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا
 کیونکہ بتلا سکتا ہی نہیں اور اس لئے زندگی کی تلخیاں گوارہ کرنے کے لئے
 صرف اس کا سہارا کافی نہ ہوا۔“

(غبارِ خاطر ص ۳۶)

مولانا دوسری جگہ لکھتے ہیں :

”فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔“

(غبارِ خاطر ص ۳۷)

التعلیق البصیح اور تفسیر معارف القرآن

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کا ارشاد اور ادریس کے مصنف مولانا محمد ادریس کاندھلوی

رحمۃ اللہ علیہ معقولات کو اغلوطات اور خرافات کہا کرتے تھے اور اس کی طبع سازگار وایوں
 سے بچنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ معقولیوں کو خطاب کر کے
 فرماتے ہیں:

دوستو اور بھائیو! تمہیں کیا ہوا کہ
اس زبان (عربی) سے اغراض کئے
بیٹھے اور قرآن و حدیث اور صحابہ
تابعین کے علوم سے منہ موڑ لئے
ہو، تمہیں کیا ہوا کہ تمہارے دلوں میں
انگریزیت کی آگ اور اس کی بکواس
اور منطقیانہ بیہودگیاں اور خرافات
اور فلسفہ یونان کی طبع سازیاں گھونٹ
گھونٹ کر پلا دی گئی ہیں، وہ چند
گنے چنے نام ہیں جن کو تم نے اور
تمہارے باپ، دادوں نے رکھ رکھا
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کی کوئی
حجت نہیں اتاری ہے۔

فيا معشرون الاخوان والخللان
مالکم قد اعرضتم عن هذه
اللسان ومالکم قد صدقتم
عن علوم السنة والقرآن و
علوم الصحابة والذین
اتبعوهم باحسان ومالکم
قد اشرب فی قلوبکم
حب من مزممة البرطانیة
وساطانتها والاعلوطات
المنطقية وتلیعاعها وتمویحات
فلسفة اليونان ان هی الا
اسماء سمیتموها انتم
واباءکم ما انزل اللہ
بها من سلطان۔

(دیباچہ مقامات حریری محشی بحوالہ شی مولانا کاندھلوی ص ۵)

باب ہشتم

تکفیر اسٹ و تعزیرات

ماضی کی تاریخ بتاتی ہے کہ معقولیوں نے جب جیب دنیا میں اپنا سر غرور اُبھارا
و علمائے دین نے انہیں کچل کر رکھ دیا اور کبھی انہیں پینے کا موقع نہیں دیا،
نہیں قتل کئے گئے، کہیں تلوار سے اڑائے گئے، کسی کو زہر ملاہل دیا گیا، کسی کو قید و بند

کی مشقت میں جکڑا گیا، کسی کی کتابیں نذر آتش کر گئیں، کسی کے خانہ منسوبے بنائے گئے، غرضیکہ انھیں زندگی بھر ذلت و رسوائی اٹھانی پڑی اور چین و اطمینان کا سانس کبھی نہ لینے پائے۔ انہی سطوروں میں انہی واقعات سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اور ان کے مخفی چہروں کی پورے پورے طور سے نقاب کشائی کی جا رہی ہے:

فلاسفہ کی تکفیر | فلاسفہ کے عقائد و خیالات اور ان کے افکار و نظریات مثلاً تعدد قدماء کا قول، آسمانوں میں فرق و امتیاز کا انکار، بیہوشی و سورت کی قدامت کا قول، حق تعالیٰ کے جزئیات کے عدم علم کا قول وغیرہ اس بار پر مجبور کرتے ہیں کہ انھیں مطلقاً دائرہ اسلام سے خارج کیا جائے اور انھیں اسلام اور مسلمانوں کے لئے ستم قاتل گردانا جائے خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین، اوائل میں ہوں یاواخر میں۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فانی رأیتہم اصنافاً و ہائیت	میں نے فلاسفہ کی اور ان کے
عنوہم اقساماً و ہم علی	علموں کی کئی قسمیں دیکھی ہیں مگر
کفرہ اصنافہم یلزمہم	مختلف اقسام میں منقسم ہونے
سمۃ الکفر و الالحاد و ان	کے باوجود ان پر کفر و الحاد
کان بین القدامہ منہم	لازم آتا ہے خواہ حق سے
و الاقدامہ و بین الاواخر	قرب یا دور ہونے میں ان کے
منہم و الاوائل تفاوت	متقدمین و متاخرین اور اوائل و
عظیم فی البعد عن الحق	اوخر کے درمیان کتنا ہی فرق
اصنافاً	کیوں نہ ہو۔

(التقصد من الضلال ص ۱۱)

جسلی باطنی کی تکفیر یونان کے نامور فلسفی ایبذقلیس کا پیروکار عہد اسلام میں محمد بن عبداللہ اجملی الباطنی القرطبی تھا مگر علمائے دین نے اس پر بھی کفر کا فتویٰ لگایا جس کا سبب اس کے وہ کفریہ عقائد تھے جو یونانی فلسفہ کے زیر اثر پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے مرشد کے فلسفہ کا بڑا شیدائی تھا، اس نے زندگی بھر اس کی اشاعت کی، اس نے اپنے والد اور ابن و ضاح الحثنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا لیکن جب اس نے اپنے پیشوا کے فلسفہ کا پرچار شروع کیا تو لوگ اس سے متنفر ہو گئے، علماء نے کفر کا فتویٰ لگایا، چنانچہ وہ مشرق کی طرف بھاگ نکلا، مدتوں مشرقی ممالک میں گھومتا رہا، وہاں اعتزال و کلام اور ارباب جدل و مناظرہ کی مجلسوں میں شامل ہو گیا پھر اندلس چلا گیا جہاں زہد و تقویٰ کا بادیہ اور مکر اپنے فلسفہ کی اشاعت میں لگ گیا، کچھ لوگ اس کی صورت سے دھوکا کھا کر اس کے جال میں پھنس گئے اور کچھ متنفر ہو گئے، لوگوں کے عقیدت کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی چرب زبانی سے بڑی بڑی مشکلوں کو سر کر لیتا تھا۔

(تاریخ الکملار اردو ص ۳۹)

امام منطق کی جلا وطنی تاریخ بتاتی ہے کہ معقولی افراد جب کہیں پہنچتے اور وہاں اپنی حرکات شروع کرتے تو وہاں کے علماء ان کو جلا وطن کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ شاد توران عبداللہ ازبک کے عہد میں جب معقولی عالم ملا عصام الدین اسفراسنی کے ذریعہ سمرقند و بخارا میں معقولات کا کچھ زور بندھا تو خبیث الطبع شہریر طلباء جہاں کہیں سیدھے سادے سلیم الطبع آدمی کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ گدھا ہے کیونکہ اس سے لاجیوان مسلوب ہے اور چونکہ انتفار عام مستلزم انتفار خاص ہوتا ہے اس لئے سلب انسانیت بھی لازم ہے، گویا اس طریقہ سے ہر اچھے بھلے مانس کو ثابت کر دیا کرتے کہ وہ گدھا ہے، اس لئے قاضی ابوالعالی نے

عبداللہ ازبک شاہ توران کے حکم سے ملا عصام الدین اسفراینی کو ان کے طلباء کے ساتھ ماوراء النہر سے نکلوا دیا اور معقولات کی تعلیم و تعلم کی نامشرعیت کو ثابت کر دیا۔

(ظفر الحصلین باحوال المصنفین ص ۳۱۱)

منطقی کی بُری سزا بہت سے معقولیوں اور فلسفیوں نے بڑی بڑی ڈینگیں ماریں کہ ہم یہ کریں گے وہ کریں گے ایسا کر سکتے ہیں ویسا کر سکتے ہیں مگر آخر کار انھیں منہ کی کھانی پڑی، بری طرح سے سزائیں پائیں اور زندگی بھر افسوس کرتے رہے۔ ایک قاری نے قرآن پاک میں جب اس آیت کی تلاوت کی:

إِنْ أَصْبَحَ مَاءٌ كُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ ۝ (یعنی اگر تمہارے چشموں کے پانی خشک ہو جائیں تو کس میں قدرت ہے کہ پانی اوپر لاسکے) یعنی یہ مبری ہی قدرت ہے کہ پانی کو زمین کی گہرائی میں مخفی کر دیتا اور چشموں کو خشک کر دیتا ہوں پھر میں ہی اس کو دوبارہ چشموں میں لاتا ہوں، اس آیت کو سن کر ایک منطقی فلسفی نے کہا کہ میں لاسکتا ہوں، بس جب وہ رات کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ ایک بہادر مرد نے اس کو ایک طمانچہ مارا جس سے اس کی دونوں آنکھیں اندھی ہو گئیں پھر اس بہادر نے کہا اوبد بخت! اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اپنی آنکھوں کا نور واپس لے آ۔ جب وہ خواب سے بیدار ہوا تو اپنی آنکھوں کو بے نور پایا اور اندھا ہو گیا۔

(معارف مشنوی ص ۲۳۵)

یعقوب کندی کے خلاف سادش یعقوب بن ابی اسحق کندی متوفی ۲۶۰ھ جس کو مامون الرشید نے یونانی کتابوں کے ترجمہ کے لئے مقرر کیا تھا۔ علماء اسلام نے اس کی بھی مخالفت کی اور اس کے درپے

ہو گئے، بلخ کے ایک فقیہ ابو معشر اس غرض سے بغداد گئے کہ وہ بغداد میں جا کر کندی کے حلقہ درس میں شریک ہوں اور علم نجوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بہانے سے موقع پائیں تو اس کو قتل کر دیں لیکن ناکام رہے، ابو معشر کے سوا یعقوب کندی کے سب سے بڑے دشمن موسیٰ بن شا کر کے فرزند محمد اور احمد تھے، انھوں نے یعقوب کندی کے خلاف سازش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متوکل نے اس کو سزا دی، موسیٰ بن شا کر کے بیٹوں نے اس کی تمام کتابیں ضبط کر لیں، ایک اور بڑا تاجر بھی جو یعقوب کندی کے پڑوس میں رہتا تھا اس کا سخت مخالف تھا اور لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکا یا کرتا تھا۔

(تاریخ حکمائے اسلام جلد اول ص ۱۶)

تھپٹی صدی ہجری کے نامور فلسفی ابن باجہ متوفی ۵۳۳ھ ابن باجہ کو زہر دیدیا گیا کو سرقطہ کے رئیس ابو بکر بن ابراہیم صحرادی نے اپنا وزیر بنالیا کیونکہ اس نے اس کی شان میں بہت سے قصائد مدحیہ لکھے مگر عوام ابن باجہ کے فلسفہ دانی کی وجہ سے اس کی وزارت کو ناپسند کرتے تھے، تاہم ابو بکر بن ابراہیم صحرادی نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور ابن باجہ بدستور اس کا وزیر رہا، لیکن وزارت کے زمانہ میں اس کو کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوا، چنانچہ وہ ایک بار ابو بکر بن ابراہیم کا سفیر ہو کر عمار الدواہ بن ہود کی خدمت میں گیا تو اس نے اس کو قید کر لیا اور اس کے قتل کے درپے ہو گیا جب ابن باجہ کو اس کی خبر ہوئی تو کسی حیلہ سے بھاگ نکلا، سب سے بڑی مسیبت عوام کی ناراضگی تھی، ابتدا میں تو ابو بکر بن ابراہیم صحرادی نے اس کی چندال پروا نہ کی لیکن رفتہ رفتہ فوج میں بھی شورش پیدا ہو گئی اور ایک بڑی جماعت ملازمت ترک کر کے چلی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے مرابطین کے دربار کا رخ کیا اور شاطبہ میں ابراہیم بن یوسف بن تاشقین کی سرکار میں ملازمت کرنی چاہی لیکن یہاں بھی

اس کو ناکامی ہوئی۔ ابراہیم بن یوسف نے اس کو قید کر دیا اور اس کا تمام مال و دولت ضبط کر لیا۔

(تاریخ حکماء اسلام جلد دوم ص ۲۲)

ابن باجہ کے مقلق کہا جاتا ہے کہ اسے جوانی کی حالت میں زہر دیدیا گیا کیونکہ وہ اپنے فلسفہ میں بہت آزاد خیال تھا۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ص ۳۷۷ فروری ۱۹۸۵ء جلد ۷۷ شماره ۷۵)

(باقی آئندہ)

حجاز و ماورائے حجاز حجاز کی کہانی حجاز کی زبانی

جلد دوم

از محمد عبدالملک عبدالقیوم خاں

سائز ۱۸x۲۲ یہ کتاب خوبصورت جلد میں شائع ہو کر منظر عام پر آگئی ہے۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔ اس اعلیٰ معیاری کتاب کے مطالعے

سے استفادہ حاصل کریں۔ قیمت مجدد عمدہ ریگزین بیسٹ روپے

اپنا آرڈر اس پتے پر بھیجیں

ندوۃ المصنفین، امرا دو ب بازار، جامع مسجد دہلی

سید احمد خاں کی ایک نادر نعت

جناب حکیم محمد حسین خاں شفا رام پور

کچھ کیفیتیں اور لذتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو آدمی محسوس تو کرتا ہے لیکن ان کا الفاظ میں اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی لذتوں میں سے ایک لذت انقار یا الہام بھی ہے۔ ”اہل دل“ اور ”خاں خدا“ کا کہنا ہے کہ جب عبادت و ریاضت یا تدبیر و تفکر کے دوران ایک استغراقی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وجدانِ سلیم ”نالم سفلی“ سے ملا ر اعلیٰ اور پھر مبرا فیاض سے مل جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسان کو ”انکشاف حق“ یا ”دیدار حق“ میسر آ جاتا ہے۔ اس لمحے سے یقین ہوتا ہے کہ زندگی کا بھید مل گیا۔ عقدہ لائیل کھل گیا۔ معراج ہو گئی۔ اس کیفیت کے دوران کبھی کبھی صاحبِ کشف ایسی باتیں کہہ جاتا ہے یا ایسے کام کر جاتا ہے جو عام انسانوں کی سمجھ اور صلاحیت سے بالا تر ہوتے ہیں۔ کالمین و عابدین کی حیات و ملفوظات اس قسم کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

سرسید احمد خاں کی زندگی میں بھی ایک واقعہ کچھ اسی قسم کا پیش آیا جس کا

ذکر انھوں نے اپنی مرتبہ تفسیر قرآن میں کیا ہے۔ سرسید اپنے مذہب اور قوم پر فدا تھے۔ انھوں نے سیرت رسول اکرمؐ اور تفسیر قرآن اس جذبہ کے تحت تصنیف کی تھیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی افکار کی یلغار اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سائنسی ذہن و معقولیت پسندی کہیں حال و مستقبل کی نسل کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے برگشتہ نہ کر دے۔ جسے قمار کی غلط تشریحات اور فلسفہ یونان کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تعبیرات نے پہلے ہی مشکوک بنا دیا تھا۔ تدبیر قرآن کے دوران سرسید کو حیات بعد ممات، حشر اجساد، جزا و سزا، وغیرہ ایسے عقائد پر غور کرنا پڑا جن کی معقول و عصری ذہن کے لئے قابل قبول تشریح سے سرسید کی عقل قاصر تھی۔ ان مسائل پر غور کرتے ہوئے سرسید پر استغراقی کیفیت طاری ہوئی اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ خود ستارع اسلام ان مسائل کے روز و نکات سرسید کو بتا رہے ہیں۔ جن سے ان کا ذہن مطمئن ہو گیا اور پھر انھوں نے ایک بحث روح سے متعلق سورۃ الاعراف میں صفحہ ۸۴ سے ۱۳۵ تک تحریر کی اور اپنے نزدیک ان مسائل کو عقل کی روشنی میں جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے حل کر دیا۔ چونکہ سرسید کا خیال تھا کہ وہ پہلی مرتبہ غیبی اشارے سے ان مسائل کو حل کر رہے ہیں اور انھیں اس اہم کام میں اپنے جدِ اعلیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید حاصل ہے۔ اس بنا پر اس بحث کے اختتام پر بدیہ تشکر کے بطور فی البدیہہ ایک ناریس نعت موزوں ہو گئی جس کو انھوں نے اسی بحث میں تحریر کر دیا تاکہ یادگار رہے۔

سرسید نے جس زوال پذیر زمانہ میں جنم لیا تھا اس میں بے عملی، خود فریبی اور شعرو شاعری عام تھی۔ ابتدائے جوانی میں رسم زمانہ کے موافق آہنی تخلص رکھ کر سرسید نے شعرو شاعری شروع کی چنانچہ متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن جلد ہی سرسید نے ضروریات ملک و قوم کو سمجھ لیا اور اپنا وقت

میں صرف کرنا شروع کر دیا جس نے انہیں زندہ جاوید بنادیا۔ یہ سرسید کی پہلی و آخری نعت ہے جو تفسیر قرآن کا جزو ہونے کی وجہ سے عام نظروں سے اب تک اوجھل تھی۔ ہم اسے معہ اردو ترجمہ کے پیش کر رہے ہیں۔

اس نعت سے قبل بطور شان نزول سرسید نے تحریر کیا ہے۔

کچھ حقائق ہیں جو نہ حکمت یونان میں پائے جاتے ہیں اور نہ فلسفہ علم کلام میں بلکہ یہ انوار ہیں مشکوٰۃ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جو بلا واسطہ سفینہ منور محمدی سے سینہ احمدی یعنی میرے سینہ میں پہنچے ہیں گو کہ نابدا کچ کو کچ حقیقت ان انوار محمدی کو نعوذ باللہ کفر و زندقہ سے تعبیر کریں۔

اس کے بعد سرسید نے مؤلفہ کہہ کر اپنی یہ نعت لکھی ہے یہ

ترجمہ نعت

نعت

(۱) فلاطوں طفلكے باشد بہ یونا نے کہ من دارم اس یونان یعنی مدینۃ العلم النبی

میں جو میں رکھتا ہوں افلاطون

جیسا حکیم ایک طفل مکتب ہے۔

روگی انسانفل کے لئے میرے پاس

جود و اسے مسیحا بھی اس پر رشک

کرتے ہیں۔

مسیحا رشک میدارد بہ درمانے کہ من دارم

میرے کفر اور میرے ایمان کے بارے

میں اے لوگو تم کیا پوچھتے ہو۔

میرا ایمان خدا اور رسول کے عشق

کا ایک جلوہ ہے۔

(۲) زکفر من چہ می خواہی ز ایمانم چہ می پرسی

ہماں یک جلوہ عشق است ایمانے کہ من دارم

(۳) خدا دارم دے بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم
میں اللہ والا ہوں اور دل
عشق مصطفیٰ میں بھنا ہوا ہے۔
نہ دارم بیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
لوگ مجھے کافر کہتے ہیں جبکہ جو
ساز و سامان میرے پاس ہے
(یعنی دولت ایمان) وہ کسی کافر
کے پاس نہیں ہے۔

(۴) ز جبریل امیں قرآن بہ پیغامے نمی خواہم
میں جبریل امیں سے قرآن کا پیغام
سننا نہیں چاہتا۔

ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم
میرے پاس تو وہ قرآن ہے
جو مکمل میرے محبوب کی زبان سے آیا ہے

(۵) فلک یک مطلع خورشید دارد باہم شوکت
آسمان کے پاس اس قدر شان و شوکت
کا صرف ایک خورشید ہے

ہزاراں اس چنیں دارد گریبانے کہ من دارم
لیکن میرے گریبان میں اس سے
ہزاروں سوچ موجود ہیں

(۶) ز بریاں تابہ ایماں سنگ ہا دارد رہ واعظ
واعظ عقل و دل لعل سے ملیں گے
پھر سے ایمان تک پہنچتا ہے

نہ دارم بیچ واعظ ہر ہا نے کہ من دارم
لیکن میرے پاس جو دلائل ہیں
وہ کسی واعظ کے پاس نہیں ہیں۔

تفسیر قرآن ص ۱۱۴ (۱) سورۃ الاعراف ۷ جلد سوم نو کشتورل ہورد۔

(۲) سخن مطبوعہ ۱۳۱۶ھ میں سرسید کا بحیثیت شاعر صفحہ ۱۲۷ سے ۱۳۱ تک تذکرہ ہے۔

رسالہ "معارف" فارسی میں مختلف کتابوں میں منفرد اشعار کئی کتابوں کے ساتھ اول و آخر میں
طویل منظومات بھی ہماری نظر سے گذرے ہیں سرسید کی نوادر یا نعت کتاب فقرات مرتبہ راقم بھی ایک شعر ہے۔

جناب حکیم ظل الرحمن کے اعتراضات

محمد ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ

”مساجد اور معابد قرآن کی روشنی میں“۔ اس عنوان سے راقم کا ایک مضمون دو قسطوں میں برہان کے جنوری اور فروری ۱۹۸۵ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اکتوبر ۱۹۸۵ء کے برہان میں جناب حکیم ظل الرحمن صاحب دہلوی نے کچھ نقد وارد فرمایا ہے اس سلسلے میں کچھ گزارشات پیش کرتا ہوں:

۱۔ پہلا اعتراض ”خدا پرستی کے معبود و مرکز اور عبادت گاہ“ پر ہے، جواباً عرض ہے کہ یہ سورہ آل عمران کی آیت ۹۶ کا ترجمہ ہے، اور ترجمہ اس بصاعت کا نہیں ہے، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد اول۔

۲۔ دوسرا اعتراض ”أَوَّلُ بَيْتٍ“ کی تشریح سے متعلق ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے اپنی کتاب ”سفر حجاز“ (مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی لکھنؤ) کے صفحہ ۲۸۹ پر ابن ابی حاتم کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: **كَانَتْ الْبَيْوُتُ قَبْلَهُ وَ لَكِنَّهُ أَوَّلُ بَيْتٍ وَضِعَ لِعِبَادَةِ اللَّهِ**۔ اس سے ناچیز کی لکھی ہوئی بات ہی کا ثبوت ملتا ہے، نہ کہ حکیم صاحب کے ارشاد کا۔

۳۔ تیسرا اعتراض سورہ فیل کی شان نزول سے متعلق ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں مکہ کے قریب قیام کے بعد ابرہہ کی فوج کے ساتھ کسی حجازی قبائل کے حملہ اور لڑائی کی شہادت نہیں ملتی اور نہ ہی کسی بیماری کے پھیلنے کی تاریخی شہادت ہے۔ ”سر دست میرے پاس وہ مآخذ موجود نہیں ہیں جن سے اخذ کر کے میں نے لکھا تھا کہ ابرہہ کی فوج اور حجازی قبائل کے مابین جھڑپ ہوئی تھی۔ میں نے کوشش کی مگر متعلقہ تفسیری کتاب دستیاب نہ ہو سکی، البتہ بیماری پھیلنے کی تاریخی شہادت کے لئے حکیم صاحب قطب شہید کی تفسیر ظلال القرآن کی چھٹی جلد کا صفحہ ۳۹۷، ۳۹۸ ملاحظہ فرمائیں یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفہیم القرآن جلد ششم کا صفحہ ۳۶۷ دیکھ لیں۔

۴۔ چوتھا اعتراض واقعہ نخلہ کے سلسلہ میں ”غنیمت“ کے لفظ پر ہے۔ بعض عرب مفسرین کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی اس ضمن میں لفظ غنیمت کا استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۶۵۔

شکر گزار ہوں کہ حکیم صاحب نے میرے مضمون کو درخور التفات گردانا۔ امید کہ ان تصریحات سے ان کی تشفی ہو جائے گی، البتہ ابرہہ اور حجازی قبائل کی جھڑپ کی بات متعلقہ مآخذ دستیاب ہونے کے بعد لکھ سکوں گا۔ دیا اللہ التوفیق۔

انتخاب الترغیب والترہیب

مؤلف: حافظ محدث ذکی الدین المنذری ترجمہ: مولوی عبداللہ صاحب دہلوی

اعمال خیر پر اجر و ثواب اور بد عملیوں پر زجر و عتاب پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر المنذری کی اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کے متعدد تراجم و تفسیریں شائع ہوئی ہیں مگر نامکمل ہی شائع ہوئے۔ کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ اس میں سے مکررات اور سندوں کے اعتبار سے کمزور حدیثوں کو نکال کر اصل متن تشریحی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ طبع کرایا جائے۔

ندوة المصنفین دہلی نے نئے عنوانوں اور نئی ترتیب کے ساتھ شائع کرانے کا پروگرام بنایا ہے جس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔ اس جلد کے شروع میں حدیث اور اس کے متعلقہ پر ایک مبسوط اور طویل مقدمہ بھی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب مع تشریحی ترجمہ شروع ہوئی ہے۔ جلد اول جس میں کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ پر ۱۹۰ احادیث مذکور ہوئیں۔ تقطیع متوسط ۲۶x۲۰ قیمت مجلد ۳ روپے صفحات ۴۵۰۔

جلد دوم بقیہ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصوم اور نماز عیدین پر مشتمل ہے جس میں ۱۳۲ احادیث مذکور ہوئیں۔ صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد ۳ روپے۔

جلد سوم میں کتاب الحج، کتاب الجہاد اور فضائل قرآن و حدیث کے ابواب آگئے ہیں۔ اس جلد میں ۱۳۶ احادیث شامل ہیں۔ ابواب حج ۸۷ احادیث ابواب جہاد میں ۲۰۸ احادیث اور فضائل القرآن میں ۱۶۵ احادیث۔ قیمت ۲ روپے مجلد ۳ روپے۔

ندوة المصنفین، اسد دوبانہ دار، جامع مسجد دہلی

خلافت عباسیہ اور ہندوستان

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

ہندوستان میں ۱۱۵ سالہ عباسی دور خلافت کے غزوات و فتوحات اور
اہم واقعات و حادثات عباسی امراء و حکام کی ملکی و شہری انتظامات ،
عرب و ہند کے درمیان گونا گوں تجارتی تعلقات ، بحیرہ کے ماتحت
بحری امن و امان کا پیام ، ہندی علوم و فنون اور علمائے اسلامی اور
علوم و فنون اور علمائے اسلام اور ہندی موالی و مالک وغیرہ مستقل
عنوانات پر نہایت مفصل و مستند معلومات پیش کی گئی ہیں ۔ نیز
یہاں کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے عالم اسلام سے علمی و فکری اور
تہذیبی و تمدنی روابط کی تفصیلات درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے
کہ عباسی خلفاء و امراء نے پہلی بار افسانوی ہندوستان کو دنیا
کے سامنے حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔

قیمت غیر مجلد چالیس روپے
مجلد عمدہ ریگزین پچاس روپے

ملنے کا پتہ

ندوة المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

۱۹۵۳ء	حیات و خدمت امام محمد باقر و علمی، العلم والعلوم، اسلام کا نیا دور، حیات
۱۹۵۵ء	تاریخ صلیبیہ، تاریخ ملت جلد ہفتم
۱۹۵۶ء	اسلام کا زرعی نظام، تاریخ اور حیات ایران، تاریخ علم فقہ و تاریخ ملت جلد ہفتم، اسلام کا نیا دور
۱۹۵۶ء	ترجمان اللہ جلد ثالث، اسلام کا لائسنس حکومت، وضع جدید، پذیرا و ترمیم، جلد ہفتم، قوامی
۱۹۵۷ء	سیاسی معلومات جلد دوم، فلسفے، راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات
۱۹۵۷ء	ذات القرآن جلد ہفتم، حدیث کثیر، تاریخ ملت جلد ہفتم، مسلمین، ہندو، عیسائی، اور اہل مذاہب کے بعد
۱۹۵۷ء	ذات القرآن جلد ہفتم، مسلمین کی زندگی، حیات، تاریخ، حیات، جدیدین، انفرادی، سیاسی، معلومات
۱۹۵۹ء	حضرت عمرؓ کی سرکاری خطوط، کتب، تاریخ، زندگی، جنگ آزادی، اسلام، حساب و کتاب
۱۹۶۰ء	تفسیر نظری، اردو، پارہ ۲۹-۳۰، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
۱۹۶۱ء	۱۱م غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق، عروج و زوال کا الہی نظام
۱۹۶۱ء	تفسیر نظری، اردو، جلد اول، برائے منظر، جان جان کے خطوط، اسلامی کتب خانہ، ہندوستان
۱۹۶۳ء	تفسیر نظری، اردو، جلد دوم، اسلامی دنیا، دسویں صدی عیسوی میں، بحار، الآثار، شیل سے قزاق تک
۱۹۶۳ء	تفسیر نظری، اردو، جلد سوم، تاریخ، رد، پیکر، شیل، بھنور، علماء ہند کا شاندار ماضی، اول
۱۹۶۳ء	تفسیر نظری، اردو، جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند، ہندوستان میں، ہندوستان، شاہان، مقلید کے عہد میں
۱۹۶۵ء	ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، جلد اول، تاریخی مقالات
۱۹۶۶ء	لاہور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نوآبادیات
۱۹۶۶ء	تفسیر نظری، اردو، جلد ہفتم، جوہر، عشق، خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سادہ
۱۹۶۶ء	ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں
۱۹۶۷ء	ترجمان اللہ جلد چہارم، تفسیر نظری، اردو، جلد ہفتم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ
۱۹۶۸ء	تفسیر نظری، اردو، جلد ہفتم، تین تہ کے، شاہ ولی اللہ کے سبب، مکتوبات
۱۹۶۹ء	اسلامی ہند کی عظمت و رفتہ
۱۹۶۹ء	تفسیر نظری، اردو، جلد ہفتم، تاریخ، الحزبی، حیات و کائنات، دینی اور سماجی منظر
۱۹۷۰ء	حیات و خدمت امام محمد باقرؓ، تاریخ، حیات و کائنات، دینی اور سماجی منظر
۱۹۷۱ء	تفسیر نظری، اردو، جلد ہفتم، تاریخ، حیات و کائنات، دینی اور سماجی منظر
۱۹۷۲ء	فقہ اسلامی کی تاریخی پس منظر، اتفاق، الترتیب و الترتیب، اخبار و کتب
	ہندی و عربی میں فتح ہندوستان

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

بے رنگ زندگی کو رنگین بنائیے !

بے کیت مگر طویل زندگی کو فرد و عورت دونوں ہی
رنگینوں، خوشیوں اور شادمانیوں سے بھر پور
کزار سکے ہیں۔ اس غرض سے لحمینہ کا استعمال بہترین ہے۔
توانائی، چستی اور قوت کا سرچشمہ

لحمینہ

اعصاب اور عضلات کو نئی طاقت و تازگی دینے والے
چالیس اجزاء کا مرکب۔ ہمدرد کے طبی تجربات کا
قابل فخر حاصل۔
آپ بھی لیجیے — خوشیوں اور لذتوں کو اپنائیے !

لحمینہ

مردوں اور عورتوں کے لیے

**ہمدرد**

CLARION / 493

ولید حسن عثمانی پرنٹرز نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جہان مسجد دہلی سے شائع کیا۔